اُردو شیرازہ

گوشۂ رفیق راز

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

شیرازہ

گوشۂ رفیق راز

Volume: 61 Number: 11 - 12

ISSN: 22779833

Urdu Sheeraza

Volume: 61
Number: 11-12

Gosha - e - Rafiq Raaz

Jammu & Kashmir
Academy of Art, Culture and Languages

شیرازہ

سرینگر، کشمیر

نِگراں	:	بھرت سنگھ منہاس
مدیر	:	محمد سلیم سالکؔ
معاون مدیر	:	سلیم ساغرؔ
معاون	:	ڈاکٹر محمد اقبال لون

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگوئجز

ناشر : سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

کمپیوٹر کمپوزنگ/سرورق : امتیاز شرقی، انور لولابی

سال اشاعت :جلد: 61، شمارہ:12-11 (نومبر/دسمبر 2023)

قیمت : 100 روپے

ISSN نمبر : 2277-9833

''شیرازہ'' میں جو مواد شامل کیا جاتا ہے اُس میں ظاہر کی گئی آرا سے اکیڈمی کا کُلاً یا جُزواً اتفاق ضروری نہیں۔ (ادارہ)

●...... خط و کتابت کا پتہ:

مدیر ''شیرازہ'' اردو

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی، سرینگر

ای میل:sherazaurdu@gmail.com

فہرست

گفتگو بند نہ ہو!	محمد سلیم سالک	۵

گوشۂ رفیق راز (مضامین)

رفیق راز: ماہ وسال کے آئینے میں	ڈاکٹر محمد اقبال لون	۸
میرا تخلیقی سفر	رفیق راز	۱۳
رفیق راز: قادرالکلام شاعر	پروفیسر حامدی کاشمیری	۲۷
رفیق راز: دشتِ شرر کا ساربان	محمد یوسف ٹینگ	۳۲
رفیق راز: ایک لہجہ ساز شاعر	حکیم منظور	۳۹
رفیق راز: ہمہ جہت شاعر	پروفیسر قدوس جاوید	۴۶
رفیق راز: طلسمات کے در کھولنے والا شاعر	ڈاکٹر نذیر آزاد	۵۸
رفیق راز کی متصوفانہ فکر	ڈاکٹر شفق سوپوری	۸۱
'رفیق راز کی شعری کائنات	پروفیسر مجروح رشید	۸۷
رفیق راز: تخیل کی جولاں گاہ کا شہسوار	ڈاکٹر غلام محمد آجر	۹۳
رفیق راز: دیارِ سکوت کا صاحب طرز شاعر	شبیر احمد شبیر	۱۰۸
دیواں ہے مرا گرمئی اظہار سے روشن	شارق عدیل	۱۲۳
رفیق راز: زندگی کا ترجمان شاعر	دیپک بدکی	۱۳۱
رفیق راز: رمز شناس شاعر	خالد حسین	۱۳۶
رفیق راز: انکشافِ ذات کا شاعر	رئیس الدین رئیس	۱۴۲
رفیق راز: ایک دوست، ایک شاعر	بشیر اطہر	۱۴۸
رفیق راز: صاحب اسرار شاعر	غنی غیور	۱۵۱
رفیق راز کا شعری آئینہ	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۱۷۰

❁ رفیق راز: صاحب اسلوب شاعر	ڈاکٹر جاوید رسول	۱۷۹
❁ رفیق راز کے تخلیقی زاویے	ڈاکٹر جاوید انور	۱۹۱
❁ رفیق رازؔ: متحرک فکر کے شاعر	ریحانہ اختر	۲۰۳
● **رفیق رازؔ: مشاہیر کے آئینے میں**		۲۱۱
● **انتخابِ کلامِ رفیق راز**		۲۲۰
● نئے نقاد کے نام سات خطوط (خصوصی مطالعہ)	پروفیسر ناصر عباس نیرّ	۲۳۴
● **غزلیات**		۲۸۰
ساگر سرفراز، راشف عزمی، سید مرتضیٰ بسمل، عقیل فاروق، شبینہ آرا، حاشر افنان، ہجر مومن، عمر عالم، خالدہ بیتاب، عقیل عباسی، عرفان غازی		
● **نظمیں**		۳۰۰
ایاز رسول نازکی، حیات عامر حسینی، رفیق سندیلوی تیمور احمد خان، تسنیم الرحمان حامی، مصروفہ قادر		
● **افسانے**		
❁ غم سے نجات پائے کیوں؟	طارق چھتاری	۳۲۲
❁ اندرونی دروازے کی دہلیز	صادقہ نواب سحر	۳۳۰
❁ زندگی	رتن سنگھ کنول	۳۴۷
❁ شہزادہ	وحید احمد قمر	۳۵۳
● **تبصرۂ کتب**		
❁ گمشدہ دولت (طارق شبنم)	مبصر: ڈاکٹر توصیف احمد ڈار	۳۶۵
❁ الہام سے پہلے (اشرف عادل)	مبصر: خان زاہد	۳۷۰
❁ خوابوں کی کسک (ڈاکٹر محمد یونس ڈار)	مبصر: ڈاکٹر گلزار احمد وانی	۳۷۳
● **رفتارِ ادب**		۳۷۶
❁ شعبۂ اردو، کلچرل اکادمی کی 2023 میں ادبی سرگرمیاں	مرتب: میم دانش	۳۷۶

●●●

گفتگو بند نہ ہو!

جموں وکشمیر میں اردو شاعری کی تاریخ قریباً اٹھارہویں صدی سے شروع ہوتی ہے جب یہاں سرکاری سطح پر فارسی زبان رائج تھی۔ اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اٹھارہویں صدی میں جب اردو کے سب سے اہم مرکز دلی میں میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کی شاعری کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا تو اسی دوران کشمیر میں بھی اہلِ قلم نے اردو میں طبع آزمائی شروع کی جس کے ابتدائی نقوش یہاں کی ادبی تاریخ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ البتہ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ جموں و کشمیر کا پہلا اردو شاعر کون ہے؟ اس سلسلے میں نامور محقق و نقاد پروفیسر قدوس جاوید صاحب نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''میرزا رسواؔ: کشمیر کا پہلا اردو غزل گو'' میں ایک تفصیلی بحث کا آغاز کیا ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں :

''کشمیر میں اردو غزل کا یہ ورق اک ذرا سا دیمک زدہ ہے پھر بھی کشمیر کے ابتدائی اردو غزل گو شعراء میں ریختہ کے حوالے سے ملا محسن فانیؔ، میر کمال الدین حسین رسواؔ، مرزا عبدالغنی قبولؔ، محمد حشمت اور مرزا علی نقی محشرؔ وغیرہ کے نام اکثر لوگوں نے لئے ہیں''۔

پروفیسر قدوس جاوید صاحب نے متذکرہ بالا شعرا کے کلام کا بھرپور تحقیقی جائزہ لیا ہے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر کمال الدین حسین رسواؔ ایسے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اردو میں شعر گوئی کی ہے۔ پروفیسر موصوف نے رسواؔ کی پانچ غزلوں کو نمونے کے طور پر

شامل مضمون کیا ہے۔اس دوران انہوں نے رسؔوا سے مہؔجور تک کشمیر کے اردو شعری منظر نامے کو بھی زیر بحث لایا ہے۔اس تحقیقی مضمون کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا منظر نامہ میر کمال الدین حسین رسؔوا سے تا حال رفیق رازؔ تک قریباً تین صدیوں سے زائد عرصے تک پھیلا ہوا ہے جس کی ایک باضابطہ اور مربوط تاریخ مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

جہاں تک جموں وکشمیر میں معاصر اردو شاعری کی بات ہے تو بلا خوف وتردد کہا جاسکتا ہے کہ رفیق رازؔ اس دور کے بڑے شاعر ہیں۔ملک بھر میں اردو زبان کی جن ناموراور مقتدر شخصیات نے رازؔ کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا ہے ان میں شمؔس الرحمٰن فاروقی، حامدی کاشمیری اور محمد یوسف ٹینگ وغیرہ شامل ہیں۔ رازؔ صاحب کی شاعری حیران کن طلسمات سے بھرپور ہے۔سنجیدہ قاری کے لئے ان کے اشعار سے سرسری گزرنا آسان نہیں ہے کیونکہ ان کے یہاں ہر قدم پر مفاہیم اور اسرار ورموز کا ایک جہانِ دیگر آباد ہے۔ان کا شعر پہلے قاری کو اپنی گرفت میں لیتا ہے اور بعدازاں پرت در پرت کھل کر اسے معنی کے نئے جہانوں کی سیر کراتا ہے اور اس پر نئے ابعاد کھلنے شروع ہوجاتے ہیں۔

ہمارے شعر میں آباد ہے جہانِ طلسم
ہماری طرز میں اک شان ہے روایت کی

رازؔ صاحب کشمیری اور اردو دنوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ان کے اب تک چھ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں اردو کے تین اور کشمیری کے تین مجموعے شامل ہیں۔رازؔ صاحب ساہتیہ اکادمی اور جموں وکشمیر کلچرل اکادمی اعزازات سے سرفراز کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی انہیں جموں اینڈ کشمیر سٹیٹ ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔

اکادمی کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کیا کہ رفیق رازؔ کی ہمہ جہت شخصیت اور شاعری کا احاطہ کرنے کے لئے شیرازہ اردو میں ایک خصوصی گوشہ شائع کیا جائے تا کہ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے شعرا و ادبا اپنے اس پیش رو کی علمی و ادبی شخصیت سے متعارف ہوسکیں ۔رازؔ صاحب کی شخصیت اور شاعری کا کماحقہ احاطہ کرنے والے مقالات کا انتخاب پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری یہ بھی کوشش رہی ہے کہ دیگر مشمولات کے علاوہ اس شمارہ میں نئی نسل سے تعلق رکھنے والے شعرا کو جگہ دی جائے۔

شمارہ کی ترتیب میں جناب سلیم ساغرؔ (اسسٹنٹ ایڈیٹر)،ڈاکٹر محمد اقبال لون (ریسرچ اسسٹنٹ) ،انور لولابی اور امتیاز احمد شرقی نے بہت اہم کردار نبھایا ہے۔امید ہے قارئین حسبِ سابق شمارے کے بارے میں اپنے تاثرات سے ضرور آگاہ کریں گے۔

محمد سلیم سالکؔ

مدیر ’’شیرازہ اردو‘‘

☆:...... ڈاکٹر محمد اقبال لون

رفیق رازؔ: ماہ وسال کے آئینے میں

نام :......رفیق احمد شمیراک

قلمی نام :......رفیق رازؔ

والدین :......خواجہ علی محمد شمیراک، ہاجرہ بیگم

پیدائش :......10 اپریل 1950، براری پورہ، عیدگاہ، سرنگر کشمیر

ابتدائی تعلیم :......ٹنڈل بسکو میموریل اسکول، سرنگر۔1963

میٹرک :مشن اسکول، فتح کدل، سرینگر۔۔۔۔1966

گریجویشن : ایس پی کالیج، سرنگر 1973

اعلیٰ تعلیم :ایم۔اردو 1976 کشمیر یونیورسٹی، سرینگر

ملازمت : 1979-1981 تک لیکچرر کشمیری، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

1982، آل انڈیا ریڈیو سرینگر میں پروگرام ایگزیکٹیو کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔اس کے بعد ترقی کے مختلف منازل طے کر کے پہلے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور آخر پر ڈائریکٹر کے عہدے پر ترقی پا گئے۔2010، میں ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

نکاح :......1983ء

نصف بہتر :یاسمین بانو دختر خواجہ عبدالاحد لون

اولادیں :......ایک صاحب زادہ اور دو بیٹیاں

فیضان رفیق، حائفہ رفیق اور صاعقہ رفیق

ادبی سفر کی ابتدا:۔

رفیق رازؔ نے 1967 کے آس پاس شاعری کا آغاز کیا۔ سری پرتاپ کالج سرینگر کی ادبی محفلوں میں ان کا ذوق پروان چڑھا۔ کالج کی بزم ادب میں پروفیسر محی الدین حاجنی اور پروفیسر غلام نبی فراق کے سامنے اپنی تخلیقات پیش کر کے دادِ تحسین وصول کی۔ علاوہ ازیں میر غلام رسول نازکی، فاضل کاشمیری، مرزا عارف بیگ، ، پروفیسر رحمٰن راہی اور امین کامل وغیرہ بھی حوصلہ آفزائی کرتے رہے اور کشمیری زبان میں لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔ اس طرح موصوف دونوں زبانوں کی مشقِ سخن میں مصروف ہو گئے۔

چونکہ شاعری کا آغاز اگر چہ اردو زبان سے کیا لیکن 1972ء میں کشمیری زبان کی طرف مائل ہو گئے۔ رازؔ نے دونوں زبانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ پہلی بار ان کا اردو کلام 1976 میں موقر اردو رسالہ ''شب خون'' میں شائع ہوا جس کی ادبی حلقوں میں کافی سراہنا کی گئی۔ اس کے بعد انھوں نے مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ متواتر لکھتے رہے۔ ان کی شعری تخلیقات ریاستی، ملکی اور بیرونی ممالک کے اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہیں۔ جن رسائل و اخبارات میں ان کی تخلیقات چھپتی رہیں۔ ان میں شب خون، مباحثہ، تحریک ادب، شاعر، آج کل، اثبات، نئی کتاب، انتساب، شیرازہ، جہات، ہمارا ادب، ایوان اردو، انشا وغیرہ رسالے قابلِ ذکر ہیں۔

ادبی شخصیات سے متاثر:۔

میر، غالب، شکیب جلالی، ٹی ۔ایس ۔ ایلیٹ ،ایذراپاونڈ،
شمس الرحمٰن فاروقی ، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شکیل الرحمٰن ۔

حلقۂ دوستاں:۔

مرحوم حکیم منظورؔ، مرحوم شجاع سلطانؔ، ہمدم کاشمیریؔ، ملک بشیر اطہرؔ،
مسعود سامونؔ، اسفند یار خانؔ، ظریف احمد ظریفؔ، شفیع شوق،
مجروح رشید، رخسانہ جبین، شبیب رضوی، فاروق نازکی، نذیر آزاد،
شفق سوپوری، ذی شان فاضلؔ وغیرہ۔

تصانیف:۔

1۔ نے چھے نالان (کشمیری شعری مجموعہ) 1995
2۔ انہار (اردو شعری مجموعہ) 2004
3۔ دستاویز (کشمیری شعری مجموعہ) 2006
4۔ کاشر زبان شاعری تہ عروض 2008
5۔ مشراق (اردو شعری مجموعہ) 2009
6۔ نخلِ آب (اردو شعری مجموعہ) 2015
7۔ سورے سامان (کشمیری شعری مجموعہ) 2023

اس کے علاوہ اردو اور کشمیری زبانوں میں نثر میں درجنوں اہم موضوعات پر مضامین سپردِ قلم کئے ہیں جو تا حال کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے ۔ فی الوقت اردو مضامین پر مشتمل کتاب بعنوان ''قلم تراش'' زیرِ ترتیب ہے جس کی اشاعت عنقریب متوقع ہے۔

ادارت:.......

1 ماہنامہ رسالہ تریاق ممبئ (مجلس مشاورت)

2۔ مجلس ادارت، رسالہ رنگ مار

3۔ رسالہ (لا) اردو (مدیراں: رفیق راز، منیب الرحمٰن)

4۔ مدیر رسالہ (قاف) کشمیری (مدیراں: رفیق راز، منیب الرحمٰن)

وابستگی:.......

✍ :......ممبر، ایڈوائزری بورڈ، ساہتیہ اکادمی دہلی (1998 سے 2002)

✍ :......جوری ممبر (کشمیری زبان)، ساہتیہ اکادمی دہلی

✍ :...... ریفری، برلا فانڈیشن ، نئ دہلی

✍ :......صدر، ادبی تنظیم ''بزم شعرا''، سرینگر کشمیر

✍ :......صدر، ادبی تنظیم ''کاشر محاذ''، کشمیر

✍ :...... جنرل سیکریٹری، احد زرگر میموریل ریسرچ فاونڈیشن جموں وکشمیر

✍ :......ایگزیکٹیو ممبر، مہجور فاونڈیشن جموں وکشمیر

انعامات واعزازات:.......

☆......صادق میموریل ایوارڈ (1983)

☆......ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1997)

☆...... ہرمکھ لٹریری ایوارڈ (2005)

☆......احد زرگر میموریل ریسرچ فاونڈیش (2009)

☆...... مہجور فاونڈیش کشمیر ایوارڈ (2012) `

☆:...... کلچرل اکادمی ایوارڈ

☆:...... شرفِ کمراز ایوارڈ از ادبی مرکز کمراز جموں وکشمیر (2015)

☆:......ہلپ فاونڈیشن ایوارڈ

☆......سٹیٹ ایوارڈ جموں وکشمیر گورنمنٹ (2021)

☆:......نگینہ انٹرنیشنل ایوارڈ (2021)

☆:...... آوازادبی انعام (2023)

☆:......انجمن جدید شعرائے کشمیر اعزاز (2023)

رفیق راز پر تنقیدی و تحقیقی کام:۔

☆۔آئینہ تمثال رفیق راز از ریحانہ اختر

☆۔سرشہنائی کے (''نے چھے نالان'' پر تنقیدی محاکمہ) از عبدالرحمٰن مخلص

☆۔نخلِ نور (رفیق راز کی ۱۰۱ غزلوں کا انتخاب) از غنی غیور

☆۔گوشۂ رفیق راز مشمولہ از سہ ماہی رسالہ ''تحریک ادب'' بنارس

☆۔گوشۂ رفیق راز مشمولہ از ششماہی رسالہ نگینہ انٹرنیشنل سرینگر

غیر ملکی سفر:......

☆......1994 میں سعودی عرب عمرہ کے سلسلے میں۔

☆......2018 سنگاپور کا سفر

پتہ حال: آئی جی روڈ، باغات برزلہ، سری نگر کشمیر

موبائیل نمبر:7889968878

☆☆☆

☆......رفیق راز

میرا تخلیقی سفر

ہر انٹرویو میں کسی شاعر سے یہ دو سوال ضرور پوچھے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کب پیدا ہوئے، اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔ دوسرا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ کی پہلی تخلیق کون سی ہے؟ دوسرے سوال کا جواب میں نہیں دے پاؤں گا۔ البتہ پہلے سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ اس سوال کا تعلق میرے ماضی سے ہے اور ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے ماضی کو پیٹھ پہ لادے ہوئے ہوتا ہے۔ ماضی کی الماری کو کھول کر اس میں سے کوئی بھی چیز نکالی جا سکتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب بھی اس الماری میں موجود ہے۔

میں 10 مارچ 1950 کو دوپہر کے وقت اس جہان فانی میں آیا۔ اس وقت میری ماں کے کہنے کے مطابق باہر برف باری ہو رہی تھی۔ اس سال مارچ کے مہینے میں کڑاکے کی سردی پڑی تھی۔ میں جس علاقے میں پیدا ہوا وہ جہلم کے دائیں کنارے پر آباد براری پورہ یا خانقاہ سوختہ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ یہ علاقہ عید گاہ کے قریب ہے۔ وہ مکان جس میں میرا جنم ہوا، اب بھی وہاں ایک گلی میں موجود ہے اس میں آج کون لوگ آباد ہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔ اس مکان میں نے زندگی کے پہلے دو سال گزارے۔ یا یوں کہیئے کہ اس مکان میں زندگی کے پہلے دو سال ماں کی گود میں گزارے، اس کے بعد میرے والد صاحب جن کا نام علی محمد

شیمر اک تھا, نے وہ مکان بیچ کر سرینگر کے وسط میں دوسرا مکان خریدا جو اس مکان سے زیادہ کشادہ تھا اور اس کے ساتھ زمین بھی کافی ملحق تھی۔ میرے والد صاحب نے اس زمین کے ایک حصے پر دوسرا مکان تعمیر کرایا۔ یہ علاقہ زینہ کدل کے پاس جہلم کے بائیں کنارے محلّہ چمردوری کہلاتا ہے۔

میرے والد صاحب کشمیر گورنمنٹ آرٹس ایمپوریم میں سینئر مینیجر تھے اور وہ میری پیدائش کے وقت بمبئی کے برانچ میں تعینات تھے۔ میرے والدین کی دس اولادیں ہیں میرا نمبر چھیواں ہے۔ سب سے پہلے لڑکا پیدا ہوا تھا اس کے بعد لگاتار چار بیٹیاں پیدا ہوئیں اور میں ان بیٹیوں کے بعد پیدا ہوا۔ میرے بعد دو بیٹیاں اور دو بیٹے اور پیدا ہوئے۔ چونکہ میں چار بیٹوں کے بعد پیدا ہوا تھا اس لئے میرے حصے میں لاڈ پیار زیادہ آیا، ماں بہنیں مجھے حد سے زیادہ لاڈ پیار کرتی تھیں۔ میں چار سال کا ہونے سے پہلے ہی ٹینڈیل بسکو میموریل سکول میں داخل کرنے کے لئے تیار کیا جارہا تھا۔ پانچ سال کا ہوا تو مجھے اسی اسکول میں داخل کیا گیا۔ یہ انگلش میڈیم اسکول تھا۔ یہاں سے میں نے مڈل پاس کیا۔ نویں اور دسویں جماعت کے لئے مجھے مشن اسکول، جو میرے گھر سے زیادہ دور نہ تھا داخلہ ملا۔ میں اسکول پیدل ہی جاتا تھا۔ بسکو اسکول میرے گھر سے تقریباً چار کلومیٹر دور تھا وہاں میں یا تو تانگے پر جاتا یا بس میں۔ سرینگر میں ساٹھ کی دہائی میں زیادہ تر تانگے ہوا کرتے تھے اور بسیں کم۔

اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف کہ میری پہلی تخلیق کون سی ہے۔ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں کیونکہ مجھے خود پتہ نہیں کہ میری پہلی تخلیق کون سی تھی۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نویں جماعت میں مجھے محسوس ہوا کہ میں کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور جو چیزیں صفحۂ قرطاس پر اتارتا ہوں وہ کچھ کچھ شاعری جیسی لگتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی چیز کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دن میں نے اپنی

لکھی ہوئی چیز اپنے ٹیوٹر کو دکھادی جو روز شام کو مجھے پڑھانے گھر آتے تھے۔انہوں نے میری یہ تُک بندی پڑھی اس کے بعد مجھے اتنا ڈانٹا کہ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔انہوں نے کہا کہ آگے میٹرک کا امتحان ہے اور تمہیں اچھے نمبروں سے پاس ہونا ہے ورنہ کالج میں ایڈمشن نہیں ملے گا۔اگر تم اس خرافات میں قیمتی وقت ضائع کرو گے تو ہو چکے پاس میٹرک میں۔وہ ابھی جوان ہی تھے اور تیز مزاج کے بھی تھے۔کبھی کبھی مجھ پر ہاتھ بھی اٹھاتے تھے۔اس کے چند مہینے بعد انہوں نے میرے والد سے کہا کہ اب مجھے سرکاری نوکری مل گئی ہے اور پوسٹنگ دور دراز علاقے میں ہوئی ہے اس لئے میں اب اسے یعنی مجھے کل سے پڑھانے نہیں آپاؤں گا۔اس کے بعد دوسرا ٹیوٹر رکھا گیا وہ طبیعتاً نرم خو تھے اور وہ شاید اس وقت ماسٹرس کر رہے تھے۔وہ دونوں اس وقت بقید حیات ہیں اور میری اتنی عزت کرتے ہیں جیسے میں ہی ان کا ٹیوٹر رہ چکا ہوں۔خیر وہ بہت ذہین ہیں۔میں نے ان سے جتنا سیکھا شاید ہی کسی اور سے سیکھا ہو۔انہی میں سے ایک نے مجھ سے کہا تھا کہ تاریخ یعنی ہسٹری اصل میں بادشاہوں کی کہانی ہے عوام کی نہیں۔انہی میں سے ایک نے نویں جماعت میں کہا تھا کہ وقت نا قابل تقسیم ہے۔ہم اسے سہولت کے لئے ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کرتے ہیں۔ورنہ وقت تو ایک دریا کے مانند ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔اس وقت تو میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئی تھیں مگر بعد میں ان جملوں نے مجھ پر کئی دروازے وا کئے جن میں داخل ہوکر میں نئے اور نادیدہ جہانوں میں پہنچ گیا۔اللہ دونوں کی عمر دراز کرے۔بات ہو رہی تھی میری پہلی تخلیق کی۔

میں نے اپنے ٹیوٹروں سے چُھپ چھپا کے یہ تُک بندی جسے آپ مشقِ سخن بھی کہہ سکتے ہیں، جاری رکھی۔میٹرک پاس کرنے کے بعد میں سری پرتاب کالج میں گریجویشن کے لئے داخل ہوا۔میٹرک کے بعد گریجویشن مکمل کرنے میں ان دنوں

چار سال لگتے تھے۔ میں پی۔ یو۔ سی یعنی گیارہویں کلاس میں تھا کہ ایک سینئر لڑکے کو دیکھا جو ہر ایک سے پوچھ رہا تھا کہ جو ''بزم ادب'' میں شرکت کا خواہاں ہو وہ اپنا نام لکھوائے۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ بزم ادب میں کیا کرنا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ اگر کوئی لڑکا کچھ یعنی شاعری افسانے وغیرہ لکھتا ہے تو وہ اپنی کوئی چیز وہاں پڑھ سکتا ہے۔ میں نے اپنا نام اور رول نمبر لکھوایا۔ بزم ادب کی نشست ہر سنیچر کو کلاسز کے بعد منعقد ہوا کرتی تھی۔ سنیچر ایک دو دن میں آنے والا تھا۔ میں نے تیاری شروع کی۔ گھر جاکے اپنی لکھی ہوئی چیزوں میں سے ایک غزل کا انتخاب کیا۔ سنیچر آیا اور وہ گھڑی بھی آئی جب میرے تخلیقی سفر کا حقیقی آغاز ہوا ،اتنا ہی نہیں میرے سفر کی سمت بھی متعین ہوئی۔ میں ڈرتے ڈرتے سہما ہوا لائبریری کی بلڈنگ میں داخل ہوا اور اس ہال نما کمرے میں پہنچا جہاں یہ ادبی نشست منعقد ہونی تھی۔ کمرے میں سننے والے لڑکوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ پڑھنے والے تقریباً بیس بائیس تھے اور پروفیسر صاحبان کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ جن میں پروفیسر غلام نبی فراق، پروفیسر محی الدین حاجنی اور پروفیسر ستار شاہد قابلِ ذکر ہیں اور بھی پروفیسر صاحبان بیٹھے ہوئے تھے جن کے نام اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں۔ میرا نام سولہویں نمبر پر تھا۔ کسی نے کشمیری افسانہ پڑھا کسی نے اردو۔ شاعری بھی کشمیری اور اردو میں پڑھی گئی ،ایک دو لڑکوں نے انگریزی شاعری سنائی۔ میرا نمبر قریب آتا جارہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جارہی تھی۔ آخر اسی لڑکے نے میرا نام کلاس رول نمبر کے ساتھ پکارا۔ میں اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ سب لوگ مجھے اس طرح دیکھنے لگے جیسے میرا جائزہ لے رہے ہوں۔ مجھے سوائے پروفیسر غلام نبی فراقؔ کے کوئی پہچانتا نہ تھا۔ پروفیسر غلام نبی فراقؔ کشمیری زبان کے سربرآوردہ شاعر ہونے کے علاوہ ہمیں کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے، انہیں میرا نام تک یاد

تھا۔انہوں نے مجھ سے کہا گھبراؤ نہیں آرام سے پڑھو۔میں نے اردو غزل سنائی، غزل کیا تک بندی تھی اور شاید بے وزن بھی رہی ہوگی۔ میں غزل سنا چکا تو ایک پاٹ دار آواز گونجی۔آواز پروفیسر محی الدین حاجنی مرحوم کی تھی جو کالج میں عربی پڑھاتے تھے اور کشمیری زبان میں کئی تحقیقی مقالے لکھ چکے تھے۔اس کے علاوہ کشمیری زبان و ادب پرانگریزی میں بھی کئی اہم مقالے لکھ چکے تھے۔عربی، فارسی، انگریزی اوراردو پران کوزبردست دسترس حاصل تھی۔ یہ جانکاری مجھے بعد میں ملی۔اس وقت میں ان کے نام اور کام سے بالکل واقف نہ تھا۔تم کہاں کے ہو؟ حاجنی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔سر میں سرینگر کا ہوں۔میں نے جواب دیا، جب کشمیر کے ہو تو اپنی زبان (کشمیری) میں کیوں نہیں لکھتے ہو۔اگلے سنیچر کو کشمیری تخلیق لے کر آنا۔میں نے جو اردو غزل سنائی تھی اس پر مجھے کسی سے داد نہیں ملی۔پروفیسر غلام نبی فراق مرحوم سے بھی نہیں جو میرے انگریزی کے استاد تھے۔نشست ختم ہوئی۔میں نے تب تک کسی کشمیری شاعر کا کلام نہیں پڑھا تھا۔گھر جاکر میں کشمیری میں غزل لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔غزل تو دور ایک مصرع نہیں ہورہا تھا۔میں نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ ایک دو کشمیری شعری مجموعے حاصل کئے ان کا مطالعہ کیا۔ان مجموعوں میں جو شاعری تھی مجھے متاثر نہ کرسکی۔البتہ یہ آئیڈیا ضرور ملا کہ کشمیری میں کیسے لکھا جاتا ہے۔کس طرح کے الفاظ وغیرہ برتے جاتے ہیں۔دو چار دن تک مسلسل کوشش کر کے بالآخر میں ایک کشمیری غزل لکھنے میں کامیاب ہوا وہ بھی کسی اور کی زمین میں۔ابھی سنیچر دو تین دن دور تھا، وہ دو تین دن بھی میں نے اس غزل کو مانجھنے میں صرف کئے۔سنیچر آیا میں نے غزل پڑھی اور اتنی داد حاصل کی کہ میرا حوصلہ آسمان کو چھونے لگا۔اس غزل کا مزاج وہ نہیں تھا جو اس شاعری کا تھا جو ان دو کشمیری مجموعوں میں شامل تھی جن سے میں نے استفادہ کیا تھا بلکہ میری اس کشمیری غزل میں قدرتی طور نئی اردو غزل کا رنگ درآیا تھا

کیونکہ اس وقت کی اردو شاعری کچھ کچھ میری نظر سے گزرتی رہتی تھی اور اس وقت تک ''شب خوں'' کے بھی ایک دو پرچے میرے مطالعے میں آچکے تھے۔اس میں جو چیزیں چھپتی تھیں وہ سب کی سب میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں البتہ اس میں چھپنے والی غزلوں کو پڑھ کر ایک عجیب سی تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا تھا۔یہاں سے میرے کشمیری میں لکھنے کا سفر شروع ہوا جو ابھی تک جاری ہے۔لیکن اردو میں لکھنا میں نے ترک نہیں کیا۔ میں دونوں زبانوں میں لکھتا رہا۔کشمیر میں منعقد ہونے والی ہر شعری نشست یا مشاعرے میں صرف کشمیری تخلیقات پیش کرتا تھا اور اردو کلام بعد میں رسائل میں چھپنے کی غرض سے بھیجتا تھا۔

گیارہویں جماعت سے گریجویشن تک یعنی چار سال میں میرے قلم سے کچھ ایسی غزلیں ٹپکیں جن کا کشمیری ادبی حلقوں میں نوٹس لیا گیا۔سب سے پہلے کشمیر کے سر برآوردہ شاعر،محقق اور نقاد جناب امین کامل نے یہ اعتراف بابانگ دہل کیا کہ رفیق راز کشمیری غزل کو ایک نئی سرحد سے آشنا کرا رہا ہے۔امین کامل مرحوم ہر محفل اور سمینار میں میرا اور میری کشمیری غزل کا حوالہ ضرور دیتے تھے۔انہوں نے جتنی میری حوصلہ افزائی کی اور کسی نے اتنی نہیں کی۔وہ خود بہت بڑے شاعر تھے ان کی حوصلہ افزائی معنی رکھتی تھی۔گریجویشن مکمل کرنے تک میں نے کشمیری شعری ادب میں اپنے لئے جگہ بنالی تھی۔اس دوران اردو میں میری مشق سخن جاری رہی۔اب میں ''شب خوں'' کے ہر پرچے کا باقاعدگی سے مطالعہ بھی کرتا تھا۔آپ کو حیرت ہوگی کہ ''شب خوں'' کے بند ہونے تک میں کسی اور اردو رسالے کو نہیں پڑھتا تھا۔البتہ انگریزی ادب کا مطالعہ جاری تھا۔اس دوران ابن صفی کے بیسیوں ناول میرے مطالعے میں آئے۔مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان ناولوں سے میری اردو کچھ اور بہتر ہوگئی۔

خیر گریجویشن مکمل کرنے کے بعد میں کشمیر یونیورسٹی میں ماسٹرس کے لئے

داخل ہوا، یہاں کی فضا کالج کی فضا سے وسیع تھی۔ یہاں مجھے اردو کی بڑی شخصیتوں کو دیکھنے اوران سے ملنے کا موقع ملا۔ میں نے پہلی بار یہیں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، آل احمد سرور، جناب عالم خوند میری اور دیگر مشاہیر کو دیکھا اور سنا۔ کالج کے استادوں میں پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر قاضی غلام محمد صاحبان قابل ذکر ہیں جنہوں نے مجھے اردو میں لکھتے رہنے کی ترغیب دی۔ یہاں مشاعرے بھی کرائے جاتے تھے جن میں مجھے اپنی اردو غزلوں کو پیش کرنے کا موقع ملتا تھا۔ ایک دفعہ سردار جعفری کسی سلسلے میں کشمیر آئے ہوئے تھے تو پروفیسر شکیل الرحمٰن نے کلاس روم ہی میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس کی صدارت علی سردار جعفری نے کی۔ اس نشست میں صرف چند پروفیسر صاحبان اور چند ابھرتے ہوئے ہونہار طلبا کو کلام پڑھنا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ طلبا کی فہرست میں میرا نام پروفیسر شکیل الرحمٰن صاحب (صدرِ شعبۂ اردو) نے سب سے پہلے لکھا کیونکہ وہ بھی میرے بارے میں حسنِ ظن رکھتے تھے، اورانہوں نے میری کشمیری شاعری کے چرچے بھی سن رکھے تھے۔ جب میں نے کلام پڑھا تو پہلے دو تین اشعار پر علی سردار جعفری خاموش رہے۔ ظاہر ہے میری غزل ایسی تھی جسے عرف عام میں شب خونی غزل کہہ سکتے ہیں۔ میں نے سوچا شاید اسی وجہ سے علی سردار جعفری صاحب جو کہ (ترقی پسندوں کے سردار بھی تھے) میری غزل کو پسند نہیں فرمارہے ہیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے میری یہ غلط فہمی دور ہوئی جب میں نے غزل کا چوتھا شعر پڑھا، شعر آج بھی مجھے یاد ہے۔ ؎

ہماری روح کی آب و ہوا نہیں پوچھو
تمہارے جسم کا موسم تو خوشگوار لگا

یہ شعر سن کر علی سردار جعفری صاحب نے خوب داد دی اور مشاعرے کے

بعد کئی دن تک مجھ پر اس کامیابی کی سرشاری طاری رہی۔ 1974ء میں شمس الرحمٰن فاروقی کو میں نے کشمیر یونیورسٹی میں پہلی بار دیکھا جب میں ایم اے کے پہلے سال میں تھا۔ فاروقی صاحب کا لیکچر شعبۂ اردو میں تھا، جسے سننے کے لئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے مختلف شعبوں سے وابستہ پروفیسر صاحبان اور طالب علم آئے تھے۔ شب خوں 1972ء سے مسلسل میرے مطالعے میں تھا اور اس نے میرے دل و دماغ کو مکمل اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ فاروقی صاحب کے کئی مضامین بھی پڑھ چکا تھا۔ مرحوم پروفیسر شکیل الرحمٰن صدرِ شعبہ اردو نے ان کا تعارف کرایا لیکن میرے لئے یہ تعارف رسمی سا تھا کیونکہ ''شب خوں'' کے مطالعے سے میں اس دماغ سے پہلے ہی متعارف ہو چکا تھا جو شب خوں کے پیچھے کارفرما تھا۔ لیکچر کو میں نے انہماک سے سنا۔ لیکچر کے بعد فاروقی صاحب سے کچھ سوالات پوچھے گئے جن کے تسلی بخش جواب دئے گئے۔ اس طرح یہ مجلس برخواست ہوئی۔ سب نے ان سے ہاتھ ملایا میں نے بھی مصافحہ کیا اور اندر سے بہت خوش ہوا کہ میں نے نہ صرف اس شخصیت کو روبرو دیکھا بلکہ اس سے ہاتھ بھی ملایا جس نے ایک پورے عہد کے ادبی مزاج کو تبدیل کیا ہے۔

دوسرے دن جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے سرینگر کے لالہ رخ ہوٹل میں ان کے اعزاز میں ایک عشائیے کا انتظام کیا تھا جس میں سرینگر کے قابل ذکر کشمیری اور اردو ادیبوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ مجھے فاروقی صاحب کو دیکھنے اور انہیں سننے کا شوق کھینچ لایا تھا۔ کوئی اور ہوتے تو شاید میں نہ آپاتا کیونکہ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ اسی لئے پروگرام افطار کے بعد رکھا گیا تھا۔ اس پروگرام سے پہلے دن کو مرحوم ظفر احمد جو سرینگر دور درشن کے پروڈیوسر تھے، نے دور درشن میں ایک شعری نشست رکھی تھی۔ اس شعری نشست میں فاروقی سمیت صرف چھ شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ میری خوش نصیبی کہ ظفر احمد نے مجھے بھی اس شعری نشست کے لئے بک کیا تھا۔ میری

خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔خوشی کے مارے اس دن جو میری حالت تھی وہ دیدنی تھی۔میں وقت مقررہ سے پہلے ہی دوردرشن پہنچا۔ریکارڈنگ میں ابھی کچھ وقت باقی تھا میں باہر لان میں تھا کہ میری نظر ایک محترمہ پر پڑی ان محترمہ کے ساتھ دو چھوٹی چھوٹی اور دبلی پتلی سی لڑکیاں بھی تھیں۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ فاروقی صاحب کی اہلیہ مرحومہ جمیلہ فاروقی ہیں اور وہ دو چھوٹی لڑکیاں ان کی صاحب زادیاں باراں اور افشاں ہیں۔

جب شعری نشست کی ریکارڈنگ شروع ہوئی میری حالت غیر تھی۔میں خوف زدہ تھا کہ میری تُک بندی سن کر پتہ نہیں فاروقی صاحب کیا رائے قائم کریں گے۔میرے منصوبے بہت بلند تھے۔میں فاروقی صاحب کو (impress) کر کے شب خون میں چھپنا چاہتا تھا۔مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرے سارے منصوبوں پر پانی نہ پھر جائے۔اس سے پہلے شب خوں میں چھپنے کی میری کوشش ناکام ہو چکی تھی کہ مرحوم سید ارشاد حیدر صاحب میری تخلیقات معذرت کے ساتھ دو بار واپس کر چکے تھے۔اب میں اس موقعے کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔شعری نشست میں سب سے پہلے مجھ سے پڑھوایا گیا۔میں چوبیس سال کا لڑکا اور سامنے فاروقی صاحب جیسا نابغہء روزگار ،میری حالت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔میرے ایک آدھ شعر پر فاروقی صاحب نے سر ہلا کے پسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا۔میں بہت خوش ہوا اور مرحوم ظفر احمد کو اندر ہی اندر دعائیں دیتا ہوا وہاں سے نکلا جنھوں نے مجھے اس شعری نشست میں شریک کیا تھا۔یہ وہی ظفر احمد ہیں جن کا انتقال نوے کی دہائی میں رانچی میں ہوا۔اس وقت وہ رانچی دوردرشن کے ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے اور نظموں کے بہت عمدہ شاعر تھے۔اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔اس مشاعرے کے بعد فاروقی صاحب نے مجھ سے کہا ہمیں اپنا کلام کیوں نہیں بھیجتے ،میں نے فوراً کہا جناب بھیجا تھا لیکن وہاں سے

سید ارشاد حیدر صاحب کے دوسطری جواب کے ساتھ کلام واپس بھیج دیا جاتا ہے۔۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر کا پتہ لکھوایا اور ہدایت کی کہ اس پتہ پر اپنا کلام بھیجو۔ یہ ستمبر 1974 ستمبر کا مہینہ تھا۔ میں نے دوسرے ہی دن اپنی دو تین غزلیں اور دو تین نظمیں روانہ کیں۔ 74 بھی نکلا 75 بھی نکلا میرا کلام نہیں چھپا۔ ان دنوں سال میں مشکل سے شب خون کے تین یا چار شمارے نکلتے تھے۔ 76 کا ستمبر کا مہینہ آیا۔ شب خون کا سواں شمارہ نمبر ۱۰۰ آیا۔ اس میں میری ایک غزل اور ایک نظم شامل تھی۔ میرے پاؤں مشکل سے زمیں پر پڑتے تھے۔ اس کے بعد میں لگاتار شب خون میں چھپتا رہا اور غالباً ظفر اقبال کے بعد میں دوسرا شاعر ہوں جس کی زیادہ غزلیں شب خون میں چھپی ہیں۔ سن 76 سے اس کے بند ہونے تک میری تقریباً 129 غزلیں اس میں شائع ہوئی ہیں۔ اس سے زیادہ سوائے ظفر اقبال کے کسی کی تخلیقات شائع نہیں ہوئی ہیں شب خوں میں۔

شب خوں میں پہلی بار اپنی ایک غزل اور ایک نظم دیکھ کر میں اردو کی طرف زیادہ توجہ دینے لگا۔ اب میں چاہتا تھا کہ میری اردو تخلیق خوب سے خوب تر ہو۔ میں اب وقفے وقفے سے شب خون میں چھپنے لگا اور میرا حوصلہ بھی بڑھتا گیا۔ ایم اے کرنے کے بعد میں ابھی مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری ریسرچ سینٹر کو ترقی دے کر باقاعدہ ایک شعبہ بنایا گیا۔ جہاں ڈپلوما اور ایم اے بھی کیا جاسکتا تھا۔ پروفیسر رحمٰن راہی صاحب، جو اس وقت شعبۂ فارسی میں بحثیت ریڈر تعینات تھے، کو شعبۂ کشمیری کا صدر بنا دیا گیا۔ ایک لیکچرر کی تعیناتی کی گئی اور وہ تھے ڈاکٹر شفیع شوق۔ ظاہر ہے کہ دو آدمی پورا شعبہ نہیں چلا سکتے تھے اور آدمیوں کی ضرورت تھی۔ ایک دن پروفیسر رحمٰن صاحب پوچھتے پوچھتے میرے گھر پہنچ گئے اور مجھ سے کہا کہ آپ شعبۂ کشمیری میں فی الحال ایڈہاک لیکچرر کی حیثیت سے کام کیجیے۔

اس کے بعد جونہی اوراسامیوں کی جگہ نکل آئے گی آپ کو مستقل کیا جائے گا۔اس وقت میں پروفیسر حامدی کے تحت اردو شاعری میں علامت نگاری کے عنوان پر ایم فِل کرر ہا تھا۔میں نے راہی صاحب سے کہہ دیا کہ میں آنے والے سوموار سے آؤں گا۔اس طرح سے میرے کیرئیر کا آغاز یونیورسٹی کے ایک ایڈ ہاک لیکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ایک سال کے بعد ایک لیکچرر کے لئے انٹرویوز ہونے جارہے تھے۔میں نے بھی اپلائی کیا ہوا تھا اور میں پُر امید تھا کہ میری تقرری ہوجائے گی کیونکہ رحمٰن راہی صاحب انٹرویو میں خود موجود ہوں گے اور ایکسپرٹ بھی ان ہی کی پسند کا مدعو کیا گیا تھا۔میں نے انٹرویو دیا اور تیسرے دن ہی پتہ چلا کہ میری تقرری نہیں ہوئی۔اس کے بعد یو پی ایس سی کا ایک اشتہار میری نظر سے گزرا۔آل انڈیا ریڈیو کو کچھ پروگرام آفیسروں کی ضرورت تھی۔ میں نے فوراً اپلائی کیا۔کچھ مہینوں کے بعد دلی میں انٹرویو ہوا۔میرا سلیکشن ہوا اور میری پوسٹنگ سرینگر کے ریڈیو اسٹیشن میں ہوئی۔میں نے ریڈیو اسٹیشن جوائن کیا۔اس نوکری میں کوئی فراغت نہیں تھی۔کبھی کبھی ٹرانسمشن بند ہونے تک یعنی رات کے گیارہ بجے تک بھی اسٹیشن میں رہنا پڑتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایم فل نہ کرسکا۔

ریڈیو میں آنے کے بعد مجھے تخلیقی کاموں کے لئے کم وقت ملنے لگا۔کم گو تو میں پہلے ہی تھا لیکن اب وقت نہ ملنے کے باعث کچھ اور کم گو ہوا۔کبھی کوئی تخلیق کشمیری میں ہوتی تھی تو کبھی اردو میں ہوتی تھی۔اردو میں لکھی ہوئی تخلیق فوراً شب خون کو بھیجتا اور وہ ایک طویل وقفے کے بعد چھپتی۔میں اسّی کی دہائی کی بات کررہا ہوں۔ان دنوں شب خون تین یا چار مہینوں کے بعد آتا تھا کبھی کبھی تو چھ مہینوں کے بعد بھی آتا تھا۔ہم اس کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔

اسّی کی دہائی میں میرے لکھنے کی رفتار کچھ کم ہوئی۔کبھی کبھار کوئی غزل ہوتی

تھی۔ یہاں تک کہ سال 1990 آیا۔اس سال سے کشمیر کی پر آشوب تاریخ کی شروعات ہوئی۔اس سال کے بعد سے آج تک لوگ زیادہ تر گھروں میں ہی قید ہو کر رہ گئے۔کبھی کرفیو کی وجہ سے، کبھی ہڑتال کی وجہ سے۔لوگوں کی زندگیوں کا معمول تبدیل ہو گیا۔ریڈیو کے معمولات پر بھی اثر پڑا۔کرفیو کبھی کبھی ایک ایک مہینہ تک رہتا۔اس سے یہ ہوا کہ مجھے اب لکھنے پڑھنے کے لئے کافی وقت ملنے لگا۔اب میرے لکھنے کی رفتار بھی کچھ تیز ہوئی اور اسّی نوے کی دہائی میں شب خون میں متواتر چھپتا رہا۔ 1995ء میں، میں نے اپنا پہلا کشمیری مجموعہ ترتیب دیا۔یہ مجموعہ (نے چھے نالان) اسی سال چھپ کر آ گیا اور یہاں کی ادبی حلقوں میں اسے خوب پذیرائی ملی۔اس مجموعہ کو ریاستی کلچرل اکادمی کا ایوارڈ 1996 میں ملا اور 1997 میں اس مجموعے کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل گیا۔2004 میں میرا پہلا اردو مجموعہ (انہار) شائع ہوا اور اس کی بھی اردو کے جدید ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔2006 میں میرا دوسرا کشمیری شعری مجموعہ (دستاویز) شایع ہوا۔یہ کافی ضخیم شعری مجموعہ تھا۔اس کے بعد میرا دوسرا اردو شعری مجموعہ (مشراق) منظر عام پر آیا۔2009 میں میری ایک اور کتاب منظر عام پر آئی۔یہ کتاب کشمیری عروض سے متعلق تھی۔اس کتاب میں بحور و اوزان کی جانکاری تو تھی ہی لیکن زیادہ زور ان مسائل پر تھا جو کشمیری غزل پر عروض کے اطلاق سے پیدا ہوئے تھے۔یہ مسائل تلفظ اور لسانیاتی نوعیت کے ہیں جن پر کتاب میں خوب بحث کی گئی ہے اور ان کا حل بھی تجویز کیا گیا ہے۔اس کتاب میں ان بحور کا بھی تذکرہ ہے جو میری کھوج کے مطابق کشمیری موسیقی سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہایت آسان اور سہل الفاظ میں زحافات، تخفیف، تقطیع اور تسکین اوسط کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔باقی تمام کتابوں کے بنڈل ابھی میرے پاس پڑے ہیں لیکن اس کتاب کی صرف ایک کاپی میرے پاس ہے اور شاید اس کا دوسرا ایڈیشن بھی چھاپنا پڑے گا کیونکہ کئی لوگ

اس کتاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

2010 میں ملازمت سے سبکدوش ہوا۔تب تک میں کئی ریڈیو اسٹیشنوں میں مشکل ترین حالات میں کام کرنے کا تجربہ حاصل کر چکا تھا یہاں تک کارگل جنگ کے دوران مجھے ریڈیو سٹیشن کارگل کا چارج دیا گیا۔ جہاں میں نے تین سال کام کیا۔خیر میرے ریڈیو میں کام کرنے کی داستان الگ ہے اسے یہاں بیاں کرنے کا موقع نہیں۔ایک بات کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ جو بھی شاعر اور ادیب ریڈیو میں بحثیت ملازم داخل ہوا اس کو اپنی تمام تخلیقی قوت ریڈیو کے لئے لکھنے میں ہی صرف کرنا پڑتی ہے۔میں خوش نصیب ہوں کہ ریڈیو کے لئے بھی لکھتا رہا اور جینوئن ادب تخلیق کرنے کے لئے بھی اپنی تخلیقی قوتوں کو بچائے رکھا۔

شاعری کے بارے میں میرا تصور یا نظریہ کیا ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہ بتاؤں گا کہ میں کس طرح کی شاعری پسند کرتا ہوں۔یہ بتانے سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ مجھے کس طرح کی شاعری پسند نہیں۔ مجھے وہ شاعری بالکل ہی پسند نہیں جس میں صرف قافیہ پیمائی کی گئی ہو ایسی شاعری کو موزوں گوئی کہنا زیادہ مناسب ہے، مجھے وہ شاعری بھی پسند نہیں جس میں محض کسی خیال یا کسی جذبے یا کسی احساس کی اسی طرح ترسیل کی گئی ہو جس طرح نثر میں کی جاتی ہے۔شاعری میں بیانیہ کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہونا چاہئے یا ہونا ہی نہیں چاہیے، ایسی شاعری بھی مجھے بالکل پسند نہیں جس میں قاری کی شرکت کی گنجائش ہی موجود نہ ہو، جو شعر پڑھتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے جیسے چٹکلہ سنتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے وہ شعر بھی مجھے پسند نہیں۔ مجھے وہ شاعری پسند ہے جس میں خیالات کی ترسیل نہیں بلکہ تجربے کی تجسیم کی گئی ہو۔ایسی شاعری ظاہر ہے مبہم ہوتی ہے اور قاری کو ایسی شاعری میں شرکت کا بھرپور موقع بھی ملتا ہے۔وہ اپنی پسند کے معنی شعر سے اخذ کرسکتا ہے یا متن کے پیش

نظر شاعر کے معنی و منشا کو رد کر کے نئے معنی کی تعمیر کر سکتا ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب شاعری کثیر المعنویت کی حامل ہو۔ ظاہر ہے ایسی شاعری کے لئے شاعر کو زباں سازی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے یا زباں کو پیچیدہ سے پیچیدہ تجربات کو پیش کرنے کے قابل بنانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے وہ پیکروں، علامتوں اور استعاروں کو بروئے کار لاتا ہے۔ کیوں کہ انہی چیزوں کو برت کر زباں کو تخلیقی بنایا جاسکتا ہے اگر ان چیزوں کو برتنے سے اجتناب کیا جائے تو شاعری کی زبان بھی تخلیقی نہیں رہتی اور غیر تخلیقی زبان میں کی گئی شاعری میرے خیال کے مطابق شاعری کہلانے کی حقدار نہیں۔ یا ایسی شاعری ایک بار پڑھ کر دوبارہ نہیں پڑھی جاتی۔ جبکہ وہ شاعری جو تخلیقی زبان میں کی گئی ہو جس میں ابہام بھی ہو کثیر المعنویت کی حامل ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شعر چیستان ہو یا معمہ ہو جو سمجھ ہی میں نہ آئے۔ بعض اوقات ایک سیدھا سادا سا نظر آنے والا شعر بھی اتنا مبہم ہوتا ہے کہ قاری ذہنی طور اس شعر میں شریک ہو کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ میرؔ کے کئی اشعار کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ بظاہر آسان نظر آتے ہیں لیکن ہوتے نہیں۔ غرض ایسی شاعری کو میں پڑھتا ہوں اور پسند کرتا ہوں۔ اور ایسی ہی شاعری کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

☆☆☆

☆......پروفیسر حامدؔی کاشمیری

رفیق رازؔ: قادرالکلام شاعر

پروفیسر ایم ، ایس وانٹ سابق صدر شعبہ انگریزی، کشمیر یونیورسٹی نے تیس پنتیس سال قبل ایک ادبی مباحثہ بعنوان " معاصر شاعری کی ساخت ایک مرتی ہوئی تکنیک ہے" کا اہتمام کیا جو یونیورسٹی میگزین میں 1970 میں چھپ چکا ہے۔ان کے وزنی دلایل و براہین کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ شعری زبان کیوں مرگ آشنا ہے۔ میں اردو کی معاصر شاعری کا مطالعہ کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ میر انیسؔ، میر حسنؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کی قد و قامت کا کوئی شاعر سامنے کیوں نہیں آتا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ واقعتاً معاصر شاعری کا گراف نیچے کی طرف آرہا ہے۔اس کا بنیادی سبب اس کا سال خوردہ اور روایت زدہ لسانی نظام ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ نئی نسل کے معدودے چند شعراء شعری عمل میں لسانی برتاؤ کی اہمیت سے واقف ہیں۔لیکن عظمت رسی ان کے لئے تعبیر نا آشنا خواب ہے۔

رفیق رازؔ کشمیر سے طلوع ہونے والے ایک اہم اور زبان شناس شاعر ہیں۔ وہ شروع سے ہی انبوہ آوارگاں میں شامل نہیں ہیں۔ وہ انفرادی حیثیت کو منوانے کی طرف سنجیدگی سے متوجہ رہے اور بقولِ پروفیسر وانٹ صاحب مرگ آلود معاصرین سے مجتنب ہونے اور اپنے ہونے پر اصرار کرتے رہے۔ وہ اوروں کی دیکھا دیکھی، یا تفنن طبع کیلئے یا کسب زر کیلئے شعر نہیں کہتے۔ یہ کام ان کے بیشتر معاصرین زور وشور

سے انجام دیتے ہیں۔ شاعری ان کیلئے اپنے داخلی وجود کی نیرنگیوں اور اسرار سے رابطہ قائم کرنے کا عمل ہے۔ یہ یافت اور نایافت کا عمل ہے۔ یہ ان کے یہاں جبلی اور لاشعوری محرکات سے مربوط ہے۔ یہ ان کے باطن کی گہرائیوں سے پھوٹنے والی روشنیوں اور تاریکیوں کے انضمام وافتراق کا طلسمی منظرنامہ ہے جو دعوت نگاہِ دیتا ہے۔

رفیق راز تخلیقی سفر میں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ لفظ کی حرمت، تلازمیت اور قوت ہے جو اُن کے سفر کو منزل آشنا کرسکتی ہے۔ یہ آگہی روایتی اور گھسے پٹے پیکر کی قلعی کھولتی ہے۔

اس کے باوجود روایتی اور مستعملہ الفاظ ان کے اشعار میں درآتے ہیں۔ "سپہر کبود"، "چشم حسود" "سرحد ادراک"، "جلوۂ صد رنگ"، "آگ کا دریا" "قلزم خوں" وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ ان کے یہاں استعارہ کاری کا رجحان اعتدال سے تجاوز کرکے شعری تجربے کو علامتی مجوبیت سے دور لے جاتا ہے۔ "خوف کی آندھی" "یا" روح کا دریا" اس کی مثالیں ہیں۔ بعض اشعار میں لفظوں کی منقلب صورت کے ہوتے ہوئے بھی بات آگے نہیں بڑھتی۔ اگر اس نوع کے الفاظ کا ان کے اشعار میں تداخل اپنی حدوں کو پار کر جاتا یا مستقل یا غالب ہوتا تو ان کے شعری نمونے داخلِ دفتر ہوگئے ہوتے۔ یہی وہ المناک صورت حال ہے جس کی گرفت میں بیشتر شعراء آجاتے ہیں۔ وہ لسانی اعتبار سے سہل انگاری، سطح بینی، موضوعیت اور معنی و مطلب کے گرویدہ رہے ہیں۔ ان کے برعکس رفیق راز لفظ شناسی اور لفظ سازی سے کام لے کر زبان کی مقلدانہ روش سے انحراف کرتے ہیں۔ رفیق راز کی کامیابی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ تضاد، افتراق، الہام، طنز، قولِ محال، اور ترکیب سازی میں غیر معمولی ہنرمندی کا ثبوت دیتے ہیں، "شہرِ حادثات"، "جلوہ گہہِ ممکنات"، "معرکۂ خواب وفسوں"، "عرصۂ سیاہ"، "قافلۂ نور" "آتشِ حیرت"، "شہرِ

نامراد" اور " شعلۂ خواب" اس کی مثالیں ہیں۔ ہمارے عہد میں جو چیز شاعری کو نا شاعری میں بدل دیتی ہے، وہ اس کی عائد کردہ نظریاتی ادعائیت ، حقیقت نگاری ،عصری، شخصی یا اجتماعی مقصدیت کی موجودگی اور اس کی آسانی سے نشان زد کرنے کا تنقیدی عمل ہے۔ شاذ و نادر ہی ایسا کوئی طریقِ نقد سامنے آتا ہے جو شعر کی فرضی صورت حال کو باہر کی حقیقت سے مفرق کرے۔ اگر متن میں لسانی کارگزاری کے مختلف اور منفرد ہونے اور خارجی حقیقت سے اس کے انقطاع پر زور نہ دیا جائے تو اس کا وجود وعدم ایک ہوجاتا ہے۔ نقادوں کا میر کے غمِ دوراں ، غالب کے 1857 کے سانحے ،اقبال کے تصورِ خودی، ناصر کاظمی کی ہجرت اور فیض کی رومانیت ،اور انقلاب پسندی کو حاصلِ نقد قرار دینا ان شعرا کی تخلیقی جینیس پر سوالیہ نشان لگانے کا بے فیض عمل ہے۔

رازؔ کی شاعری میں ایک ایسی متغیر جلوہ گری ملتی ہے جس میں نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ہے۔ یہ لحہ بہ لحہ صاعقہ وشعلہ وسیماب کی دنیا ہے جو قاری کی حسیاتی اور جمالیاتی تشفی کا باعث بنتی ہے۔ وہ حیرت زا، نادر اور نظرتاب وقوعوں سے گزرتا ہے اور ذہنی اور جذباتی طور پر برومند ہوتا ہے۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
(اقبال)

رفیق رازؔ کے چند اشعار یہ ہے۔

آگے تھیں فقط خستہ فصیلیں ہی فصیلیں
تحریر کہیں کوئی عبارت بھی نہیں تھی
دل میں بہت ڈر بھی تھا نزول بلا کا
اور میرے سر پہ آسماں بھی نہیں تھا

کہنے آئے تھے مگر کچھ نہ کہیں گے اب تو
صرف الفاظ ہواؤں میں اڑیں گے اب تو

شعر نمبر ۱ میں ایک متجسس متکلم سامنے آتا ہے جو ایک ایسے غیر آباد (Deserted) شہر میں وارد ہوا ہے، جس کی پوری آبادی کو رفتارِ وقت، کسی بڑے حادثہ ،تاریخی جبرت، کسی حملے یا ناگہانی بلا نے یا تو موت بہ کنار کیا ہے، یا ترکِ سکونت پر مجبور کیا ہے اور اب اس غیر آباد شہر میں صرف فصیلیں ہی فصیلیں ہیں جس سمت کو جائے ادھر فصیل کھڑی ہے۔ نو وارد یہ جاننے کی خواہش رکھتا ہے کہ آخر اس شہر پر کیا گزری ہے۔ اس کے بارے میں کسی پتھر پر کندہ کوئی تحریر بھی نہیں ہے جس سے شہر گمشدہ کا کوئی سراغ ہی ملتا۔ متجسس کردار اس شہر میں قدم رکھتا ہے تو اسے بے نام ونمود فصیلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شعر میں ایک حسیاتی اور مہم پسند وقوعہ ابھرتا ہے جو معنوی امکانات سے معمور ہے۔

شعر نمبر ۲ کا کردار ایک پُر خطر راستے پر گامزن ہے۔ اس کے دل میں نزول بلا کا ڈر ہے۔ یہ ڈر اتنا شدید ہے کہ وہ تحفظ ذات کیلئے آسماں کی جانب دیکھتا ہے۔ مگر وہاں آسماں ہی نہیں۔ ایک ہلاکت آفریں وقوعے سے متصادم ہو کے کسی کی جانب سے کوئی بچاؤ کی صورت نہ دیکھ کر اسے بچاؤ کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے، وہ آسماں ہے اور آسماں بھی وہ، جو انسان کا دشمن متصور ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بچاؤ کی یہ صورت بھی موجود نہیں۔

شعر ۳ میں لفظ کی عدم معنویت کا تجربہ ابھرتا ہے۔ لفظ کثرت استعمال سے اپنی معنویت کھو چکا ہے اور وقت ضرورت تخلیقی تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا۔ شعر میں کردار اطلاع دیتا ہے کہ کسی طائفے پر جو افتاد پڑی ہے وہ کہنے آئے تھے کہ ایک اجتماعی حادثہ ہوا ہے جو وہ دیر تک برداشت کرتے رہے مگر اب وہ زبان پر لانا چاہتے تھے مگر جب

وہ اظہار کی سعی کرنا چاہتے ہیں وہ کسی نامعلوم وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے اور ترسیل کار الفاظ تیز ہوا میں "اڑ جائیں گے"، لفظ کی عدم معنویت کا وہی نکتہ ہے، جو پروفیسر وانٹ نے کہا تھا۔

☆☆☆

☆......محمد یوسف ٹینگ

رفیق راز: دشتِ شرر کا ساربان

تقریباً دو صدیوں سے کشمیر اور اردو دو عاشقوں کی طرح رومان انگیز رنگ رلیوں میں مشغول ہیں۔کبھی ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے اور کبھی ایک دوسرے کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے۔اس دوران اس خوبصورت سرزمین پر بڑے بڑے ادبی آشفتہ سر اس عشوہ طراز حسینہ کو قابو کرنے کی سعی کرتے رہے۔لیکن ہماری ادبی تاریخ گواہ ہے انہیں ایسا کرنے کے بعد خدائے سخن میر تقی میر کے اس شعر سے ہی اپنے آپ کو تسلی دینا پڑی :

ساعد سیمیں اس کے دونوں ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول وقسم پر، ہائے خیالِ خام کیا

مگر پچھلی صدی کے جاتے جاتے رفیق راز کی پیشوائی میں چند نئے ہم نواؤں کی آمد کے بعد صورت بدل گئی اور یہ نو وارد اردو سخن سرائے کے قلب میں خیمہ زن ہو گئے۔اس میں کچھ تو ان سخن وروں کے اپنے کسب وکمال کا ہاتھ تھا اور کچھ اردو کی اپنی کربلا کی کارفرمائی تھی یا اس زبان کو درۂ خیبر کی طرف دھکیلنے کی کوششیں تھیں جو قائم چاند پوری کے الفاظ میں ریختۂ دکن تھی۔بہر حال تنگئی اوراق کی معذرت کے ساتھ بات رفیق راز سے شروع کرتے ہیں۔اس کا زیر نظر مجموعہ کلام اردو کے عصری مزاج اور موسم کی ایسی ہی برجستہ اور شگفتہ جھاڑی لگتا ہے جیسی اردو کے دوسرے چمن

زاروں مثلاً دلی، حیدرآباد، ممبئی ، الہ آباد، لاہور وغیرہ میں اپنے پھولوں اور کانٹوں کے ساتھ لہلہا رہی ہے۔ رفیق رازؔ کے اس نزول کی چاپ ہم نے پہلے پہل شمس الرحمان فاروقی کے عہد آفریں مگر جواں مرگ جریدے (شب خوں) کے روایت سوز صفحات پرسنی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو شعر وادب ذوق اور ذائقے کی دھار بدلنے والے اس رسالے میں رفیق راز سب سے زیادہ چھپنے والا کشمیری ہے۔ (شب خوں کے یہ اوراق اتنے نادر الحصول تھے ہمارے کچھ ایسے اردو خوان پنا نام دیکھنے کی حسرت میں آہیں ہی بھرتے رہے، جن کے ساتھ بہتیرے مجموعوں کی چنگیری لٹکی ہوئی ہے۔)

ناقدوں نے ادبی نثر کو چلنے پھرنے (Walking) اور نظم کو رقص (Dance) کرنے سے تشبیہہ دی ہے۔ رفیق راز کی اس کتاب میں اس رقص آسائی کے بہت وطیرے اور پینترے نظر آتے ہیں۔ کبھی کسی نازنیں کی اداؤں کے کرشمے اور کبھی کسی تانڈو کی ہیبت انگیزی۔ موسیقی ریزی شاعری کی رگ رگ میں بستی ہے لیکن یہ ایسا جام جہاں نما بھی ہوتی ہے جس میں تفصیل اور تشریح کے گرد وغبار سے زیادہ تاریخ کی روح کا عطر ٹپکتا رہتا ہے۔ رفیق راز کے کشمیر کے کچھ نقوش اور صدائیں سنتے چلیں تو اس رمز کے کنائے بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔

یہ ٹوٹے پھوٹے گھر ہیں کہ تحریر وقت کی
یہ شہر ہے کہ کوئی نوشتہ عذاب کا

بھرتا ہوں آہِ سرد لرزتا ہے کوہسار
دھنتا ہے سر کو طاق پہ افسردہ سا چراغ

فلک سے اترا ہوا یہ کوئی عذاب نہ تھا
چھپا تھا زلزلہ دیوار و در کے اندر ہی

لیکن شاعر زمانی اور زمینی ہونے کے ساتھ ساتھ ماورائی اور ماسوائی بھی ہوتا

ہے۔ سچی شاعری میں جو امیجری اور تصویر نمائی ملتی ہے اس کے نقوش خواب کی تجریدی دنیا ہی سے مستعار ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کا بھی یہی خیال تھا۔

نہیں ہے کیا کوئی ایسا جہان میں غالب
جو جاگتے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

اس کتاب کا شاعر بھی اپنے خوابوں میں اسی صحرائے نجد کا باشندہ ہے جس کا اندازہ اس کتاب میں صحرا کے بار بار ذکر اور صرصر کی تکرار سے ہوگا۔ اس کے دشتِ ذات کی نرالی اور خاص صفاتی ترتیب ہے۔ وہ طوفان گرد و غبار میں عجیب خد و خال دیکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے یہاں الگ تھلگ لفظ کا وجود تلاش ہی سے ملتا ہے کہ وہ لفظ کی آمریت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں پیکروں کے جلوس اور پہنائیوں کے چراغاں نظر آتے ہیں جن میں ماضی حال اور مستقبل اپنے صیغے بھول کر ایک بڑے تہذیبی کینوس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔

معنی ہوں پر قیام نہیں لفظ میں مرا
باشندہ ہی نہیں ہوں میں ملک کتاب کا
ڈوب جاتا ہے جو اس میں وہ ابھرتا ہے کہاں
بے صدا حرف میں پاتال کی گہرائی ہے
خاک بدن کو صرصرِ سفاک چاہئے
اڑتی نہیں یہ خاک صبا کے خرام سے
نہرِ کوثر ریت میں ہے نارِ دوزخ آب میں
دشت میرے پیچھے ہے' دریا ہے میرے سامنے

معاصر کشمیر میں حسن و عشق کی سرگوشیاں کوچہ و بازار میں دھوم مچاتی نظر آتی ہیں۔ اس میں کچھ تو ماڈرنزم کے کسب و کمال کا ہاتھ ہے لیکن بنیادی طور پر یہ ایک دبے

ہوئے جذبے کی شورانگیزی ہے۔اس کا گراف بہرحال نیچے آجائے گا۔رفیق راز گہری نظر اور دھیمے لہجے کا سخن گو ہے۔اس نے اس ہنگامے میں جو خاص زاویئے دریافت کئے ہیں ان میں رومان انگیزی سے زیادہ ستم ظریفی کی کارفرمائی ملتی ہے۔ شاعرحسن جوئی میں جسم یار کوخود جمالیاتی انبساط میں حائل دیوار قرار دیتا ہے۔یہ ایک دانشور کی حسیت کا اظہار ہے جس میں لمسی کیفیات سے زیادہ ذہنی ارتعاشات سے حظ حاصل ہوتا ہے۔کبھی کبھی ایسے شاعراپنی معنی آفرینیوں سے ہی رنگینیاں خلق کرتے ہیں۔یہ وہ صورت ہے جس کی طرف ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہم کسی معشوق سے ملتے ہیں تو دوسری بار وہی بالکل ایک اجنبی کی طرح ذات دیگر لگتا ہے۔

گیسو دراز اور وہ آنکھیں عقیق سی
پھرتا ہے روز وہ لئے کیا رات کیا چراغ
سونا پڑا ہے شہر بدن کوئی راہرو
اک آگ لمس کی لئے صحرائے جاں سے آئے
کیا کروں تیرے بدن کی تعریف
شعلہ اک کاغذی پوشاک میں ہے
ہر سمت ایک دبدبۂ روشنی ہے آج
ہے وصل کی یہ رات بھی کتنی قمر زدہ

شاعر کی ایک بڑی آزمائش اس وقت ہوتی ہے جب وہ مانوس اور پامال لہجوں کی دلدل سے نکل کرانہی الفاظ میں نئی روشنی تلاش کرنا چاہتا ہے، جو معنی کی ہم رنگی اور تہہ نشینی کے باوجود تازہ مہک پیدا کرسکیں اوران سے نئی راگنیوں کے سُر ابلنے لگیں۔ایسے لمحات میں خیال زندہ ہوکر سانس لینے لگتے ہیں اور لفظ انگاروں کی طرح دہکنے لگتے ہیں۔یہ دراصل شاعر کی اپنے میڈیم پر مکمل قدرت اورنصرت کی آئینہ داری

ہوتی ہے۔رفیق راز اس کسوٹی پر سچا نکلتا ہے۔

ہزاروں چشمے تڑپتے ہیں ان کے سینوں میں
چٹانیں رکھتی نہیں ہیں مگر لب اظہار
میں ایک فعل مسلسل، تُو اسمِ اعظم ہے
ہمارے بیچ میں حائل ہے ایک حرف جار
دوڑتا جس کوہ کی رگ رگ میں ہے میرا سکوت
میری ہی آواز سے اک دن فنا ہوجائے گا
ڈالتا ہوں روز اس میں نیکیاں دو چار میں
صورت کشکول یہ دنیا ہے میرے سامنے
گلوئے خشک سے تقریر کر رہا ہے کوئی
تڑپ رہا ہے زمیں دوز کوئی چشمہ بھی

رفیق راز اردو اور کشمیری کا نثر نگار ہونے کے علاوہ کشمیری شعر و ادب کا شناسا اور شناور بھی ہے۔اس بڑے شعری ایوان کی کچھ صدائیں شاید اس کی اجابت کے بغیر اس کے کلام میں اردو کی پوشاک زیب تن کر کے جستہ جستہ دندنانے لگتی ہیں۔ صرف چند نمونے:

ناوٗ در آب تے، آب در ناوٗ
(ترجمہ: کشتی پانی میں ہے اور پانی کشتی میں)
سوچھ کرال

پانی میں سفینہ ہے، سفینے میں ہے پانی
ہے آب فقط آب، سر آب تہہ آب
رفیق راز

چھے کر نازنیں کانسہ سیود روئے ہاواں
توے آبہ منز زون الان ٹاٹھ یارو
مہجور

(ترجمہ: خوباں اپنا روئے زیبا کب دکھایا کرتے ہیں جبھی تو چاند کا عکس پانی میں بھی لرزتا ہے)

لایا ہے مجھے منظرِ مہتاب تہہِ آب
دیکھا تو ملا کچھ نہیں جز آب تہہ آب
رفیق راز

یہ شعر صرف ایک غزل سے چنے گئے ہیں۔فرصت میسر ہو اور ایسی سعی کی جائے تو اور بھی مثالیں ملیں گی۔کشمیر کے کلاسیکی شعرا پر ہی کیا موقوف' مرزا غالب کی یہ بازگشت بھی دیکھئے

کہاں سے آتے ہیں لعل و گہر خیال کے ہر روز
دبا ہوا تو نہیں میری خاک ہی میں بدخشاں
رفیق راز

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے جو کھودیں جا کے معدن کو
غالب

رفیق راز اردو دنیا کا جانا پہچانا ہی نہیں مقبول و مستند نام ہے۔اس کا پہلا مجموعہ کلام (انہار) تقریباً دس سال پہلے شائع ہو کر اس کی شعری بصیرت کا ڈنکا بجا چکا ہے۔پانچ سال قبل شایع ہونے والا اس کا دوسرا مجموعہ (مشراق) ابھی تک داد و تحسین وصول کر رہا ہے۔شعر سے لطف اندوز ہونے والوں کی تعداد قلیل ہوتی ہے۔ اردو کے سمٹتے ہوئے دائرے میں وہ بہت معروف ہے۔کشمیری اردو دوستوں کے لئے

یہ بات افتخار اور اعتبار کی ہے کہ اردو شعر کے (Highland) پر ہمارا ایک سخن گو پوری آن بان سے جلوہ گر ہے اور اس کے ساتھ اس کے چند ہم نوا کشمیریوں کی بدولت اب دبستان دلی، دبستان لکھنو وغیرہ کی تمیز مٹ جانے کے بعد ہمارے شاعر ایک ہموار زمین پر نغمہ سرا ہیں اور کشمیر کی اردو سرائی کی روایت کو معتبر اور مستحکم بنا رہے ہیں۔

رفیق راز کا ایک اور گہرا شغف عروضیات اور اس سے وابستہ معاملات کے ساتھ ہے۔ اس موضوع پر اس کی کتاب بھی شایع ہو کر اپنا معیار منوا چکی ہے۔ خود اس کی منظومات میں بندش کی چستی اور ردیف و قافیہ کی ندرت اس کی استادی کی شہادت پیش کرتی ہیں۔ اس کے کلام سے ڈھونڈے سے بھی کوئی جھول، کوئی ڈھیل نظر نہیں آتی۔ البتہ میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ اس کے اشعار میں مضامین کی ہی نہیں استعارات، محاکات وغیرہ کی تکرار بھی کچھ زیادہ ہی گونجتی ہے۔ شاید کچھ ایسے اشعار بھی اس قصر سخن میں ہیں جنہیں انتخاب کی بے لاگ چھلنی دکھا کر الگ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اقبال، فیض اور فراز جیسے بڑے شاعر بھی اس کے ارتکاب سے نہ بچ سکے تو رفیق راز کے یہاں بھی اس کا جواز مل جائے گا بلکہ میں تو اپنے آپ کو اس کی اس تعلّی پر سر دھننے سے باز نہیں رکھ سکتا :

ہے میری غزل سروِ چراغانِ مضامیں
دیواں ہے مرا گرمیٔ اظہار سے روشن

☆☆☆

☆......حکیم منظورؔ

رفیق رازؔ: ایک لہجہ ساز شاعر

رفیق رازؔ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک (Genuine) شاعر کا نام ہے۔ (Genuine) اس لحاظ سے کہ وہ شعر کہنے کے فن سے واقف ہیں اور اپنی ذات اور کائنات کے خالق کے تکون میں اپنے زاویئے کے درجے کا تعین کرنے کا جتن کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے صوفیت کے خانے میں درج کریں گے مگر چونکہ صوفیت کو بھی میں ماورائے فہم کوئی کیفیت نہیں سمجھتا، اس لئے میں رفیق رازؔ کو صوفی شاعر نہیں کہوں گا۔ رفیق رازؔ کی شاعری انہی کیفیات سے لبریز ہے جن سے شاعری ترتیب اور تہذیب حاصل کرتی ہے۔ رفیق رازؔ جدیدیت کی تحریک سے (اگر وہ واقعی کوئی تحریک تھی) وابستہ شاعر نہیں (اس امر کے باوجود کہ رازؔ کا طلوع جدیدیت کی جوانی کے دور میں ہوا) وہ ترقی پسند شاعر بھی نہیں کہ اس کے عروج کے زمانے میں وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ وہ صوفی بھی نہیں کہ باوصف اس کے ان کی سوچ کا محور ان کی ذات ہے، وہ اصل ذات اور کائنات میں اپنے وجود کے معنی سے روشناس ہونے کی سعی کرنے سے منکر نہیں وہ ہمہ اوست یا ہمہ از اوست، کے فلسفوں کے مبلغ بھی نہیں لیکن منطق اور معروض کی باریکیوں اور ان کی اہمیت سے کما حقہ واقف ہیں۔ وہ فعال اور متحرک ہیں، فکر روزگار بھی کرتے ہیں اور فکر شعر بھی کرتے ہیں۔ منفی اور مثبت صحیح اور مہمل کی فسوں کاریوں کے رمز شناس بھی ہیں۔ اسی لئے وہ (Genuine) ہیں ؂

یہ رنگ و بو جو گلابوں میں دیکھتے ہو تم
مرے سوال کا ان میں جواب رکھا ہے

☆

آسودۂ نظر ہیں مناظر سراب کے
بھڑکے ہوئے ہیں شعلے بھی اسرارِ خواب کے

☆

درونِ روح تری یاد کی رمق اب بھی
خموشیوں میں شرابور ہو رہی ہوگی

میں ذاتی طور پر کیفیتوں کی تشریح اور تفسیر بیان کرنے سے ہمیشہ عاجز رہا ہوں۔ شعر چونکہ میرے نزدیک ایک ایسی کیفیت ہے جس کو لمس کی طرح محسوس کیا جاسکتا ہے مگر اسے گرفت میں نہیں لایا جاسکتا۔ شعر کے بارے میں تمام فلسفیانہ اور عالمانہ موشگافیوں سے قطع نظر، کیا یہ حقیقت نہیں کہ کوئی (Genuine) شاعر کسی منصوبے کے تحت شعر نہیں کہتا اور نہ پہلے سے طے شدہ اور سوچے ہوئے موضوع پر خامہ فرسائی کرتا ہے۔ موضوع کا تعین نظم کا خاصا ہے۔ اسی لئے میرے نزدیک غزل انسانی مزاج کے زیادہ قریب ہے کیونکہ انسانی مزاج بھی کھونٹیوں سے بندھی ہوئی کوئی چیز نہیں۔ انسانی مزاج، انسانی فطرت، کائنات کی بُنت اور مالک کائنات کے کُن فیکُون کا رمز، سب غزل کی طرح متنوع ہیں اور ہر دم بلکہ ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح غزل میں اشعار ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوصف، باہم دیگر پیوست ہوتے ہیں۔ رفیق رازؔ اس رمز سے واقف ہیں، اسی لئے انہوں نے کشمیری اور اردو دونوں زبانوں میں صنف غزل کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ ایسا کر کے انہوں نے ایک جوکھم مول لیا مگر بحمد للہ وہ اس کو کامیابی کے ساتھ سر

کر گئے۔اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ رازؔ کے یہاں محبوبہ غزل شاد کام اور آسودہ ہے اور یہ مجموعہ اس کا ثبوت ہے۔

تمہاری ذات کا سایہ ہے استعاروں پر
سمندروں کی حکومت ہے ریگزاروں پر

☆

ترے نقشے میں آوازوں کے قلزم تو بہت ہیں
مری چپ کا وہ دہشت ناک صحرا ہی نہیں ہے

☆

خوف خزاں تو ہر موسم میں رہتا ہے سرسبز مگر
ایک ہری آواز پہ اکثر زردی چھائی رہتی ہے

☆

رقص میں برفاب کے سرو صنوبر ہیں یہاں
شعلۂ حیرت یہاں ہر شاخ پر لرزیدہ ہے

☆

لمس کے سیلاب کی رفتار بھی کچھ تیز ہے
جسم کی دیوارِ مرمر بھی ذرا بوسیدہ ہے

میں روش عام کے مطابق رازؔ کے چند اشعار کی تشریح کر کے قارئین کے ذوق کے ساتھ زیادتی نہیں کرسکتا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ شعر میرے نزدیک " کیفیت " اور احساس کا معاملہ اور ماجرا ہے اور کیفیت کو تشریح کی گرفت میں نہیں لایا جاسکتا، اس لئے میں اس سے احتراز کرتا ہوں۔ میں خائف ہوں کہ اگر میری تشریح سے رازؔ کا شعر مجروح ہوا تو میرے حصے میں شرمندگی کے سوا اور کچھ نہیں آئے گا۔اگر

میری تشریح رازؔ کے شعر ان کے ذہن میں پوشیدہ مفہوم سے مختلف ہوئی، تو رازؔ کے ساتھ بے انصافی ہوگی اور ان کو ٹھیس پہنچے گی۔ آج تک شاعری کی کئی شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور آئندہ بھی لکھی جائیں گی۔ جو شاعر اس دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں، وہ شرحوں کے صحیح یا غلط ہونے کے احساس کی شادمانی یا عذاب سے پرے ہیں لیکن زندہ شاعروں کے ساتھ میں کم از کم اس قسم کی زیادتی کا روادار نہیں۔ ممکن ہے یہ رویہ عام (اعتقادات) سے مختلف ہو مگر یہ میری اپنی رائے ہے' اس لئے میں اسی پر مُصر رہوں گا۔ اسی تناظر میں رازؔ کے اشعار کو Quote کر کے ان کی تشریح سے میں گریز کرتا ہوں۔ اس کے باوجود قاری کی حیثیت سے اُن کی شاعری کے رنگ متعین کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اپنے عندیئے کیلئے میں اور کسی کو نہیں خود رازؔ صاحب سے تصدیق طلب کروں گا اور اس سلسلہ میں ان کے اشعار پیش کرنا ناگزیر ہوگا۔

سبزہ و خوشبو میں اک سیلاب خوں پوشیدہ ہے
شہر کی دہلیز پر قہرِ سیہ خوابیدہ ہے

☆

لرزتی شاخ' ہوا اور پتیاں دوچار
کچھ ایسے قہر سے ہی ہم بھی ہیں میاں دوچار

☆

اک خلل اور سراسیمہ سیہ خاک میں ڈال
خوفِ نادیدہ نواحِ دلِ بے باک میں ڈال

☆

دشتِ بدن میں شور ہے ایسا مچا ہوا
جیسے قدیم مصر کا بازار مجھ میں ہے

چشمِ خورشید سے ہے برسرِ پیکار سیہ
کرہٗ ذات میں کھلنے لگے اسرار سیہ

☆

اک خموشی کہ مہکتی ہے مرے کمرے میں
ایک آواز کہ ہے نقش بہ دیوار سیہ

☆

اک صدا ہوں میں کسی دشتِ سماعت کیلئے
ایک جگنو ہوں سر راہ طلب گار سیہ

کوئی صاحب الرائے شخص ظلمت کے وجود اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ رات کا سارا خمار اس کی ظلمت کا عکاس ہے اور رات کو قرآن نے لباس قرار دیا ہے۔ قرآن کے مطابق کائنات کا سفر "من الظلمٰت الی النّور" سا ماجرا ہے۔ انسان کی پیدائش بھی ظلمت سے نور کی جانب کی روداد ہے۔ ظلمت کے وجود سے نور کے معانی متعین ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ ظلمت ذہن اور آنکھوں میں درآئے تو قہر ڈھاسکتی ہے اور رات بن کر چھا جائے تو سکون وانبساط کا موجب بن سکتی ہے اس میں قہاری اور غفاری دونوں وصف موجود ہیں۔ کوئی اسے سر کرنے میں کامیاب ہوجائے تو اس پر اسرار کھل جاتے ہیں۔ رازؔ اسی ظلمت کے رنگِ سیاہ کو منور کرکے اسرار آشنا ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ سیاہ رنگ کی کلید سے ذات کے طلسم خانے کے بند دروازوں کو کھول رہے ہیں۔ اسی لئے کچھ کو ان پر صوفی شاعر ہونے کا گماں گزرتا ہے۔ حقیقت تاہم صرف یہ ہے کہ رازؔ صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی صوفی ہیں، رند نہ ہوتے ہوئے بھی رند ہیں۔ رازؔ کے شاعرانہ وجود کے اجزائے ترکیبی کو مجتمع کیا جائے تو اس سے جو پیکر بنے گا وہ ایک مکمل شاعر کا پیکر ہوگا۔ حسین وجمیل اور قابل

دید جیسے رفیق راؔز کا شاعرانہ پیکر۔ راز کی شاعری اسلئے بھی (Genuine) شاعری ہے کہ اس میں جو الفاظ بروئے کار لائے گئے ہیں' ان کے معانی یک سطحی نہیں بلکہ ہمہ سطحی ہیں۔ اچھی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ایسے الفاظ پر مبنی ہوتی ہے جو جمالیاتی اور حسیاتی سطح پر قاری کے نگاہ و دل میں ایک خوشگوار ارتعاش پیدا کرے جس سے کچھ سوچنے اور مختلف انداز میں سوچنے کا عمل انگنت ہو اس کیلئے ضروری ہے کہ الفاظ برتنے والا زبان پر خاصی دسترس رکھتا ہو۔ رفیق راؔز کی شاعری اس مشکل شرط کو بھی پورا کرتی ہے یعنی راؔز مجموعی طور پر نہ صرف اس بات سے واقف ہیں کہ انہیں کیا کہنا چاہیے بلکہ کیسے کہنا چاہیے اور کیوں کہنا چاہیے کے رمز سے بھی واقف ہیں۔

رفیق راؔز کشمیری زبان کے ایک لہجہ ساز شاعر ہیں جنہوں نے کشمیری شاعری میں ایک مختلف انوکھے اور دلکش پیرائیہ اظہار اور بلندی خیال کے باب کا اضافہ کیا۔ ان سے جو شاعر عمر کے لحاظ اور شعر کہنے کے تجربے کے حوالے سے بزرگ ہیں۔ وہ رفیق راؔز کے لب و لہجے کے کہیں آس پاس بھی نہیں۔ ان سے جونئیر شاعران کا تتبع کرنے کی سعی تو کرتے ہیں مگر منہ کے بل گر جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں بھی رفیق راؔز نے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ایک نئے لب و لہجے کا اضافہ کیا۔ شعوری یا غیر شعوری کا حوالہ اس ضمن میں اسلئے غیر ضروری ہے کہ کل حقیقت جو ہاتھ آتی ہے، یہی ہے کہ اردو شاعری میں بھی ان کا لب و لہجہ یکسر مختلف اور روشِ عام سے ہٹ کر ہے۔

میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، رفیق راؔز کا زیر نظر مجموعہ اس کی تصدیق کرتا ہے ان کے یہ چند اشعار میں اپنے عندیئے کی شہادت کے طور پر پیش کرتا ہوں ؎

ہم موسم حیرت کے اجالے نہ ہوئے تھے
یعنی کہ ترے چاہنے والے نہ ہوئے تھے

مایوس نہ ہو غور کرو اور ذرا سا
موجود ہوں تصویرِ بیاباں میں ہوا سا

☆

شعاعوں کی ثنا بھی اس کی خاطر دن نکلتے ہی
ستاروں کی عنایت بھی اسی پر شام ہوتے ہی

☆

ہر شے کہ ترے ہی دم سے قائم ہے
قندیل بھی، رات بھی، مسافر بھی

☆

جلوۂ امکاں کی خوشبو مکاں سے لامکاں تک
حیرتوں کی تابنا کی ہے مرے ظلمت کدے میں

☆

پتے لرز رہے تھے، خطرہ تھا آندھیوں کا
گھر ہو رہے تھے خالی، موسم تھا ہجرتوں کا

☆

مری زمیں کے ستاروں میں روشنی نہ رہے
تری جبیں کے فلک پر وہ مہر و ماہ نہیں

مجھے امید ہے کہ رفیق راؔز کی اردو شاعری کا سنجیدہ نوٹس لیا جائے گا اور انہیں اردو کے معتبر شعرا کی صف میں مناسب جگہ دی جائے گی۔

☆☆☆

☆...... پروفیسر قدوس جاوید

رفیق رازؔ: ہمہ جہت شاعر

شاعری محض موضوع ہے نہ صرف ہیئت بلکہ تحریر کا کون سا لسانی، ثقافتی، فنی یا جمالیاتی پہلو تحریر کو شعر بنا دے گا کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ شاعری آج بھی اگر میکانکی نہیں ہے تو شگاف در شگاف دائرہ در دائرہ ذوق اور وجدان، کیفیت اور احساس کے مرحلوں سے گزر کر سامنے آنے والے ذات،، زندگی اور زمانہ کے جمالیاتی تجربے ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ رفیق رازؔ ہو یا کوئی اور شاعر اس کی شاعری کے شعری اسرار کے طرفوں کو کھولنے اور اس کی شاعری کے اصل "جوہر" اور اس کے معیار تک پہنچنے کیلئے اس کی ثقافت اور ثقافت کی زائیدہ شعری جمالیات ہی معاون ثابت ہوتی ہے ’موضوع یا ہیت نہیں۔ یہاں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ زندہ زبانیں ہوں یا ثقافت یا شعریات‘ اندر سے بند اور جامد نہیں ہوتیں۔ قدیم و جدید کی آویزش و پیکار سے ان میں جذب وانجذاب، تغیر وتبدل اور تعمیر وارتقا کا عمل بھی مسلسل جاری رہتا ہے۔ لیکن چونکہ زندگی، معاشرہ، ثقافت اور علوم وفنون سے متعلق تازہ ترین نظریات ور جحانات کی اثر انگیزی کے باوجود کسی بھی زبان میں نئے نظریات واقدار اور تقاضے بھی اس زبان کے شعروادب کے اندر ہی وجود میں آتے ہیں‘ اس لئے کوئی بھی شاعر خواہ کیسے بھی اجتہادی، لسانی اور شعری رویئے اور حربے کیوں نہ بروئے کار لائے اس کی شاعری سابقہ شعری سرمایہ کے لسانی اور شعری نظام سے بہر حال ایک جدلیاتی رشتہ

ضرور رکھتی ہے۔ چنانچہ "انہار" کے شاعر رفیق رازؔ کی شاعری اپنے توسیعی اور اجتہادی کردار کے ساتھ اردو غزل کے لسانی اور شعری نظام سے رشتہ تو ضرور رکھتی ہے لیکن یہ رشتہ ایک طرف جتنا توثیقی Affirmative ہے' وہیں دوسری طرف تنکیری Oppositional بھی ہے۔ ہاں خاص بات یہ ہے کہ دونوں حالتوں میں رفیق رازؔ کے یہاں کشمیری اور اردو کی شعری جمالیات کے گہرے شعور کے سبب افتراق و اجتہاد کے زرد، سیاہ اور سبز شعری رویوں کو بروئے کار لانے کی تڑپ رفیق رازؔ کی شناخت قائم کرتی نظر آتی ہے۔

یہ رفیق رازؔ کا منفرد شعری رویہ ہی ہے جس کے سبب رفیق رازؔ کی شاعری ہر طرح کے طے شدہ معنیاتی ونظریاتی وحدانیت اور ادعائیت (Dogmatism) کی دیوار کو توڑ کر اس کھلی فضا تک جا پہنچتی ہے جہاں قرأت کے تفاعل، متن کے دیدہ و نادیدہ حوالوں (References) اور انسلاکات اور قاری کی تعبیری صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہو کر تخلیقی تجربہ کیفیت یا احساس کے فطری اور آزاد لعل و گہر دونوں ہاتھوں سے لٹاتی رہتی ہے۔ اب یہ قاری کی صلاحیت وقبولیت (Power of reception) پر منحصر کرتا ہے کہ وہ رفیق رازؔ کی شاعری سے معنی و مفہوم یا کیفیت و تاثر کی کتنی دولت اپنے دامن میں سمیٹ پاتا ہے۔ لیکن ایک بات جو واضح طور پر نظر آتی ہے یہ ہے کہ رفیق رازؔ کی اردو غزلوں کے مجموعے "انہار" کی شاعری جن شعری تجربوں کی روشنی بکھیرتی ہے اس کا پہلا نمایاں پہلو یہ ہے کہ رفیق رازؔ مضمون آفرینی کا نہیں احساس آفرینی کا شاعر ہے۔

رفیق رازؔ کی غزلوں میں حسّی تجربوں کا ایک سیلِ رواں نادر و نایاب تراکیب کی چادر اوڑھے خاموشی کے ساتھ سرحدِ ادراک کی جانب گامزن نظر آتا ہے۔

سرحد ادراک تک ہے خامشی چھائی ہوئی
تجربوں کا اک عجب سیل رواں ہے اور میں

رفیق راؔز کا تخلیقی اور اظہاری رویہ بھی ہم عصر غزل گو شعرا سے قدرے مختلف ہے، ایسا لگتا ہے جیسے رفیق راؔز شعر نہیں کہتے اغراق کے عالم میں درود و اوراد کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اسی لئے رفیق راؔز کی غزلوں کے درمیان سے ٹھوس اور طے شدہ، معلوم اور شور انگیز مضامین اور معانی نہیں بلکہ کہیں سیال اور کہیں دھواں دھواں کیفیات و احساسات حدِ امکان تک پھیلے اور بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ قاری ان کیفیات و احساسات کے ساتھ کبھی تجسس کبھی تشکیک، کہیں مرحلۂ شوق اور کہیں مقامِ حیرت سے گزرتا ہوا اس سرحدِ لامکاں تک جا پہنچتا ہے جو اصلاً حریمِ ذات ہے۔ طلسم خانہ ذات وصفات ہے ؎

حلقۂ ہست و بود میں کیا ہے
دیدۂ تر کی وحشتوں میں اُتر

☆

پھیلی ہوئی ہے چار طرف گردِ مہر و ماہ
روشن ہے میری آتشِ حیرت سے جلوہ گاہ

☆

مظہر امکان میں جلوۂ حیرت بھی ہے
دودِ خموشی میں ہے شعلۂ اسرار بھی

☆

آگ کا دریا بھی ہے عقل بھی ہے عشق بھی
میں ہی تذبذب میں ہوں میں ہی ہوں تیار بھی

واقعہ یہ ہے کہ عقل، عشق، اسرار، تذبذب، حیرت ہست و بود، مظہرِ امکان اور جلوہ گاہ جیسے الفاظ و تراکیب، صوفیانہ شاعری میں رسمیات (Conventions) کا

حکم رکھتے ہیں۔ رفیق رازؔ کی غزلوں میں ایسے سارے الفاظ اور تراکیب علامتی و استعاراتی نظام کے ساتھ اس طرح سامنے آتے ہیں کہ لفظ لفظ صاحب ادراک کے خیالات کی روشن قندیلیں تو نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی رفیق رازؔ کی شاعری روایتی معنوں میں بالاعلان صوفیانہ شاعری نہیں بن پاتی۔ ویسے بھی، غیر روایتی لسانی وشعری برتاؤ کے سبب رفیق رازؔ کے یہاں الفاظ وتراکیب اکہرے اور مانوس مطالب ومعانی سے زیادہ غیر مانوس متغّیر اور نادیدہ کیفیات واحساسات کے امکانات فراہم کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں رفیق رازؔ کی شاعری کو صوفیانہ شاعری قرار دینا اس کی شاعری کی بوقلمونیت اور بے کرانی پر حصار بندی کی تلوار چلانے کے مترادف ہوگا۔ ایسا بھی نہیں کہ رفیق رازؔ نے اس طرح کے اشعار بھی محض برائے شعر گفتن کہے ہوں بلکہ یہ رفیق رازؔ کی افتادِ طبع اور فکری سچ کا نتیجہ ہیں۔ رفیق رازؔ کی غزل کا معشوق دکن یا شمال کا کوئی باشندۂ طرح دار نہیں خود عشقِ مجسم اور حُسنِ کُل رُب العظیم کی ذات ہے اور اس کائنات کے سارے مظاہر تغیرات اور عجائبات اسی معشوقِ حقیقی کی عشوہ طرازیوں کا نتیجہ۔

دن کے محشر میں تو سایہ نور سا ایک صدرنگ نخلِ طلسم صدا
شب کی تاریکیوں میں بھی تو ہر طرف جگمگاتا ہے خاموشیوں کی طرح

رفیق رازؔ کے عاشق صادق ہونے پر کسی کو شُبہ نہیں ہونا چاہیے لیکن رفیق رازؔ کے مذہبی نوعیت کے اشعار کو عام معنوں میں صوفیانہ شاعری کے زمرے میں رکھنا دشوار ہے کیونکہ شیخ علی ہجویری، ابن عربی، امام غزالیؔ اور عبدالرحمٰن جامیؔ سے لے کر علامہ اقبالؔ، سعید احمد اکبر آبادیؔ اور انامریؔ شمل تک سینکڑوں صوفیا اور علماء نے تصوف کی جو تعریفیں بیان کی ہیں، رفیق رازؔ کے اشعار اُن سے بہت زیادہ مطابقت نہیں رکھتے البتہ رفیق رازؔ کے بعض اشعار اسلامی نظریہ جمال کی رو سے " تخلیق الحق" یا" تخلقوا باخلاق اللہ" تقاضوں کو ضرور پورا کرتے ہیں۔

یہ آسماں ، یہ چاند ستارے، یہ آفتاب
آثار ہی تو ہیں ترے نام و نمود کے

☆

تمہارے نور سے لبریز ہیں یہ ارض وسما
میں اعتراف نہ کرلوں تو زیادتی ہوگی

☆

اب بھی کتاب فن میں سسکتی ہے گم رہی
اب بھی گرفت لفظ سے آزاد ہے خدا

☆

دل پہ نقش "یا باقی" اور نگاہ میں روشن
سرِ سورہ الرحمٰن کُل من علیہا فان

دراصل رفیق راز کے فکری وتخلیقی بہاؤ میں ایک فطری پاکیزگی ہے جس کے سبب ان کی غزلوں میں، غزل کی روایت کے برعکس، لذتیت، لایعنیت اور گمراہ کُن جذباتیت سے پاک ایک باوقار شعری فضا ملتی ہے۔لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رفیق راز کے شعری تجربے اپنے آس پاس کی زندگی کے نشیب وفراز سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی شاعر کیوں نہ ہو ہزار کوششوں کے باوجود اپنے سماجی وثقافتی حالات وواقعات کے دائروں سے باہر رہ کر اپنی کیفیات وتجربات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ فنکار کی شعوری اور لاشعوری سرگرمیوں کی جڑیں بہر حال معاشرے اور ثقافت میں ہی پیوست ہوتی ہیں۔ساختیاتی دانشور جولیا کریسٹوا نے اپنی تصنیف The Desire of Language میں انسانی ذہن کے ان رویوں سے بحث کی ہے جو کسی متن، لفظ یا نظام کے معنی ومفہوم کی تشکیل یا ردتشکیل کا سبب

ہوتے ہیں۔اس ضمن میں جولیا کریسٹوا نے لاشعور کی کارکردگی سے متعلق فرائیڈ کے بیان کردہ مرحلوں Displacemen اور Condensation کے درمیان ایک تیسرے مرحلے کی نشاندہی کی ہے جسے اس نے Passage کا نام دیا ہے۔ یہ Passage ہی ہر طرح کے مذہبی، لسانی، سماجی اور ثقافتی رشتوں اور سرگرمیوں کی آماجگاہ اور محرک ہوتا ہے۔اور یہی Passage الگ الگ موقعوں پر تخلیقی فنکار کو کبھی مذہبی، کبھی سماجی اور کبھی ثقافتی سرگرمیوں سے متعلق اپنے تخلیقی رویوں کے اظہار کیلئے آمادہ کرتا ہے۔ اب یہ فنکار کی فنی بصیرت اور جمالیاتی شعور پر منحصر کرتا ہے کہ وہ اپنے رویوں کا اظہار کس معیار سے کرتا ہے۔ رفیق رازؔ کا Socio Cultural Passage بھی کشمیر کے موجودہ منظرنامے کے حوالے سے اوّل تو ان سے اس طرح کے عمومی رویوں کا اظہار کرواتا ہے۔

پتے لرز رہے تھے خطرہ تھا آندھیوں کا
گھر ہو رہے تھے خالی موسم تھا ہجرتوں کا

لیکن رفیق رازؔ کے اس طرح کے اشعار میں الفاظ راست انداز اور طے شدہ معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان میں واقعیت پیدا ہوگئی ہے۔ جبکہ غزل بنیادی طور پر بالواسط اظہار کا فن ہے جس میں واقعیت کی گنجائش نہیں البتہ غزل خارجی زندگی کے واقعات کو اشاراتی و استعاراتی پیرائے میں ضرور برت سکتی ہے۔ یوں بھی غزل میں شعریت محض الفاظ کے استعمال سے نہیں بلکہ الفاظ کے تخلیقی و لسانی برتاؤ سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ رفیق رازؔ کے یہاں بھی خارجی حقائق جب غیر واقعی داخلی واردات و کیفیات کے سانچے میں ڈھل کر نادر تشبیہ و استعارہ اور تراکیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں تو ایسے اشعار رفیق رازؔ کی فنی مہارت اور شاعرانہ انفرادیت کی دلیل بن جاتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے۔

لت پت ہیں خاک وخون میں اشجار یا اخی
بے سائیگی کا گرم ہے بازار یا اخی

☆

فصیل شہر کے اندر ہے پیاس کا دریا
فصیل شہر کے باہر سراب رکھا ہے

☆

زہریلی آندھیوں کے عجب ساز بج اُٹھے
گرتے ہوئے مکان بھی نغمہ سرا ہوئے

☆

عجیب لوگ تھے منزل کی بات کرتے تھے
چمکتی آنکھوں میں عکس غبارِ دشت لئے

☆

اسی لٹی بستی میں اب بھی کچھ نہ کچھ باقی تو ہے
پیڑ کے سائے ہواؤں کے نقوش پا چراغ

انہار میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن کے سبب غزل کی رمزیت، برجستگی اور معنیاتی امکانات کی نئی جہتیں سامنے آتی ہیں۔ رفیق راؔز اپنے ہم عصر غزل گو شعرا میں غالباً سب سے زیادہ زرخیز اختراعی ذہن رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ لگانے کیلئے وہ اشعار دیکھئے جن میں اسی طرح کی نادر و نایاب تراکیب کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً طوفانِ بے صدا، لالۂ حیران، موسمِ امکاں، آہنگِ خامشی، سرحدِ ادراک، سایۂ وحشت، ریگ زارِ شب، خوشبوئے خموشی، خاکِ نفی، دشتِ گمان زرد، دریائے ریگِ سبز، فصل وہم وگماں، صدرنگِ دوپہر، چراغ دان جسم اور سرابِ فکر وغیرہ۔

اگر گہرائی سے جائزہ لیں تو ان تراکیب کو رفیق رازؔ کی بوطیقا کی کلید بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ رفیق رازؔ الفاظ و تراکیب کو Conventional اور Referential معنی و مفہوم میں روایتی رویوں کے ساتھ نہیں برتتے بلکہ انہیں غیر رسمی اور تہہ دار معنوں میں کمال فنی بصیرت اور جمالیاتی شعور کے ساتھ برتتے ہیں۔ یہ اسی شعری رویے کا نتیجہ ہے کہ رفیق رازؔ کے شعر سے معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر کی جن صورتوں کا اخراج ہوتا ہے ان کی بنا پر قاری پہلے تو رفیق رازؔ کے شعری تجربے میں شریک ہوتا ہے اور پھر اپنے ذوق، خواہش مطالعہ اور حافظہ اور انسلاکات کے مطابق شعر کے اصل جوہر یعنی تخلیقی تجربہ کو قبول کرتا ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی۔ رفیق رازؔ کی غزلیں لسانی اور عروضی، موضوعی اور جمالیاتی اعتبار سے تجرباتی جہتیں بھی رکھتی ہیں اور غزل کے حوالے سے کئی سوالات قائم کرتی ہیں۔ مثلاً اردو غزل کی حالیہ ساخت، غزل کی قرأت کے تفاعل میں قاری کی شرکت کے امکانات، غزل میں معاشرتی سیاسی اور ثقافتی حوالوں کی اہمیت' آج کی غزل کا لسانی اور شعری نظام اور اردو زبان اور شاعری کے امکانات کی توسیع میں غزل کا کردار وغیرہ۔

آخر میں ایک اہم سوال جس کی جانب حامدی کاشمیری اور شمس الرحمٰن فاروقی نے (انہار) کے فلیپ پر اور حکیم منظورؔ نے دیباچے میں اشارے تو کئے ہیں لیکن قطعی رائے دینے سے گریز کیا ہے یعنی یہ کہ (انہار) کے حوالے سے رفیق رازؔ کس قماش کے شاعر قرار پاتے ہیں۔ روایت پسند، ترقی پسند، جدید یا مابعد جدید؟ میں نے مضمون کے آغاز میں ہی کہا ہے کہ ہر ایک حالیہ ادبی تحریر کسی نہ کسی نہج سے سابقہ ادبی سرمایہ سے ایک جدلیاتی رشتہ ضروری رکھتی ہے۔ چنانچہ انہار کے بعض اشعار میں کلاسکی غزل سے لے کر جدید غزل تک کی ہلکی ہلکی آنچ ملتی ہے۔ لیکن میری رائے میں رفیق رازؔ اصلاً کسی مخصوص خیمے کے شاعر نہیں لیکن فکری، لسانی اور شعری رویوں کے

حوالے سے رفیق رازؔ کی شاعری میں جو نیا ڈسکورس ملتا ہے وہ انہیں مابعد جدید شاعر کے بطور پیش کر رہا ہے۔ یہاں میں یہ یاد دلانا چاہوں گا کہ کلاسیکی یا روایتی شعری جمالیات میں غالبؔ اور میرؔ سے قطع نظر عام طور پر بنیادی اہمیت شعر کی خارجی ہیت، ظاہری معانی کی فن کارانہ تنظیم کو حاصل تھی۔ رفیق رازؔ کے یہاں ایسے ایک آدھ شعر ہی ملتے ہیں مثلاً ؎

شب وصال کی راحت بھی سرسری ہوگی
جگر کے پار شب ہجر کی انی ہوگی

لیکن رفیق رازؔ کے بنیادی فکری رویوں پر نظر رکھیں تو ایسے اشعار روایتی بھی نہیں لگیں گے۔ اسی طرح ترقی پسند شعری جمالیات نہ صرف خارجی ہیت کی پیروی کرتی رہی بلکہ شعر میں نظریہ، مقصد، تعمیر اور تبدیلی کے حوالے سے موضوع کو زیادہ اہمیت دیتی تھی۔ رفیق رازؔ کے یہاں ترقی پسند شاعری کی لفظیات سے کہیں کہیں استفادہ کا رجحان تو ملتا ہے لیکن کوشش کے باوجود ایک آدھ شعر بھی ایسا نہیں ملتا ہے جس سے ترقی پسندی کی بو آتی ہو۔ اس کے برعکس جدیدیت کا رویہ داخلیت پر زور دینے کا تھا۔ جدیدیت نہ صرف ہیت و موضوع کی شرائط کی نفی کرتی ہے بلکہ اپنے ترقی پسند مخالف رویہ کی بنا پر شعوری طور پر خارجیت کی جگہ داخلیت، اجتماعیت کی جگہ انفرادیت، مقصدیت کی جگہ، لایعنیت اور تعمیریت کی جگہ یاسیت وغیرہ کے عناصر سے اپنے شعری جمالیات کی تشکیل کرتی ہے، البتہ جدیدیت نے شاعری میں تخلیقی زبان کے استعمال پر زور دے کر شاعری کو فی الواقعہ شاعری بنانے کی جو کوشش کی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ رفیق رازؔ کے یہاں تخلیقی زبان کے حوالے سے جدّت پسندی کے کئی رنگ ملتے ہیں لیکن لایعنیت اور یاسیت کے مضامین کو فیشن کی طرح باندھنے کا رجحان کہیں کہیں ہی سامنے آیا ہے۔ مثلاً

اس شہر میں بھی عمر کا ایک حصہ گزارا
اس شہر میں بھی کوئی بھی نکلا نہ شناسا
تنہا وہ مسافر کہ تھکن سے تھا بہت چور
دیتا تھا کسے پیڑ کے سائے میں دلاسا

شہر،سایہ، پیڑ،تنہائی اور سفر کے حوالے سے بے بسی اور مایوسی کی فضا پیدا کرنے والے ایسے چند ایک اشعار انہار میں ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رفیق رازؔ جدیدیت کی شعری جمالیات کے اندر کے شاعر ہیں۔لیکن رفیق رازؔ کے یہاں ایسے زیادہ اشعار ملتے ہیں جو جدیدیت کے معلوم رجحانات تنہائی، یاسیت، بے یقینی، اجنبیت وغیرہ شقوں کی نفی کرتے ہیں اور جو ثابت کرتے ہیں کہ رفیق رازؔ جدید شاعر نہیں ہیں۔۔ایسا اس لیے ہے کہ رفیق رازؔ اپنے تمام تر لسانی اور شعری رویوں کے ساتھ ساتھ مابعد جدید ثقافتی صورت حال کے حصار میں ہیں اور مابعد جدیدیت، ہیت اور موضوع کی نفی تو نہیں کرتی لیکن ہیت اور موضوع کو قطعی اور مستقل نہیں مانتی۔ نئ بدلتی ہوئی، ثقافتی صورت حال میں زندگی کو یکسر Problematic مانتے ہوئے مابعد جدیدیت معنی کی وحدانیت کی جگہ تکثیریت اور ادعائیت کی جگہ آزادہ روی پر اصرار کرتی ہے اور کسی طرح کے مسلمات،مفروضات، نظام اور نظریہ اور مہا بیانیہ کو کلی و حتمی نہیں مانتی اور ان کے متبادل کی گنجائش رکھتی ہے۔مابعد جدیدیت اسی بنا پر تخلیقی آزادی،خودروی اور طبعی آمد پر زور دیتی ہے۔چنانچہ مابعد جدید شعری جمالیات کی رُو سے اب شاعری میں اہمیت، ہئیت اور موضوع سے زیادہ اس بنیادی جوہر یا تخلیقی تجربہ کی ہے جو شعر میں فنی،فکری اور جمالیاتی انفرادیت پیدا کرتا ہے۔رفیق رازؔ کے ان اشعار کو دیکھیں:

بجھتے رنگوں کا دھواں یہ جو مری آنکھ میں ہے
تو خدا ہے تو اسے موسمِ امکاں کر دے

کچھ بھی نہیں ہے اب یہاں ناممکنات میں
اس شہرِ نامراد میں ایسا ہوا بھی ہے

☆

خوابوں سے ہم آنکھوں میں اجالا نہیں کرتے
بے چین ستارے کبھی سویا نہیں کرتے

☆

مثل گل سرسبز مہکتے ہیں شب و روز
ہم واقفِ اسرار ہیں سوچا نہیں کرتے

☆

پھیلی ہوئی ہے چار طرف گردِ مہر و ماہ
روشن ہے میری آتشِ حیرت سے جلوہ گاہ

☆

تابشِ افکار سے دہشت وہ مچی ہے
رنگ ہر اک لفظ کے چہرے کا اُڑا ہے

☆

تیرگی یاس کے موسم میں بھی تونے
مصحفِ امکاں کا دیباچہ لکھا ہے

اس طرح کے اشعار کی روشنی میں اگر رفیق رازؔ کو آج مابعد جدید شاعر کہا جائے تو غلط تو نہ ہوگا لیکن بہتر یہی ہوگا کہ رفیق رازؔ جیسے Genuine اور امکانات سے پُر شاعروں کو ہر طرح کے خیمہ اور لیبل سے آزاد ہی رہنے دیا جائے۔ ویسے یہ تو (انہارکا) مطالعہ کرنے والا ہر شخص مانے گا کہ رفیق رازؔ نادر و نایاب لہجوں کا شاعر ہے

رنگوں کا شاعر ہے' وہی تصورات کا شاعر ہے' دھنک رنگ احساسات کا شاعر ہے جو
خود اپنی ایک منفرد شعری جمالیات رکھتا ہے۔ رفیق راز کی ہی زبان میں ؎

تیری خلاق طبیعت کے پرستار ہیں ہم
برف کے پھول سرابوں میں کھلائے جانا

☆☆☆

☆......ڈاکٹر نذیر آزاد

رفیق رازؔ ......طلسمات کے در کھولنے والا شاعر

رفیق رازؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے تنقید نگاروں نے اگر چہ سیر حاصل بحث کی ہے، لیکن ان کی آرا سے متضاد اور متخالف نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ان آرا کو دیکھ کر کئی سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ مثلاً کیا رفیق رازؔ کے الفاظ و علائم اُن کی متصوفانہ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں یا ان سے کشمیر کے مخصوص حالات کی عکاسی ہوتی ہے؟ کیا رفیق رازؔ کو اس لئے جدید لب و لہجے کا شاعر کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تنہائی، خوف، بے چہرگی اور لایعنیت جیسے موضوعات کو برتا ہے اور کیا وہ اِس لئے جدید شعراء میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے ان مضامین اور علائم کو فیشن کے طور پر نہیں برتا ہے؟ اس سے ایک اور ذیلی سوال برآمد ہوتا ہے کہ ہم کیسے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں لفظ کو فلاں متن میں فیشن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور فلاں متن میں تخلیق کے طور پر۔ یعنی جدید ادب میں فیشن اور تخلیقی عمل کے مغائر کیا ہیں؟ کیا رفیق رازؔ کی تعین قدر کے لئے اِس بات کو مدنظر رکھا جانا ضروری ہے کہ انہوں نے معاشرتی موضوعات کو منہ نہیں لگایا ہے اور ساتھ ہی اُن کی شاعری میں عصری آشوب کی آگہی نظر آتی ہے؟ کیا یہ صرف رفیق رازؔ کا امتیاز ہے کہ اُن کے یہاں روایت اور جدت گلے ملتی نظر آتی ہے؟ کیا رفیق رازؔ کے الفاظ و علائم یک سطحی ہیں یا ہمہ سطحی؟ اور کیا وہ معنی آفرینی کے شاعر ہیں یا احساس آفرینی کے؟

رفیق رازؔ کی شاعری پر بات کرنے سے پہلے اُن الفاظ وتراکیب کی طرف توجہ دینا ضروری ہے جن کی بنیاد پر فاضل تنقید نگاروں نے اُن کی شاعری کو مخصوص خانوں میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ غبار، خموشی، جنگل، سیاہ، پیاس، سکوت وغیرہ صرف رفیق رازؔ کے ہی نہیں بلکہ اکثر جدید شعراء کے مرغوب استعارے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض جدید شعراء نے شہر، جنگل، دھوپ، سمندر، گھر، مکان، خواب جیسے استعاروں کو ایک علامتی نظام میں پرویا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ ہر زمانے میں بعض الفاظ استعاروں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور ہر زمانے میں بعض توانا شاعران کو علامت کا درجہ دیتے ہیں۔ شمع، پروانہ، گل، بلبل ایرانی علامتیں تھیں جن کو ہمارے کلاسیکی شعراء نے ان کے انسلاکات سمیت اپنی شاعری میں استعمال کیا۔ ترقی پسندوں نے صلیب، دار، رسن اور انقلاب وغیرہ کو خوب کام میں لایا اور جدید شعراء نے گھر، کیمرہ، کھڑکیاں، دریا وغیرہ کو بھی علامتی اظہار کے لئے استعمال کیا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ رفیق رازؔ نے بھی اپنے ہم عصر شعرا کی طرح ان الفاظ وعلائم کو تخلیقی اظہار کے لئے کام میں لایا اور محض ان کا استعمال انہیں کسی بھی لحاظ سے ممتاز بنانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بعض شعراء نے نئے استعاروں اور نئی علامتوں کی تشکیل کی بجائے پرانی علامتوں کو ہی استعمال کیا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے زمانے کے نمائندہ شعرا تسلیم کئے گئے۔ مثلاً فیضؔ نے گلشن، صبا، زندان وغیرہ علامتیں کام میں لائیں یا ناصرؔ کاظمی نے گل، دھوپ وغیرہ کو استعمال کیا۔ اِس بات سے قطع نظر کہ ان شعراء نے ان الفاظ میں معنی کی توسیع کی یا الفاظ میں بذات خود معنی کے امکانات موجود ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ فیض، ناصر کاظمی، منیر نیازی، زیب غوری وغیرہ کا اس سلسلے میں کس طرح امتیاز ہے۔ دراصل ان شعراء نے ان پامال استعاروں کے

ساتھ نئے تلازمے رکھ کر انہیں نئی علامتوں کے طور پر پیش کیا۔ مثلاً دل، رخسار، ہاتھ، تنہائی، سایہ مستعمل استعارے ہیں لیکن فیض نے غالبؔ کے تتبع میں ان الفاظ سے تجرید و تجسیم کا کام لے کر ایک نئی اور نادیدہ و ناشنیدہ دنیا خلق کی ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ پھر تنہائی کا دشت وجود میں آتا ہے، جس میں آواز کے سائے لرزاں ہیں اور دِل کا رخسار متشکل ہوتا ہے جس پر یاد اپنا ہاتھ رکھتی ہے۔ اسی طرح خیمۂ گل تعمیر ہوتا ہے جس کی طنابیں کسی جاتی ہیں تا کہ اُفق سے آنے والی آندھی سے بچا جا سکے۔ اندھیری شام کا پردہ خلق ہوتا ہے جس میں چھپ کر چشمے کی روانی روتی ہے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تجسیم سے شعر میں غیر قطعیت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح معنوی امکانات بھی فزوں ہوتے ہیں اور کیفیت بھی شدید ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں تخیل اشیاء کی یا قلب ماہیت کرتا ہے یا ان کو تحلیل کرتا ہے۔ اِس طرح نئے مرکب اور آمیزے تیار ہوتے ہیں۔ اِس ضمن میں کولرج نے لٹریریا بیوگرافیا میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ بعض نقادوں نے اِس عمل کو خواب کی سی کیفیت سے گزرتے ہوئے جذبے کو ہیولے کی شکل میں پیش کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے امیجزم والی امیج کی تعریف میں بیان کیا ہے، جہاں انہوں نے مشتاق قمر کے اِس دعوے سے اختلاف کیا ہے کہ یہ تعریف پیکر پر صادق آتی ہے) بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ تجسیم و تجرید کو خواب کی سی کیفیت یا کولرج کے مطابق ''فرد میں نوع اور عام میں خاص کے نیم روشن نفوض'' (بحوالہ فاروقی۔ شعر، غیر شعر، نثر ۱۱۵) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ رفیق رازؔ کی شاعری میں مستعمل استعاروں کی مدد سے تجسیم و تجرید کا عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتا ہے، اس پر بات کرنے سے قبل فیضؔ کے اِس اقتباس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

''اُس زمانے میں مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی، جیسے یکا یک آسمان کا رنگ بدل گیا، بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں، دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا اُس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دُنیا ایک طرح کی پردۂ تصویر کے قسم کی چیز محسوس ہونے لگی تھی''

پروفیسر امین مغل کے مطابق شاعر کے ہاں یہ کیفیت عام ہوتی ہے اور اِسے انہوں نے مِتھ سازی کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ پروفیسر مغل کا یہ کہنا:

''واردات ایک ہلچل مچاتی ہے اور یہ واردات محسوس شکل میں آنے کے لئے بے قرار ہوتی ہے۔ احساسات محسوسات کا روپ دھارنا شروع کرتے ہیں اور ہمارے سامنے ایک دُنیا آباد ہو جاتی ہے، لیکن یہ غیر مادی دنیا ہے، اس لحاظ سے کہ یہ نفسیاتی دنیا ہے''

(''فیضؔ کی شاعری ۔ ۔ چند تاثرات''، مشمولہ مطالعۂ فیض یورپ میں ؛ ص : ۱۳۷)

یہ اپنی جگہ پر صحیح ہے، لیکن یہ صرف کسی واردات کے نتیجے میں ظاہر نہیں ہوتا ہے بلکہ شاعری کی خصوصیت ہے کہ یہ واردات کی ترسیل کرے۔ یہ مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی کو بھی جنم دیتی ہے اور اس میں معنی کی تشکیل کے ساتھ ساتھ نئے مناظر کی تعمیر بھی کرتی ہے۔ اِس بات کو فرائڈ کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ خواب میں ایسے عناصر کے مل جانے سے نئی وحدتیں بنتی ہیں جن کو ہم جاگنے کی حالت میں الگ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہی وحدتیں غالب کے یہاں دشت امکاں بناتی ہیں جس پر تمنا کو سفر کرانے کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے لیکن امکانات کا وسیع دشت تمنا کے مقابلے میں نقش پا کے برابر ہے۔ان ہی وحدتوں کو غالبؔ نے گنجینہ معنی کا طلسم کہا ہے۔ تجسیم و تجرید کے اس تناظر میں دیکھتے ہیں کہ رفیق رازؔ متضاد اور موافق عناصر سے نئی وحدتوں کا کوئی طلسم خانہ متشکل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں جس کی طرف کشمیری

زبان کے سر برآوردشاعر رحمٰن راہیؔ نے اشارہ کیا ہے :

رفیق راز چھُ مۄژران طلسم خانن بر
سرور خوان چھےٚ سورملی نظر تہٕ خاموشی

’’رفیق رازؔ طلسم خانوں کے دروازے کھولتا ہے (جس کی بنا پر) سرمگیں نظر اور خاموشی سرور خواں ہے‘‘

آوارہ سیہ دشت میں تصویر صدا ہے
سوکھے ہوئے خوابوں کا شجر نغمہ سرا ہے

☆

اک خموشی کہ مہکتی ہے مرے کمرے میں
ایک آواز کہ ہے نقش بہ دیوار سیہ

☆

کرۂ شب کے طلسمات کے جنگل میں پڑا
شعلۂ لمس کی خوشبو میں نہائے جا

☆

خزاں رسیدہ ہر اِک صفحۂ قرار پہ اِک دن
سنہری یار کے جھونکوں نے سبز خواب لکھا

☆

تو نہیں تیرا تصور ٹمٹماتا ہے ابھی تک
ریگ رازِ شب میں جیسے بوند کوئی روشنی کی

☆

بوسۂ برق لمس دودِ فنا
صبح تک کیا سے کیا ہوا شعلہ

درج بالا اشعار رفیق رازؔ کے کلام سے جہاں تہاں نقل کئے گئے ہیں ورنہ ان اشعار سے اُن کا پورا کلام (خصوصاً شعری مجموعہ ''انہار'') صحیح معنوں میں ایک طلسم خانے کا منظر پیش کرتا ہے۔اس سلسلے میں قدوس جاوید کا کہنا بجا ہے :

''قاری ان کیفیات واحساسات کے ساتھ کبھی تجسس، کبھی تشکیک، کہیں شوق اور کہیں مقام حیرت سے گزرتا ہوا اُس سرحد لامکاں تک پہنچتا ہے جو اصلاً حریم ذات ہے، طلسم خانۂ ذات وصفات ہے''۔

(رفیق راز کی غزل،مشمولہ رفیق راز،مرتبہ : ریحانہ اختر ؛ ص :۴۱)

رفیق رازؔ نے ایسے اشعار میں متضاد اور موافق (اکثر اوقات متضاد) عناصر آمیز کر کے ایسی نئی وحدتیں تعمیر کی ہیں جو کہ بجا طور پر متھ کا درجہ رکھتی ہیں۔تجسیم در تجرید اور تجرید در تجسیم کے ایسے سلسلے جو کہ مادی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتے ہیں بلکہ اُن کا وجود شاعر یا قاری کی "Imagination" میں ہی ممکن ہے۔ایسی امیجری نہ مقصدیت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی تحریک یا رجحان کی پروردہ۔ اس کی بوقلمونی انسانی ذہن اور تخیل کی طرح پیچیدہ ہے اور اس کے سرچشمے انسانی سائیکی میں متحرک اور فعال ہیں۔اس کو نہ ہی کسی سیاسی چوکھٹے میں رکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے صوفیانہ یا معاشرتی خیالات کا اظہار کہا جاسکتا ہے۔حدتو یہ ہے کہ ایسی امیجری میں معنی کی تلاش بھی بسا اوقات سعیٔ لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔انسانی سائیکی اور لاشعور کے ایسے طلسم خانے بقول ژال موریا مقصدیت، تعلیم، خطابت، معروضی بیان اور غلط Sensibility کے دشمن ہیں۔ان کا مدعا یہ ہے کہ خیال کی صیدگاہ میں رہا جائے اور خارج کی مثالوں سے اندرونِ ذات کے پردے چاک کئے جائیں۔

رفیق رازؔ کے درج بالا اشعار غیر مرئی اشیاء کی تجسیم کر کے قاری کو اپنے ساتھ لے کر نادیدہ جہانوں کی سیر کراتے ہیں۔دشت کو سیاہ رنگ دے کر اس میں صدا

کی تصویر کو (نہ کہ صدا کو) آوارہ پھرایا گیا۔خواب کو شجر بنا کر اُن سے نغمے گوائے گئے۔شب کو زمین کا کرۂ فرض کیا گیا اور اس میں ایک جگہ پر جنگل مخصوص کیا گیا جہاں پر لمس کا شعلہ ہے جس سے خوشبو آتی ہے اور اس خوشبو میں نہائے جانا ہے۔ایک عجیب طلسماتی فضا خلق کی گئی ہے۔

ایسی صورت حال رفیق رازؔ کے کلام میں قدم قدم پر فکر ونظر کے لئے سوال کھڑا کر دیتی ہے۔اب اگر ان اشعار میں موضوع یا معنی کی تلاش کی جائے تو ہمیں لامحالہ یا تو صوفیانہ فکر ملے گی یا اردگرد کے حالات کی عکاسی ہاتھ آئے گی۔اگر ہم ان اشعار کو جدید عینک سے دیکھیں تو ان میں انسان کی بے بسی اور تنہائی کے ساتھ سامنا ہوگا۔اگر کچھ اور دور جا پائیں تو ہمیں لفظ ''لمس'' کی بدولت جنسی نفسیات کی تعبیر ملے گی۔لیکن ایک بات طے ہے کہ قاری یا نقاد اپنی ذہنی،نفسیاتی،معاشرتی،معاشی یا ادبی وابستگی کی عینک لگا کر کوئی بھی تعبیر کر کے معنی نکال سکتا ہے لیکن جو چیز باقی بچ جائے گی وہی شاعری ہوگی جہاں تک موضوع یا مضمون کی رسائی ناممکن ہے۔

دراصل ایسے اشعار میں سیال تخیل کی کارفرمائی جس کو بعض نقاد متھ سازی قرار دیتے ہیں اور بعض اسے جمال پسندی سے تعبیر کرتے ہیں، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے خواب ناک ہیولے پیکروں کی شکل میں قاری کے حواس کو نہ صرف بیدار کرتے ہیں بلکہ انہیں اپنی گرفت میں لینے پر بھی قادر ہیں مثلاً ؎

بوسۂ برق لمس دودِ فنا
صبح تک کیا سے کیا ہوا شعلہ

بوسہ اگرچہ لمسی پیکر ہے لیکن اس میں موجود ہلکی سی آواز نے اسے سمعی بھی بنا دیا ہے۔اِسی طرح برق بصری پیکر ہے لیکن جلانے کے عمل نے اِسے لمسی بھی بنا دیا ہے۔ساتھ ہی اس کے کڑکنے سے یہ حرکی "Kinetic" پیکر کا درجہ بھی رکھتا ہے۔دود

شامی پیکر ہے اور ساتھ ہی دھویں کے نظر آنے نے اس کی بصری حیثیت بھی مستحکم کی ہے۔ اِسی طرح شعلہ بصری ہونے کے ایزا دلمسی اور شامی پیکر بھی ہے۔ گویا کہ اس مختصر شعر میں ایک طرف کولرج کی نیم روشنی کا نفوذ بھی ہوتا ہے اور یہ بیک وقت چار حواس کو برانگیخت بھی کرتا ہے اور انہیں تحریک بھی دیتا ہے۔ دوسرے مصرعے کی استفہامی حیثیت نے کسی مخصوص معنی کو ہاتھ آنے کا موقع ختم کیا ہے ؎

بس کہ اِک گنجینۂ اسرار خاموشی ہے اس کی
روشنی سے تر ادھوری بات پورے آدمی کی

گنجینہ بصری پیکر ہے لیکن ساتھ ہی یہ سماعت کو بھی بیدار کرتا ہے کیونکہ خزانے میں سیم وزر کی کھنکھناہٹ آواز کا سماں پیدا کرتی ہے۔ بات سمعی پیکر تو ہے لیکن ساتھ میں خاموشی نے شعر میں سمعی فضا کو اور بھی مستحکم کیا ہے۔ روشنی بصری پیکر ہونے کے ساتھ لمسی پیکر بھی ہے کیونکہ روشنی میں حرارت بھی ہے اور جلن بھی ہوسکتی ہے۔ گنجینۂ اسرار خاموشی اور روشنی سے تر ادھوری بات کے آپس میں انسلاکات ہونے کی وجہ سے شعر کی طلسماتی فضا مستحکم ہوگئی ہے اور نتیجے کے طور پر حواس کو گرفت میں لانے کے باوجود معنی گنجینۂ اسرار میں ہے تو منظر جلوہ دکھا کر اوجھل ہوجاتا ہے۔

رفیق رازؔ نے پیکر تراشی کا جو عمل ''انہار'' کی ابتدائی غزلوں سے شروع کیا ہے وہ اُسے ''مشراق'' کے آخری صفحات تک نبھانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس عمل میں انہوں نے لاجواب ترکیب سازی کا سہارا لیا ہے۔ انہوں نے روایتی دو لفظی ترکیبیں مثلاً چشم حسود، نگاہ ناز یا سپہر کبود وغیرہ استعمال کی ہیں لیکن ان کی شاعری کے طلسم خانوں کو سجانے کے لئے ان ترکیبوں نے زیادہ دیر تک اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ نتیجے کے طور پر رازؔ نے زیادہ تر سہ لفظی ترکیبیں استعمال کی اور بعض اوقات چہار لفظی ترکیبیں بھی اُن کے ہاتھ آنے لگیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اضافت دراضافت جتنی

طویل ہوگی اُتنا ہی تجسیم کا عمل گہرا ہوگا اور نتیجے کے طور پر متضاد عناصر کے ایک وحدت کی تعمیر کے لئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ان شعروں میں سہ لفظی ترکیبیں:

عشق جنوں گیر کی ظلمت بھی تھی
روشنیٔ آتشِ وحشت بھی تھی

☆

خود تو وہ نذرِ موجۂ طوفاں ہوا مگر
پانی پہ ایک نقشِ کہن کو بچالیا

☆

دھوپ کو دیکھ کے شاداب خیالی نے مری
شاخِ سرسبز سرِ دشتِ ہنر دی ہے مجھے

اب یہ چہار لفظی ترکیبیں ملاحظہ کیجئے:

ہم خاکِ کفِ پائے نگاراں تھے بصد شوق
ان تیز ہواؤں کے حوالے نہ ہوئے تھے

☆

ظلمت گزیدہ نخلِ صدا ہی کی چھاؤں میں
پھوٹا ہوا تھا چشمۂ انوار یا اخی

یہ پانچ لفظی ترکیب بھی دیکھئے:

داستاں میری کہ ہے آواز اور خوشبو تمام
نذرِ خاک و آتش و آب و ہوا ہونے کو ہے

آخری دو اشعار پر غور فرمائیں۔ صدا کو نخل فرض کیا گیا ہے۔ اس کی چھاؤں کو ظلمت گزیدہ کہہ کر سایے کی شدت اور تیزی کی گئی ہے۔ اسی سیاہی کی تقلیب کی گئی اور

نور پھوٹا اور نور کی تجسیم کر کے اسے چشمہ بنایا گیا، یا دوسرے شعر میں عناصر اربعہ کے انسلاکات اور آواز اور خوشبو کے تلازمے سے سمعی (آواز) شامی (خوشبو) بصری، لمسی (خاک)، بصری، لمسی (آتش)، مذوقی (آب) اور لمسی، شامی (ہوا) پیکروں کا آپسی ادغام کر کے پانچوں حواس کو انگیخت کیا گیا ہے۔

چنانچہ تجسیم کاری، تجریدیت، پیکر تراشی اور ترکیب سازی اچھی شاعری کی خصوصیات ہیں لیکن فقط ان چیزوں کو ہم کسی کا امتیاز نہیں کہہ سکتے ہیں۔ بے ڈھنگ مناظر بنانے سے نہ ہی جمال پسندی وجود میں آسکتی ہے اور نہ اِسے متھ سازی کہا جائے گا۔ چمکیلی تجریدیت تب تک بڑی شاعری کہلانے کی حقدار نہیں ہے جب تک کہ تجرید سازی کے پس پردہ ایک خلاق ذہن نہ ہو۔ پیکر تراشی لاکھ حواس خمسہ کو حرکت دے اور اضافتوں سے کوئی پندرہ پندرہ لفظی ترکیبیں بنائے، بڑی شاعری تو کیا شاعری ہی وجود میں نہیں آسکتی ہے جب تک کہ شعر اپنے سیاق وسباق میں ایک مکمل لسانی اکائی کا درجہ نہ رکھتا ہو اور الفاظ وعلائم ایک دوسرے کے لئے راہ ہموار کرتے ہوئے مربوط اور باہمی طور پر مدغم نہ ہوں۔ ذرا اس تناظر میں دیکھیں کہ رفیق رازؔ کے اشعار کیا معنوی طور پر منسلک ہیں یا نہیں:

مظہرِ امکاں میں جلوۂ حیرت بھی ہے
دودِ خموشی میں ہے شعلۂ اسرار بھی

خموشی کی تجسیم کر کے اِسے دھواں فرض کیا گیا جس میں سے شعلہ نکلتا ہے۔ شعلے کو اسرار کے ساتھ مربوط کیا گیا، جب اسرار کی تجسیم کی گئی یعنی جس طرح دھویں میں شعلہ پوشیدہ ہے اُسی طرح خموشی میں اسرار موجزن ہیں۔ یہ اسرار خالی خولی نہیں ہیں بلکہ یہ امکانات کے نقیب ہیں اور امکانات کے سامنے آنے سے حیرت فزوں ہوتی ہے۔ گویا کہ جو سفر خاموشی سے شروع ہوا، اُس کی انتہا حیرت ہے اور یہ سفر ایک

مربوط انسلاکاتی نظام کے ذریعہ آگے بڑھتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ خموشی، اسرار اور حیرت ایک کے بعد ایک آئیں بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آپس میں متوازی طور آگے بڑھتے جائیں، حالانکہ بظاہر خاموشی اور شعلہ، اسرار اور دھواں اور امکان اور جلوہ کا آپس میں کوئی معنوی ربط نہیں ہے لیکن تجسیم کاری اور استعارے نے ان تضادات کے ذریعے ایک مکمل لسانی اکائی تعمیر کی ہے جو ہیئت، آہنگ اور معنی کے اتصال سے ایک منظر کی تشکیل کرتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ یہ مشاہدہ ''نیم روشنی کے نفوذ میں'' ہے اور خواب کے ہیولے کی طرح پوری طرح گرفت میں نہیں آتا ہے۔
ایک اور شعر دیکھئے:۔

دشتِ گمانِ زرد میں کس نے یہ لکھ دیا
دریائے ریگِ سبز کہ بہتا ہوا بھی ہے

گمان کو پہلے دشت فرض کیا گیا، پھر اس میں زردی پھیلائی گئی جس سے گمان کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس کی ناتوانی (یا اس سے پیدا شدہ ناتوانی) شدید کی گئی۔ اس کے بعد دشتِ گمان میں لکھا گیا کہ سبز ریت کا دریا بہتا ہے حالانکہ دشت میں ریگ کی حیثیت سراب سے کچھ زیادہ نہیں ہے اور دشت گمان میں دریائے ریگ سراب اندر سراب بھی ہوسکتا ہے، لیکن ریگ کو سبز کہہ کر اسے زردی کے مقابل میں لایا گیا ہے اور سیال تخیل نے ریگ سبز کو رواں بھی کر دیا۔ ہر چند کہ نہ ہی ریگِ سبز کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی ایسا کوئی دریا ہے اور نہ ہی کچھ رواں ہے بلکہ یہ کسی نادیدہ ہاتھ نے دشتِ گمان زرد میں لکھ دیا ہے۔ اگر اس کے معنی نکالنے بیٹھیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر میں غیر یقینیت سے یقین کا سفر ہے لیکن رفیق رازؔ نے ایک نیم روشن منظر تعمیر کیا ہے اور ایک پامال مضمون کو ایک حرکی پیکر اور ایک بھرپور استعارہ بنا دیا ہے۔ رازؔ کے پہلے مجموعہ ''انہار'' میں ایسے مناظر جگہ جگہ ملتے ہیں جن میں کئی تجربات کئی ترکیبوں کی

مدد سے کئی پیکروں کو حرکت دیتے ہوئے کئی خواب آلود مناظر تعمیر کرتے ہیں۔ یہ مناظر اپنی جھلک دکھا کر اوجھل ہوتے ہیں اور پھر تھوڑی دور جا کر وقفے وقفے سے اپنی چھب دکھاتے ہیں لیکن پوری طرح سے گرفت میں نہیں آتے ہیں۔ رازؔ نے اس انوکھی امیجری کے لئے اشیاء کی تقلیب بھی کئی جگہوں پر کی ہے۔ چنانچہ غالبؔ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُنہوں نے رفتار کو جمود کے برابر اور صحرا کو مشتِ خاک کے مساوی بنا کر ان کو اُلٹ پلٹ کیا ہے۔ دراصل غالبؔ کے رواں اور پیچیدہ تخیل نے Subversion سے ایک ایسی امیجری خلق کی جو ذہن غالبؔ اور حیاتِ انسان کی طرح متضاد، مربوط اور پیچیدہ ہے۔ رفیق رازؔ نے بھی اس ضمن میں سنت ِ غالبؔ کو نبھانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ طرز اُن کے یہاں زیادہ پھیلی ہوئی نہیں ہے پھر بھی ؎

منظر مرے نہ ہونے کا سراب ہی نہیں
تیری نگاہ ناز سے مہکا ہوا بھی ہے

☆

گل ہے نہ گلستاں ہے نہ لالہ نہ لالہ رو
پھیلی ہوئی ہے کیسی نہ ہونے کی یہ مہک

ان اشعار میں نہ ہونے کو ہی ہونے کا جواز مانا گیا ہے۔ اس طرح انسانی ذات اور کائنات کے رشتے کی بوقلمونی اور پیچیدگی کے اظہار کے لئے ''ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے'' جیسا منظر تعمیر کیا گیا ہے۔

آہنگ خامشی، دشت گمانِ زرد، شہر خواب ناک، سکوتِ موسم حیرت، چراغ سفرِ شوق، تارِ خیال یار، موسم راحت افزا، ظلمت گزیدہ نخل صدا، طلسماتِ کرۂ شب، لمس دودِ فنا اور ایسی ہی بے شمار ترکیبیں رفیق رازؔ کے کلام میں موجود ہیں جن کی بدولت یہی

لگتا ہے کہ وہ طلسم خانوں کے دروازے وا کررہے ہیں۔ دراصل رازؔ نے فارسی اضافتوں کو استعمال میں لاکر ایسے ہیولے تشکیل دئے ہیں۔ان تراکیب میں غیر مرئی اشیاء کی تجسیم کاری متضادات کو استعمال میں لاکر کی گئی ہے۔اس وجہ سے احساساتی ہیولوں میں معنی کی غیر قطعیت پیدا ہوگئی ہے۔گویا کہ پیچیدہ بیان نے نازک خیالی کے لئے راہیں ہموار کی ہیں۔ نتیجے کے طور پر نادیدہ فضاؤں کی تشکیل نے شعر کو توسیع معنی کے بجائے کیفیت سے ہمکنار کیا ہے۔ رفیق رازؔ کے یہ انوکھے اور نادر مناظر الگ الگ لڑیوں میں پروئے جاسکتے ہیں اور انہیں ایک علامتی نظام کے ذریعے مربوط دیکھا جاسکتا ہے۔

رازؔ نے اپنے طلسم خانوں کی تعمیر میں رنگوں کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ مرحوم حکیم منظور کے اس تجزیئے کہ ''رفیق رازؔ سیاہ رنگ کی کلید سے ذات کے طلسم خانے کھول رہے ہیں'' سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ بے شک رازؔ نے سیاہ/ سیہ کو تکرار کے ساتھ استعمال کیا ہے اور سیہ غزلوں کا ایک سلسلہ اُن کے کلام میں موجود ہے لیکن یہ رنگ اُس علامتی نظام کی کلید نہیں بلکہ ایک جزو ہے جس کے ذریعے اُن کا کلام عبارت ہے (اس علامتی نظام پر آگے بات ہوگی)۔ رفیق رازؔ نے اپنے ہم عصر شعراء مثلاً زیب غوری اور ظفر اقبال کی طرح رنگوں کے استعمال سے متنوع مفاہیم پیدا کئے ہیں اور اپنے کلام کے علامتی نظام میں ان رنگوں کو اہم جگہ دی ہے۔

خوفِ خزاں تو ہر موسم میں رہتا ہے سرسبز
ایک ہری آواز پہ اکثر زردی چھائی رہتی

سرخ سنگین ساعتوں میں اُتر
سرد صحرائے نیلگوں میں اُتر

پیلے حرفوں کی نیلی چاپ لئے
بے صدا سرمئی فسوں میں اُتر

☆

دشت گمانِ زرد پہ کس نے یہ لکھ دیا
دریائے ریگِ سبز کہ بہتا ہوا بھی ہے

☆

چشمۂ دودِ سبز میں کل شب
دیر تک ناچتا رہا شعلہ

☆

خزاں رسیدہ ہر اِک صفحۂ قرار پہ اِک دن
سنہری یاد کے جھونکوں نے سبز خواب لکھا تھا

☆

آیا بہم نہ صفحۂ افلاک ہی مجھے
ظاہر ہوئی نہ میرے خیالات کی دھنک

پہلے شعر میں خزاں کی زردی کا استعمال عام روش کے مطابق ہے لیکن زردی کو دوام بخشنے کے لئے سرسبز کا استعمال انتہائی خلاقانہ عمل ہے۔ اس طرح رفیق رازؔ نے تضاد سے استعارے کو شدید تر بنا دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں آواز کی تجسیم ہرے رنگ کے ذریعے کی گئی ہے جس پر زردی چھائی ہوئی ہے، یعنی یہاں بھی

تضاد سے نئی فضا تعمیر کی گئی ہے۔ آواز لفظ نے ابہام پیدا کیا ہے اور نتیجے کے طور پر شعر میں معنوی وسعت کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ سرخ رنگ خوف، تشدد، خطرہ اور مصائب و آلام کی علامت ہے لیکن ساتھ ہی اس کے احتساسی تلازمے بھی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں صحرا کو سبز رنگ کے ذریعے پہلے خوش آئند بنایا گیا ہے لیکن لفظ ''سرد'' جوڑ کر اس میں تضاد کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ پورا شعر ایک خوشنما پینٹنگ ہے جس میں تضادات کے رنگ ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔

تیسرے شعر میں حروف کو پیلا فرض کر کے شاعر پہلے خوف، تشکیک، ناتوانی، بے چہرگی وغیرہ جدید موضوعات کو لے کر آگے بڑھتے ہیں لیکن پہلے حروف میں نیلی چاپ لکھ کر رازؔ نے غیر یقینیت اور یقین یا لایعینیت اور معنوی امکانات کو یکجا کر کے پیچیدہ اور تذبذب والی صورت حال خلق کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں فسوں کو سرمئی کہہ کر نیلی چاپ کا جواز فراہم کیا گیا ہے۔ اِسی طرح حرفوں کی چاپ کے بعد ''بے صدا'' استعمال کر کے تضادات کا ایک وسیع سلسلہ تیار کیا گیا ہے۔ شعر کیا ہے، ایک پراسرار فضا ہے جو کہ پیلے، نیلے اور سرمئی رنگوں کی آمیزش سے تشکیل شدہ ہے۔ یہی صورت حال باقی شعروں میں بھی برقرار ہے۔ ان میں غیر قطعیت بھی ہے، ابہام کی معنوی رنگارنگی بھی ہے اور تضادات کا حُسن بھی۔ یہاں پر چھٹے اور ساتویں شعر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ چھٹے شعر میں خزاں کی زردی، یاد کے سنہرے پن اور خواب کی خوش آئند سبز رنگت کے ساتھ لفظ ''صفحہ'' استعمال کر کے سفید رنگ کا بھی قرینہ رکھا گیا ہے۔ یہ انسانی ذہن و دل کی بھی علامت ہو سکتی ہے جس پر مایوسی کی زردی، ناسٹیلجیا کا سنہرا پن اور خوابوں کی سبزی رقم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ساتویں شعر میں لفظ ''دھنک'' استعمال کر کے بہت سے علائم کو یکجا کیا گیا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ رفیق رازؔ الفاظ سے تصویر کشی کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

رنگوں کے ذریعے انہوں نے غیر مرئی اشیاء کی تجسیم بھی کی ہے اور احساسات کے تضاد کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ رازؔ کے یہاں سیاہ/ سیہ کی تکرار شدت سے محسوس ہوتی ہے، لیکن سیاہی کو اُن کے طلسم خانوں کی کلید قرار دینا شاید اُن کے علامتی نظام کے ساتھ نا انصافی ہوگی۔ چنانچہ علامت کی شرائط میں کسی لفظ کی تکرار اہم ہے لیکن کسی لفظ کی محض تکرار اسے علامت بنانے کے لئے نا کافی ہوگی۔ تنقید نگاروں کے مطابق تکرار لاشعور کے نہاں خانوں میں کسی جذبے یا احساس کی بازگشت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ کہنا بجا ہے کہ ۔ ۔

''ہم کسی نظم میں لفظ ''سمندر'' پچاس بار لکھیں اور دعویٰ کریں کہ چونکہ سمندر ہمارا مخصوص لاشعوری اظہار ہے اور تکرار علامت کی شرط ہے، لہٰذا سمندر علامت ہے، غلط ہے''۔

(''شعر، غیر شعر اور نثر'' ؛ فاروقی ؛ ص : ۱۱۶)

فاروقی کے مطابق تخلیقی زبان میں استعمال ہونے والے ہر لفظ کی طرح علامت بھی اپنے سیاق وسباق کو متاثر کرتی ہے۔ رفیق رازؔ کے یہاں صرف لفظ سیاہ/ سیہ ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے الفاظ مثلاً خاموشی، حیرت، شعلہ، چمک، نور، دھواں، اسرار وغیرہ بہ تکرار استعمال ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ انہوں نے ان الفاظ کو خال خال ہی مجرد استعمال کیا ہے بلکہ ترکیب سازی کے ذریعے انہوں نے ان علائم کو مختلف سیاق میں شامل کیا ہے۔ اس سے قبل کہ ہم رفیق رازؔ کے کلام میں لفظ سیاہ/ سیہ کی علامتی حیثیت پر غور کریں اور اس لفظ اور دوسرے علائم کے درمیان روابط پر گفتگو کریں، ضرورت ہے کہ علامت کی تھوڑی سی وضاحت کی جائے۔

علامت کے بارے میں وزیر آغا کہتے ہیں کہ:۔

''جب اس شے کا ذکر آجائے تو یہ شے اُس تصور کی طرف ذہن کو منتقل کرے جو اس کا وصف ہے''

(''اُردو شاعری کا مزاج'' ؛ وزیر آغا ؛ ص : ۱۸۸)

حسین الحق نے اسے ''تخلیقی بدل'' کا نام دیا ہے اور مثال میں سریندر پرکاش کے افسانے میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے آدمی کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ وقت کی علامت ہے۔

فرانسیسی علامت نگاروں نے انتہا پسندی سے کام لیتے ہوئے علامتوں کو ہی ادب کا مفہوم سمجھا اور اسے افہام و تفہیم کی دنیا سے الگ کیا۔ ڈاکٹر انیس اشفاق نے فیضؔ کے ''داغ داغ اُجالا'' اور ''شب گزیدہ سحر'' کے معنوی امکانات پر بحث کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ :۔

''چونکہ ان میں علامتی اوصاف ہیں اور علامت ایک قطعی مفہوم کا غیر قطعی حوالہ ہوتی ہے اس لئے ان علامتوں کے اسی وصف کی بنا پر مسلم لیگی لیڈر، ڈاکٹر ساورکر اور گوڈسے اپنے اپنے مفاہیم نکالنے میں حق بجانب ہیں جیسا کہ علی سردار جعفری نے فیضؔ کی اس نظم پر اعتراض کیا تھا''

(''فیض ۔ ۔ شخص اور شاعر'' ؛ انیس اشفاق ؛ ص : ۲۱۸)

شمس الرحمٰن فاروقی نے علامت کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے کہ:

''علامت معنی نہیں بدلتی ہے بلکہ یہ معنی کو آگے بڑھاتی ہے۔ انہوں نے غالبؔ کے کلام میں ''دشت'' علامت کو مختلف اشعار کے تناظر میں دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کلامِ غالب کے ہر شعر میں جہاں ''دشت'' یا اس کے انسلاکات استعمال ہوئے ہیں، دشت کی کوئی نہ کوئی صورت حال بیان کی گئی ہے جو کہ دوسرے شعر کے ممتاز بھی ہے لیکن ان کی یاد بھی دلاتی ہے''

(''شعر، غیر شعر اور نثر'' ؛ فاروقی)

اس تناظر میں رفیق رازؔ کی بعض علامتوں کو دیکھتے ہیں:۔

اِک خموشی کہ مہکتی ہے مرے کمرے میں
ایک آواز کہ ہے نقش بہ دیوار سیہ

☆

دیوار و در پہ اب تو چمکتی ہے خامشی
اس گھر میں ہانپتی تھی کبھی گفتگو سیاہ

☆

سبزہ وخوشبو میں اِک سیلابِ خوں پوشیدہ ہے
شہر کی دہلیز پر قہرِ سیہ خوابیدہ ہے

ان اشعار میں سیاہی کو منفی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہانپنے اور قہر نے اس کے منفی کردار کو اور بھی شدید کیا ہے۔ سیاہ گفتگو (وہ بھی ہانپتی ہوئی) نے ایک طرف اظہار کی نارسائی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے تو دوسری طرف خامشی کی چمک نے خاموشی کو سیاہی کی ضد کے طور پر پیش کیا ہے۔ گویا کہ سیاہی گفتگو ہے جو ہانپ رہی ہے۔ سیاہی آواز ہے جو نقش بہ دیوار ہے اور سیاہی قہر ہے جو برپا ہونے والی ہے۔ اس کی بجائے خاموشی کا وصف چمکنا اور مہکنا ہے

غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد

اب یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

زیرِ نگیں ہوئے ہیں مہ و مہر اور نجوم
ہاتھ آ گئی ہے مجھ کو عجب دولت سیاہ

☆

موضوع شعر کا ہے فقط حرمتِ سیاہ
اسلوب سے عیاں ہے مری عظمت سیاہ

اسی طرح شہرتِ سیاہ، آیت سیاہ وغیرہ سے رفیق راز نے سیاہی کو ایک مثبت ذہنی رویّے کے طور پر پیش کیا ہے۔ حالانکہ ایسا استعمال اُن کے کلام میں شاذ ہی نظر آتا

ہے، لیکن اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ رفیق رازؔ کے شعروں میں سیاہی معنی کو توسیع دینے کے بجائے موقع کے اعتبار سے معنی کو تبدیل کرتی ہے۔ اس طرح سیاہی ایسی علامت نہیں بن پاتی ہے جو کہ اُن کے کلام میں بنیادی کلید کا کام دے سکے اور اُن طلسم خانوں کو کھولنے میں مدد دے جن سے اُن کا کلام مملو ہے۔ البتہ اِس بات سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ رازؔ کی دوسری علامتوں کے ساتھ سیاہی کے انسلاکات اُن کے علامتی نظام کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً اوپر ذکر کیا گیا کہ رفیق رازؔ نے سیاہی کی ضد میں خاموشی کو استعمال میں لایا ہے۔ اسے رازؔ کی تخلیقی توانائی سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سیاہی کی ضد کے طور پر سفیدی یا روشنی یا نور وغیرہ کو کم ہی استعمال کیا ہے جب کہ انھوں نے اکثر اوقات سیاہی کے مدمقابل 'خاموشی' کو رکھا ہے جو کہ نہ صرف ان سفیدی، روشنی وغیرہ کا اپنے اندر احاطہ کرتی ہے بلکہ اور بھی احساسات اور اوصاف کے ساتھ 'خاموشی' مربوط ہے۔ ان شعروں کو دیکھئے:

ہماری روح میں نشہ ہے تیرے جلووں کا
ہماری آنکھوں میں ہے روشنی بھی حیرت کی

☆

ہے کس فقیر کی یہ خموشی شباب پر
جنگل میں ہر طرف ہے پُر اسرار سی چمک

روشنی میں ہے تر فقیر کی چُپ
اک شعاعِ فلک نوردسی ہے

مظہرِ امکان میں جلوۂ حیرت بھی ہے
دودِ خموشی میں ہے شعلۂ اسرار بھی

ان اشعار میں خموشی کے معنی نہیں بدلتے ہیں بلکہ مختلف سیاق میں ان کی توسیع ہوتی ہے اور یہ ان سیاق سے متاثر بھی ہوتی ہے۔ یہ خموشی نہ ہی کسی مردم بیزار شخص کی تنہائیوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی کسی فیشن کا شاخسانہ۔ دراصل یہ خامشی ذات کے اسرار خانوں میں ہلچل کی پیداوار ہے۔ بقول عرفی

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در جیحونِ عشق
روئے دریا سلسبیل وقعرِ دریا آتش است

مثلاً پہلے شعر میں خموشی کا دائرہ شعری کردار (متکلم، شاعر، راوی) تک محدود ہے۔ شعری کردار بظاہر چُپ ہے اور اس کا نشہ روح میں ہلچل مچا رہا ہے۔ اس ہلچل کا موجب جلوہ ہے اور اس کا مظہر حیرت ہے۔ گویا کہ خاموشی کا سفر ہونٹوں سے شروع ہو کر روح کے راستے سے آنکھوں پر منتج ہوتا ہے۔ یہاں پر خاموشی، روشنی، نشہ اور حیرت کے انسلاکات وجود میں آتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ علائم ذات تک محدود ہیں۔ دوسرے شعر میں بھی خاموشی سے سامنا ہوتا ہے جو کہ شباب پر ہے۔ اس کا مظہر جنگل میں پھیلی ہوئی چمک ہے۔ جنگل ماحول کا استعارہ ہوسکتا ہے یا ذات کا۔ اس شعر میں چمک کے ساتھ پُر اسرار رکھ کر معنوی امکانات کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ اس طرح خاموشی کے ساتھ چمک کے علاوہ اسرار کو بھی مربوط کیا گیا۔ اس طرح خاموشی کی روشنی اسرار میں ملفوف ہو کر حیرت کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ذات کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی متاثر کرتی ہے۔ تیسرے شعر میں خاموشی کی مظہر ایک بار پھر روشنی ہے لیکن یہ چمک نور تک وسیع ہوتی ہے۔ اس فضا میں خاموشی ذات اور ماحول سے آگے نکل کر فلک نوردی کرتی ہے۔ چوتھے شعر میں دھوئیں سے خاموشی کی تجسیم کی گئی ہے (حالانکہ باقی جگہوں پر رفیق رازؔ نے دھوئیں یا سیاہی کو خاموشی کی ضد کے طور پر برتا ہے)۔ اس دھوئیں میں اسرار کا شعلہ رکھا ہے اور اس کے مظاہر عالم امکاں میں حیرت کے جلووں

سے نشان زد کئے گئے ہیں۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ رفیق رازؔ نے خاموشی کو بنیادی علامت بنا کر اس میں روشنی، چمک، نور وغیرہ کے انسلاکات رکھے ہیں۔ مزید یہ کہ چمک یا روشنی کے مقابل میں سیاہی کو رکھ کر خاموشی کو ذات اور کائنات کی پیچیدگیوں کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان علائم کے ذریعے وہ عالم امکاں کے جلوؤں کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب یہ دیکھئے:

پھر لوگ سراسیمہ نکل آئے گھروں سے
پھر کوچۂ اسرار میں اِک نغمہ چھڑا ہے

☆

کرۂ شب کے طلسمات کے جنگل میں پڑا
شعلۂ لمس کی خوشبو میں نہائے جانا

☆

خاموش ترنم میں عجب سحر ہے بھائی
راتوں کو ہر اک پیڑ لگے نغمہ سرا سا

☆

حیرتوں کی روشنی میں جگمگاتا آسماں
پھیلتا ہے سوچ کے مانند کتنا آسماں

مثل خوشبو رکھ دیا آوارہ مجھ کو
خامشی نے بھی نہیں چھوڑا کہیں کا

☆

چشمِ شرربار میں موسم یخ بستگی
اور گھنی چپ میں ہے سختی کہسار بھی

☆

سکوتِ موسمِ حیرت کی دھند چھٹ گئی لیکن
کہیں کہیں پہ مری فکر کا گلاب لکھا تھا

ان اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ خاموشی کبھی نغمہ کی صورت اختیار کرتی ہے تو کبھی خوشبو کی۔ اس میں پانی کی روانی بھی ہے اور سوچ کی طرح پھیلاؤ بھی۔ خوشبو بن کر یہی تلاطم خاموشی دربدر پھراتی ہے اور کہیں اپنے استحکام کی بنا پر کہسار کی طرح سخت بھی ہوتی ہے۔ خاموشی حیرت کے ساتھ قریبی تعلق رکھتی ہے اور یہ حیرت فکر کے گلابوں میں در آتی ہے۔ اس طرح خاموشی مختلف طریقوں سے اپنے آپ کو منواتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاموشی ذہنی صورت حال اور انسانی سوچ کی آئینہ دار علامت ہے۔ بظاہر یہ صوفیانہ فکر کے ساتھ تعلق رکھتی ہے لیکن انسانی سوچ میں اسرار کے علاوہ اور بھی کئی متضاد افکار موجود ہیں اور رفیق رازؔ کو صوفیانہ فکر یا عصری آشوب یا مابعد جدید ڈسکورس کے ساتھ مخصوص کر کے ہم اُن کے ذہنی رویوں کو مختلف خانوں میں رکھ کر ایک خانہ تک رسائی حاصل کر کے Ice berg کی طرح ذہن کے باقی حصوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔

رفیق رازؔ کا یہ مربوط علامتی نظام اُن کے پہلے شعری مجموعہ ''انہار'' میں جگمگا رہا ہے اور یہ نظام پیکروں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اُن کے دوسرے مجموعہ ''مشراق'' میں اگر چہ تجسیم کاری کے ذریعے خواب جیسے مناظر کم ہی تعمیر ہوتے دکھائی دیتے ہیں لیکن خاموشی کو انہوں نے اظہار کی نارسائی تک پوری طرح پھیلا دیا ہے۔

ہر چند کہ یہ موضوع اپنے علامتی اظہار کی صورت میں ’’انہار‘‘ میں بھی موجود ہے لیکن اظہار ترسیل اور ابلاغ کے لئے لفظ کے نا کافی ہونے نے ’’مشراق‘‘ میں شدت اختیار کی ہے ؂

بس اک لفظوں کی تاریکی نے آ گھیرا ہے مجھ کو
کہ میں صد رنگ معنی تھا بیاں ہونے سے پہلے

حصارِ لفظ سے نکلے تو خوشبوؤں کی طرح
یہ راز آج کھلا تیرے غم کے ماروں پر

میرے شعروں میں شاہد معنی
چاہ میں جیسے یوسفِ ثانی

ایک اِک لفظ میں نہاں میرے
گہری خاموشیوں کی طغیانی

یہ کہا جاسکتا ہے کہ رفیق رازؔ کی شاعری میں بیک وقت کئی ذہنی رویے علامتوں کے ذریعے ظہور میں آتے ہیں جو کہ نت نئے روپ میں نئے انسلاکات کے ساتھ نئی تجسیم کاری کے ذریعے مختلف حواس کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ یہ رویے گھٹتے بھی ہیں اور بڑھتے بھی ہیں اور یہ ذہنی صورت حال سمٹتی بھی ہے اور پھیلتی بھی ہے۔ دراصل یہ رفیق رازؔ کے سیال تخیل کی نشاندہی کرتی ہے۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر شفق سوپوری

رفیق رازؔ کی متصوفانہ فکر

رشید حسن خان نے دیوان دردؔ مرتبہ ڈاکٹر نسیم احمد کے دیباچے میں خواجہ میر دردؔ کے سلسلے میں ایک بے انصافی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خواجہ صاحب صوفی صافی تھے، اس میں تو اختلاف نہیں، شک بھی نہیں، یہ بات تو مسلمات میں ہے! مگر یہ بات کہ وہ صوفی شاعر تھے اس طرح درست نہیں۔ ان کو جس طرح صوفی شاعر قرار دیا گیا ہے اس میں ان کی شاعرانہ حیثیت کے ساتھ بے انصافی ہوئی ہے اور ان کی حقیقی قدر و قیمت اچھی طرح سامنے نہیں آسکی۔ رشید حسن خان کے خیال میں دردؔ کے متصوفانہ اشعار میں یعنی ان شعروں میں جن میں تصوف کی اصطلاحیں نظم ہوئی ہیں، وہ بات نہیں جو ان کے دوسرے اشعار میں پائی جاتی ہے۔ ایسے اشعار میں شعریت کم ہے اور بعض جگہ کم تر ہے۔ ایسے اشعار دردؔ کے نمائندہ اشعار نہیں۔ یہ اردو غزل کے بھی نمائندہ اشعار نہیں۔

رشید حسن خان کا فرمانا درست ہے اگر چہ اس میں خواجہ میر دردؔ کے ساتھ ایک اور ناانصافی کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ تصوف کو درد کے کلام کی ایک امتیازی شان تسلیم کیا گیا ہے اور دردؔ کو اس سے محروم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اصلی درد کو دریافت کر کے ان کی حقیقی قدر و قیمت متعین کی جائے۔

حکیم منظورؔ نے رفیق رازؔ کے شعری مجموعے "انہار" کے دیباچے میں لکھا

ہے کہ رفیق رازؔ صوفی بھی نہیں کہ باوصف اس کے ان کی سوچ کا محور ان کی ذات ہے۔ وہ دراصل ذات اور کائنات میں اپنے وجود کے معنی سے روشناس ہونے کی سعی کرنے سے منکر نہیں۔ وہ ہمہ اوست یا ہمہ از اوست کے فلسفوں کے مبلغ بھی نہیں لیکن منطق اور معروض کی باریکیوں اور ان کی اہمیت سے کما حقہ واقف ہیں۔

رفیق رازؔ صوفی نہیں ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی متصوفانہ فکر ان کے اشعار کی جان ہیں اور یہ اشعار شعریت سے معمور بھی ہیں اور معاصر فکر کے ترجمان بھی۔ رفیق رازؔ کی شاعری کے فنی اور فکری پہلو جس قدر گہرے ہیں اتنے ہی متنوع بھی ہیں۔ ان کی فکر کے وقار نے ان کی شاعری کو ایک انوکھا آہنگ عطا کیا ہے جس میں متصوفانہ لَے کی حرکت اور اس حرکت سے پیدا ہونے والی حرارت جوہر کی طرح موجود ہے۔ لہٰذا ان کی شاعری ایک ایسے منور نقطے کا درجہ رکھتی ہے جسے ان کی شاعرانہ شخصیت اور روحانی فکر کا سنگم کہا جا سکتا ہے۔ رفیق رازؔ کا ہر مشاہدہ اور تجربہ کسی نہ کسی طرح ایک پُر وقار لَے کے ساتھ متصوفانہ مرکز پر منتج ہوتا ہے لہٰذا ان کی شاعری کا ایک امتیازی پہلو یہی رجحان ٹھہرتا ہے۔

عام طور پر جدید شعراء کے یہاں تصوف کا رجحان پرانے مسلمات اور اقدار سے دست بردار ہونے کے احساس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے یقینی، تشکیک، تنہائی اور مایوسی کے طور پر جنم لیتا ہے جسے فرار کی ہی ایک صورت قرار دیا جا سکتا ہے۔ رازؔ کے یہاں اس کے برعکس تصوف کا تصور اپنی پاکیزہ روایت کے ساتھ علمی اور اجتہادی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں روحانی بصیرت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

رفیق رازؔ کے یہاں صوفیانہ عمل کے رویئے میں دو نمایاں جہتوں کا پتہ چلتا ہے، ایک میں تصوف سے متعلق عملی بصیرت کا احساس ملتا ہے اور دوسری تصوف کے عملی پہلو کی دلالت کرتی ہے۔ تصوف کی عملی بصیرت کے حوالے سے رفیق رازؔ کی

شاعری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کی ایک ایسی مقدس اور پاکیزہ روحانی روایت کے سائے میں پروان چڑھے ہیں جہاں صوفی بزرگوں، فقیروں، قلندروں اور خدا دوست لوگوں کی حیات کے نورانی قصے اہلِ بصیرت کے کردار اور نفسیات پر کسی نہ کسی طور اثر انداز ہوتے ہیں۔ اہلِ معرفت کے دلوں تک اس عظیم الشان روایت کے سوتے لل دید، شیخ العالمؒ، صمد میر، احد زرگر، شمس فقیر، رحیم صاحب سوپوری، وغیرہ صوفی شعراء کے کلام کے لافانی سرچشموں سے پھوٹتے ہیں۔ رازؔ نے اس روایت سے اس قدر فیضان حاصل کیا ہے کہ ان کی شاعری کو اس روایت کی تجدید اور توسیع کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں وہی آہنگ، شیرینی، نرمی، حلاوت، جلال و جمال، آگہی اور شعور کے عناصر پائے جاتے ہیں جو اس روایت کا خاصہ ہیں۔ ان صوفی شعراء کے کلام کا مطالعہ قاری کو جگہ جگہ کئی ایسے الفاظ، استعارات اور علائم کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے جو ان کے بنیادی رجحان اور رموزی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رفیق رازؔ نے اس رمز کو سمجھا ہے، اسی لئے ان کی شاعری میں جگہ جگہ پر "سیاہ" "سکوت" "خوشبو" "سوچ" اور اس نوع کے ایسے الفاظ و علائم پائے جاتے ہیں جو اُن کی متصوفانہ فکر کے ترجمان کہلائے جا سکتے ہیں۔

رازؔ کے کلام میں اکثر و بیشتر لفظ سیاہ/اندھیرا/اور سفید/روشنی کے تلازمے اور ان سے وابستہ متصوفانہ مفاہیم ان کے اظہاری پیرائے اور معنیاتی نظام میں ایک گہری درونیت کا شدید احساس پیدا کرتے ہیں۔ دراصل سیاہی، تاریکی کے بغیر سفید، روشنی کا تصور اور ظہور ناممکن ہے۔ ان دونوں تلازمات کے آمیزے سے کائنات کے وسیع نظام کے امکانات کو استعاراتی پیرائیے میں اظہار کرنا آسان اور ممکن ہو جاتا ہے۔ رات کے معنوں میں اگر لفظ سیاہ کی استعاراتی شان کا تجزیہ کیا جائے تو رات خدائے جمیل کی صفتِ نور کو ظاہر کرنے کا ایک بنیادی وسیلہ ہے۔ رات کے وجود سے

سورج کے ظہور کی امکانی قوت اور وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ راؔز کا ایک شعر ہے ؎

میرے تفکرات کی تحویل میں رہے
کچھ دیر اے خدا یہ ترا شعبۂ سیاہ

اس شعر میں تفکرات کی تحویل کے ساتھ شعبۂ سیاہ نے شاعر کی خلاقانہ صلاحیتوں کو بدرجہ اتم اجاگر کیا ہے۔ نور اور تاریکی کے آمیزے سے ذاتِ خداوندی کا عرفان تصوف کے کس عالم میں ہوتا ہے یہ مجھے معلوم نہیں البتہ جب بھی اس عرفان کی کیفیت اور لطف کو ظاہر کرنا ہو تو اس سے زیادہ پُر اثر اور پُر کیف اندازِ بیان نہیں ہو سکتا۔

نغمۂ نور کی ہر لے میں چمکتا ہے وہی
مثلِ مفہوم وہی حرف کے اس پار سیہ

رفیق راؔز جہاں مظہرِ امکاں میں جلوۂ حیرت دیکھتے ہیں وہیں دودِ خموشی میں شعلۂ اسرار کا نظارہ بھی کرتے ہیں۔ حضرتِ ابراہیم کے نارِ نمرود میں کُودنے کے واقعہ میں اہلِ بصیرت کیلئے مظہر امکاں بھی ہے، جلوہ حیرت بھی اور شعلۂ اسرار بھی ؎

مظہرِ امکاں میں تو جلوۂ حیرت بھی ہے
دودِ خموشی میں ہے شعلۂ اسرار بھی

راؔز کا ایک خوبصورت شعر ہے ؎

لرزاں ہے نخلِ آب پہ اک شعلۂ سیاہ
حیرت میں ڈالتا ہے مجھے قصۂ سیاہ

پہلے مصرع میں غضب کا بصری پیکر ہے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسا کھلتا اور گم ہوتا پیکر تخلیق کرنے سے پہلے شاعر کے لاشعور میں قرآن مجید کا یہ فرمان رہا ہوگا۔

"یا (ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے) جیسے دریائے عمیق میں اندھیرے جس پر لہر چڑھتی

چلی آتی ہے۔(اور) اس کے اوپر اور لہر(آرہی ہو) اس کے اوپر بادل ہو۔ غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہوں۔ اس پر ایک(چھایا ہوا) جب اپنا ہاتھ نکالے تو کچھ نہ دیکھ سکے۔(ترجمہ)

اب مندرجہ بالا شعر کے ساتھ یہ شعر ملاحظہ کریں۔

ابھی تو آنکھ ہے مصروفِ جلوۂ حیرت
ابھی زمین ہے تھوڑی سی زیرپا باقی

رفیق رازؔ کی شاعری میں متصوفانہ عمل کے عملی پہلو کا جائزہ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ ان کے یہاں مذہب، تصوف یا مابعدالطبیعات کی طرف مراجعت کا عمل کسی مجبوری یا فیشن کے نتیجے میں نہیں بلکہ ایک عملی تجربے کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ عمل روحانیت کے گوناگوں تجربات اور مشاہدات پر محیط ہے۔ ان تجربات اور مشاہدات کا مظہر کبھی کوئی شعری کردار بنتا ہے تو کبھی خود شاعر کی ذات۔ یہ سچائی کی تلاش میں ذہن اور فکر کے مختلف مشاہدات کا اظہار ہے۔ اسے تلاشِ حقیقت کا باطنی سفر کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت جو غیر مادی، نا قابلِ تغیر، ازلی، غیر حادثاتی اور ابدی ہے۔ اپنی ذات اور اس عالم محیط کے بارے میں سوچنے اور حقیقت کو حاصل کرنے، نیز اس کے اسرار دریافت کر کے انہیں مدرک کرنے کی طلب رفیق رازؔ کے شخصی تجربے اور انفرادی حال پر استوار ہے جس کے ذریعے وہ بذاتِ خود مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حقائق کے ذریعے بات کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہاں لفظ چپ، سکوت، خاموشی صوفیانہ عمل کے اس مرحلے کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں جب صوفی خاموش رہتا ہے تو علائق دنیوی سے اس کی علاحدہ ہو جانے کی بابت اس کے اعضاء بولتے ہیں۔

خاموشیوں میں اس کی قہرِ ہوا کی خوشبو
آنکھوں میں اس کا موسم لب بستہ جنگلوں کا
بس کہ اک گنجینۂ اسرار ہے خاموشی اس کی

روشنی سے ترا ادھوری بات پورے آدمی کی

☆

میرے سکوتِ فکر میں ہلچل بھی ہے مری
بس اک ترا خیال نہیں ہے بنائے خواب

☆

چپ ہی مجھے لگتی ہے امکان سے روشن
سوچ مری شعلگیِ ارض وسما ہے

رفیق رازؔ کے یہاں توجہ، سوچ، دھیان کا الفظ ذکر واز کار یا مراقبے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ حالت اہلِ خلوت کے اس عالم سے تعبیر ہوتی ہے جہاں ان کے روز و شب اوراد و وظائف اور ذکر میں بندھے ہوتے ہیں۔ مراقبہ کو عین ذکر بلکہ اس سے بھی افضل درجہ حاصل ہے۔ رفیق رازؔ اپنی قوتِ ادراک کو پوری طرح صفات کے تصور میں اس درجہ غرق کرتے ہیں کہ انہیں ہر طرف ذات کا پرتو نظر آتا ہے۔

چپکے سے میرے نہ ہونے کا تماشا تو ہوا
سوچ کے صحراؤں میں اب اور کیا ہونے کو ہے

رفیق رازؔ صداقتوں اور حقیقتوں کا صحت مند شعور رکھتے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ حقائق اور صداقتوں کو منظّم و مربوط کرنے اور ان میں جمالیاتی آہنگ پیدا کرنے کیلئے خیال آفرینی کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کے یہاں تشبیہ و استعارہ اور علامت کے استعمال سے مختلف حقیقتیں آپس میں پیوست ہوتی ہیں۔ رفیق رازؔ نے جدید اور مابعد جدید غزل کو متصوفانہ فکر کے حوالے سے ایک نئی شعری جمالیات عطا کی ہے۔ یہ ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔

☆☆☆

☆...... پروفیسر مجروح رشید

رفیق رازؔ کی شعری کائنات

رفیق رازؔ کشمیری اور اردو دونوں زبانوں کے وہ معتبر شاعر ہیں جنہوں نے اپنی فن کی سحر کاریوں سے کشمیری اور اردو شاعری میں اک نئی اور نرالی روح پھونک دی ۔ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کی ندرت اور ان کا فکر انگیز اور استفہامیہ لب ولہجہ ان کی شاعرانہ شخصیت کے دو اہم ترکیبی عناصر ہیں جو ان کے اشعار میں جا بہ جا نظر آتے ہیں ۔ میں ذاتی طور پر ان کی شاعری کا ہمیشہ سے ہی مداح رہا ہوں اور یہ کہ میں ان کی شاعری کے فنی معجزے سے کسبِ فیض کرتا رہتا ہوں ۔ ہر نئی قرأت کے بعد ان کا شعر ایک نیا ہی در کھولتا ہے اور ایک عجیب اور نامانوس دنیا قاری کے تخیل کو محیط ہوجاتی ہے۔ اچھے شاعر کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کی شاعری ہر لمحہ نئی آن اور نئی شان نئی بان کے ساتھ قاری کے تخیلات کو منور کرتی رہتی ہے۔

'نخل آب' سے پہلے رفیق رازؔ کے دو شعری مجموعے 'انہار' اور 'مشراق' برِ صغیر ہندو پاک اور اردو کی نئی بستیوں میں نہ صرف مقبول ہوئے ہیں بلکہ دونوں مجموعے داد و تحسین سے نوازے گئے ہیں ۔ تینوں مجموعوں کے ناموں سے ہی رفیق رازؔ کی طلسمی شعری دنیا کا سم سم قاری کے ہاتھ آتا ہے اور قاری ان کی شعری دنیا کی پیچ در پیچ خواب رنگ حقیقتوں کا لطف حاصل کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری کی فضا کہیں کہیں منیر نیازی اور بسا اوقات ولیم بلیک کی شعری دنیا سے ملتی

جلتی نظر آتی ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب 'نخلِ آب' رفیق رازؔ کے شعری کینواس کی وسعتوں اوران کے تخیل کی کشادگیوں کے ساتھ اپنے عہد کا ایک مرثیہ ہے جس میں ایک طرف گئی رتوں کے چراغ دوسری طرف عصرِ حاضر کی تند ہواؤں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ رفیق رازؔ ایک ایسی شعری آواز کا نام ہے جس کی گونج میں نہ صرف ماضی کی روشن تتلیاں رقصاں ہیں بلکہ جس میں عصرِ حاضر کی وہ بجلیاں بھی کڑکتی ہیں جن سے روحِ انسانی تھرتھرا اُٹھتی ہیں۔ رفیق رازؔ کی شاعری کے جادو سے قاری کچی نیند سے چونک اٹھتا ہے اور بدلتی زندگی کے ابھرتے خدوخال کو دیکھ کر حیرتی ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری زندگی کے تنوع سے معمور ہے اور ایک ایسی قوسِ قزح کو جنم دیتی ہے جس میں زندگی کا ہر رنگ موجود ہے۔ وجودی کرب سے لے کر روح کی بیکراں وسعتوں تک شاعر کا تخلیقی سفر ان تمام راہوں کا پتہ دیتا ہے جن سے اس کو گزرنا پڑا ہے۔

کبھی سرِ دیوار پسِ دیوار کبھی
دھوپ پہ جس کا دارومدار وہ سایہ میں

●

منظر کوئی بنا، کوئی بگڑا، کوئی مٹا
اہلِ نظر کی آنکھ میں کوئی ہوا چراغ

●

ادھر وجود کی آواز سے وہ دشتِ پُر افشاں
ادھر سکوت کے نشے میں مست ہے یہ بیاباں

●

رگ رگ میں حادثات گزشتہ کا زہر ہے
ڈھلتے نہیں ہیں سانحے شعروں میں حال کے

''انہار''اور''مشراق'' کی تخلیقات سے لے کر''نخلِ آب'' کی غزلوں تک کا شعری سفر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ شاعر اپنے تخلیقی سفر کی کئی ارتقائی منزلیں طے کر کے نئی منزلوں کی طرف گامزن ہیں تاہم کئی موقعوں پہ لگتا ہے کہ شاعر اپنی طے شدہ منزلوں کو پیچھے مڑ کر تکتا رہتا ہے۔ ہر چند''نخلِ آب'' کی غزلیات ایک ایسی شعری کائنات کی تجسیم ہیں جن میں شاعر کا سماجی شعور عصری اور سیاسی بے راہ روی کے تئیں اس کی برہمی اور اس کے وجود کا کرب تمام تر فکری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ابھرتا ہے۔تاہم رفیق رازؔ کے سنجیدہ قاری کے لئے ان کی شاعری کی بنیادی تھیم کائنات کی وحدت ہے۔ایک ایسی وحدت جس میں شاعر کا تخلیقی تجربہ،انسان اور قدسیت اور اس کے روح اور بدن کے ناقابل تنسیخ رشتوں کے سوتوں سے پھوٹتا ہے۔

چند برس پہلے میں نے رفیق رازؔ کی کشمیری شاعری کے حوالے سے اپنے ایک انگریزی مضمون میں یہ نکتہ ابھارنے کی کوشش کی تھی کہ ان کی شاعری اور انگریزی رومانوی شاعروں میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ سب روح کی دنیا کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔اسی اٹوٹ رشتے کی وجہ سے رفیق رازؔ کے استعاروں میں پیکروں کے ایسے جھرمٹ نظر آتے ہیں جو کبھی کبھار ایسی روشنی کرتے ہیں کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ایسے موقعوں پہ قاری شعر کی فکری تہوں تک پہنچے بغیر ہی شاعر کے فنی سحر سے محظوظ ہوتا ہے۔ان کی شعری علامتوں کا محاسبہ کرتے ہوئے پتہ چلتا ہے کہ رفیق رازؔ تخیل کے شاعر ہیں۔جبھی تو ان کی علامتیں کائناتی ہیں۔آفتاب ،آسماں،تارے،سمندر،صحرا،دریا،دشت،ہوا،ہوائے تند،جنگل اور پرندے جیسی کئی علامتیں رفیق رازؔ نے برتی ہیں جو آفاقی علامتوں میں شمار ہوتی ہیں۔

دشتِ سیاہ میں چھوڑ گیا روشنی کے داغ
کیا ایلچی تھا مملکتِ آفتاب کا

●

اُڑوں گا خاک سے پہلے پہل اور آخر کار
ہوائے تند کو رکھ دوں گا میں صبا کر کے

●

بگولہ بن کے اٹھا تو میں تھا خرابے سے
بپا ہوا نہ کوئی حشر آسمانوں میں

●

میں پانی تھا سورج گھور رہا تھا مجھے
کیا کرتا بے بس تھا بادل ہونے تک

رفیق رازؔ کے اشعار میں کہیں کہیں قرآنی تلمیحات اور آیاتِ ربانی نظر آتی ہیں جن سے ان کا اظہار اور تخیل منور ہو جاتا ہے۔ قرآن، زکوٰۃ، عذاب الیم، الف لام میم جیسے الفاظ اور آیات کے برتاؤ سے شاعر اپنے غیر متزلزل عقائد کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے جذبے کو ایک شعری ڈھانچے میں ڈھالنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ خطۂ لاریب، بارگہ حرف اور سلطنتِ حرف جیسی ترکیبیں شاعر کی خلاقانہ ذہن کی زرخیزی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان ترکیبوں کی بدولت ایسے پیکر معرض وجود میں آتے ہیں جو رفیق راز کی غزل کو Kaeledoscopic بناتی ہے۔ پیکروں کا ایک ایسا Mosaic جس میں زندگی کا ہر رنگ حرکت میں نظر آتا ہے۔ ان کی غزلوں کا عروضی تنوع اور وسعت آہنگِ دل کے تاروں پہ ایک ایسا لافانی نغمہ چھیڑتا ہے کہ سات سروں کا دریا رگِ جاں میں رواں ہو جاتا ہے۔

یہ شور فکر کا نہیں خاکِ وجود میں
دریا رواں دواں ہے عذاب الیم کا

●

روشن ہیں ابھی خواب تیرے دیدۂ تر
میں
محفوظ ہیں کچھ لعلِ نظر تاب تہہ آب

●

کس نے یہ سطحِ آب پہ ڈالا پڑاؤ ہے
کس نے کیا ہے نصب یہ خیمہ حباب کا

●

تصویر تھی کہ خواب کے رنگوں کا انتشار
تعبیر تھی کہ اہلِ بصیرت کی دھند تھی

رفیق رآز کے شعروں میں صوت و معنی کی ہم آہنگی اور صوت وحرف کی تکرار کئی اور دوسری شعری صنعتوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی فضا نکھرتی ہے جو شاعر کی افتادہ طبعی کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ فضا ایسے شعروں کو جنم دیتی ہے جن میں انسانی جذبے کی صداقت اور معاصر بے رنگ زندگی کے کئی رنگ اک روندے ہوئے اسلوب کے بجائے تر و تازہ شعری محاورے کو جنم دیتے ہیں جس سے اظہار کی نئی راہیں روشن ہوجاتی ہیں۔

لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں امیں ہوں میں دردِ عظیم کا

●

یہ عرصہ گہہ غزل اس قدر بھی تنگ نہیں
ہماری فکر ہی کچھ بے لگام ہے سائیں

●

سکوت ٹوٹ گیا اور روشنی سی ہوئی
شرار سنگ سے نکلا خدا خدا کرے

●

رفیق رازؔ کی شاعری کا فکری پہلو بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ عصرِ حاضر کی جگمگاتی روشنیوں سے زندگی داغدار ہوگئی ہے اوران داغوں سے اک ایسی دھند ابھری ہے جس نے شاعر کے ساتھ اس کے گردو نواح کو بھی اپنی گرفت میں لیا ہے۔

کل رات جلوہ گہہ میں قیامت کی دھند تھی
دیکھا تو میں نے اپنی بصارت کی دھند تھی

●

اتنا فراغ دل تو نہیں ہے یہ آسمان
یہ روشنی کے داغ زمیں پر کہاں سے آئے

بہر حال یہی دھند مجموعی طور پر رفیق رازؔ کی شاعری میں خاموشی ، سناٹا ، سکوت اورایسی ہی کئی اور علامتوں کے ساتھ چھائی ہوئی ہے اورشاعر بے سروسامانی کے عالم میں اس دھند سے نبرد آزما ہے۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر غلام محمد آجر

رفیق راز......تخیل کی جولاں گاہ کا شہسوار

یہ رفیق راز کی تصویر ہے۔ طبیعت میں سبک سری کے باوصف وہ ایک اچھا آدمی اور دوست ثابت ہوتا رہا ہے۔ ایک پابندِ آداب شخص ہے۔ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں بعض اوقات اس کے سن وسال اس کے پیشہ ورانہ ضابطوں پر حاوی ہوتے نظر آتے ہیں، حالانکہ وہ عام لم پُن (Lum Pan) کشمیری افسر شاہی کی طرح دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھنے کی نفسیاتی مشکلات سے بھی دوچار نہیں۔ بہرحال اس کے پیشے میں طریقہ کار کا تنوع' اس مطالعہ سے خارج ہے۔ بلند وپست کے لازمی فرق ِمراتب میں اظہار ذات کی خارجی صورتوں کی نشاندہی بھی اس مطالعہ میں شامل نہیں۔

بعض حالات میں اسے ایک وارفتہ قسم کی خود پسندی آلیتی ہے۔ خاص طور پر جب یہ دوسرے لوگوں سے اظہار ممنونیت کی لاشعوری خواہش سے باردار ہوجاتی ہے۔ اس طرح سے لذت کوشی کا وہ مرحلہ آجاتا ہے جہاں یہ اس کے کلام میں نرگسیت کی دروبست میں مدغم ہوجاتی ہے۔ اس طرح کی ضرورت ایک محفوظ و مامون سرکاری اہلِ کار کی شائستہ شان کے ساتھ حلیہ تبدیل کر لیتی ہے اور مروت بن کر اس کے کردار اور برتاؤ کا ایک ذیلی عمل بن جاتی ہے۔ گو راز کی طرف سے مخاصمت یا مزاحمت سے دل برداشتہ ہونے کا گراف بہت ہی نیچے ہے۔ ہر طور محولہ بالا مفروضہ ہمارے مطالعے سے منسلک ہے۔

سرینگر جیسے شہر میں رآز کی آزاد روطبیعت کا تنوع پسندی کی صورت اختیار کر لینا غیر فطری نہیں۔ وہ تو ایک شاعر ہے اور یونیورسٹی سے وابستہ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں دو سطحوں پر راز کی اندرونی دروبست قابلِ مطالعہ بن جاتی ہے۔ اول خالص نفسیاتی حوالے سے (اور یہ ہمارے موجودہ مطالعہ سے خارج ہے) دوم اس کثریت کے اظہار کی متنوع صورتوں میں ظاہر ہوتا اور مخصوص الفاظ کے انتخاب کی توالی سے پیدا ہونے والی اسلوبیاتی ساخت اور بار بار عود کر آنے والے آہنگ کا شعری امتیاز۔

راز ایک مضبوط کردار میں قلعہ بند تخلیقی وسعت کا نام ہے۔ اس کا اظہار ان کے کلام میں تخلیقی توانائیوں کے فشار اور تکثیف کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والی علامتی دروبست سے ہوتا ہے جو اُن کے کلام کو ایک مخصوص رنگ بھی بخشتی ہے اور ان کا شاعرانہ امتیاز بھی متعین کرتی ہے۔ اپنے کار منصبی کو ذریعہ بنا کر دوسروں سے ممنون ہونے کے کشمیر کی افسر شاہی کے چسکے اور باہر سے عائد شدہ اس طرح کے پیشہ ورانہ رتبے کو خود اپنی ذاتی برتری سمجھنے والے افسروں کے مقابلے میں راز کے ہاں گریز کی جو ایک وضع پائی جاتی ہے، اس بات کی شاہد ہے کہ وہ کھوکھلا، کم مایہ اور کم ظرف نہیں۔

درج ذیل قریبی مطالعہ، تحلیل نفسی کی صورت میں اسی تنقیدی مفروضے کی تصدیق کے واسطے سے رفیق راز کی شاعرانہ انفرادیت کی دریافت کی ایک کوشش ہے۔

رآز کے کلام کی بنیادی شناخت اس کے ثانوی تخیل کی جولانی اور فعالیت میں ہے یہ اس کے تخلیق شعر میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی معجزہ نمائی کی بدولت ترتیب اور ترکیب کی ندرتیں، اس کے اردو کلام کی قوت بھی ہیں اور اس کی شناخت پر بھی دال ہیں اور اگر پرت پرت ان کے اندر کی گتھیوں کو ان کے کلام کے حوالے کے ساتھ ساتھ کشمیر میں اردو لکھنے والوں کی اجتماعی نفسیات کو سامنے رکھ کر کھولا جائے، پس پردہ اظہار کی مجبوریوں کے برعکس کشمیریوں کا اردو میں لکھنے کا وہی عمل نظر

آئے گا جو نئے لچیلے نازک سے پودے کی بڑے درخت کے سہارے اوپر چڑھنے سے مشابہہ ہے۔ حالانکہ دوسروں کی طرح راز کے کشمیری کلام کی جولانیاں ہی اسے امتیاز اور تشخص بخشتی ہیں۔ ان کا کشمیری کلام ترتیب وترکیب کے علاوہ آمیختگی اور فشار کے عناصر یا عمل سے عبارت ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ تکثیف، ایک لازمی تشدید اور تمجید (Intensification and Sublimation) کے عمل سے گزر کر اس شعری توانائی اور حسن پر منتج ہوتی ہے جو شاعری میں الگ امتیاز اور نئے خدوخال کیلئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ رازؔ کے ہاں اس پورے عمل سے اس کے لاشعور اور تخیل کی داخلی دروبست میں گہری کارفرمائی کا پتہ چلتا ہے۔

ان کے کلام میں تجرید کے ساتھ ساتھ مظہریت، دونوں کی سرحدیں ذاتی لاشعور کی اوضاع (Patterns) اور گہری ساختوں سے عبارت ہیں۔ ان دونوں مظاہر کے پس پردہ اظہارِ ذات کی خواہش، تخلیقی سطح پر سیری، تصعید اور تنقید پانے کا سامان کرتی ہے۔

دشتِ ظلمات کے ناپید کناروں پہ ہمیں
لکھ کے اک آیتِ تقویم شجر آئے تھے

☆

اب پڑھے جانے لگے ہیں غور سے اشعار میرے
جانے اس نے بات ایسی کیا لکھی ہے تبصرے میں

☆

میں کب کِھلا تھا یہ کیا معجزہ ہے
پھیلی ہے خوشبو مری قریہ قریہ

☆

آواز العطش تھی منور تھی سربسر
دریا تک آتے آتے مگر ہوگئی سیاہ

راز کے ہاں آرزومندی ہے، آرزومندی کے پس پردہ اس کی اندرونی توانائی(Libido) اس کی رجولیت اور جنسی توانائی کی لپکیں ہیں جو اس کے الفاظ کو تنویروں اور شعلہ زنی سے باردار (Charged) کرتی ہیں۔اس میں تکثیف اور تعین زائد بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ نفسیاتی گرہوں، داخلی الم آگینیوں اور یاسیت کی ایک مرتعش فضا کا افقی و عمودی تحرک ایک خاص انداز کی لسانی دروبست پر منتج ہوتی ہے۔

پھر مقدس ظلمتوں کے حکم کی تعمیل میں
مرگ زاروں میں دفنایا گیا زندہ چراغ

☆

پھر گردِ سفر تاب دکھائے ہے کرشمہ
پھر نخلِ نظر تاب مقابل میں کھڑا ہے

☆

دودِ سکوت ' سلسلہ شعلہ زار ہوں
یعنی صداوصوت کے دریا کے پار ہوں

☆

میری تلاش میں ہیں شب رنگ آندھیاں
میں بھی چراغِ سایہ نخلِ غبار ہوں

☆

دودِ خیال ہے کہ خموشی کا دور ہے
اک لمس ہے کہ معرفتِ قربتِ سیاہ

رازؔ کی بیشتر تمثالات، پیکروں وغیرہ کے سرچشمے تخیل کی اُس تحت الفضا کے تجربات کی علامتی ترسیل ہے جو اپنے بناؤ میں اس کی جنسی توانائی کی ارکازی بارداریت (Fossilized, Chargedness) کی تاریک خروشانی کا پرتو بھی ہیں اوراس کے نرگسی جھکاؤ کی سیری اور برترانہ طمانیت کا منبع بھی۔حق تو یہ ہے کہ راز کے کلام، خاص کرکشمیری کلام میں اس طرح کی سرایت کاری، اس کی جنسی توانائیوں کی لپکیں جوان کے منتخب کردہ الفاظ کوتنویروں اور شعلہ زنی سے باردار کرتی ہیں ان کو تکثیف، تشدیداور تمجید کے اس عمل سے گزارتی ہیں جوراز کے کلام کو ہمہ جہتی، حسنِ ابہام اورایک دہشت آگیں تمثالیت پر منتج کرتی ہیں۔اس میں تکثیف کے پہلو بہ پہلو تعینِ زائد، اظلال اور مسخ شدہ وہ ٹھوس قوت پیدا کرتی ہیں جو قاری کو ہم احساسی کی ایک ذیلی فضا تک پہنچاتی ہے۔

رازؔ کی نفسیاتی گرہیں، اس کے کلام کے قریبی مطالعہ سے اورزیادہ پیچیدہ نظرآتی ہیں۔ان کی بافت میں مادرخواہی (نہ کہ مادرطلبی) اورنرگسیت کے ساتھ ساتھ مظہری (Phenomenal) جنسی توانائیوں میں مضمر جنسی تجریدیت کی دروبست بھی ہے۔یہ ان لسانی وسیلوں اورذرایع پر منتج ہوتی نظرآتی ہے جوایک تلازمی فضا پیدا کرتی ہے۔یہی ان کے اسلوب کے اس کلی رنگ کے پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے جس سے ہم کہیں بھی علاحدہ نہیں ہو پاتے۔

محفوظ ہوں بہ صفحہ تاریکی سکوت
شب ہائے شہر چشم کی شعری پکار ہوں

☆

پھیلی ہے راتوں رات عجیب ابتری سیاہ
گرتے ہی آنگنوں میں ہوئی برف بھی سیاہ

دیوتاؤں کا گماں ہر شخص پر ہوتا ہے رازؔ
ہر کسی کی آنکھ روشن، ہر کوئی چہرہ چراغ

☆

اک سیلِ گم گشتگی شہر سارا
اک دشت بے چہرگی چہرہ چہرہ

☆

سایۂ شاداب کی ٹھنڈک بدن پر نقش اس کے
حشر ساماں موسموں کا قہر آنکھوں میں لئے میں

رازؔ کے کلام میں زبان کا بنیادی ڈھانچہ ردوقبول کے اس داخلی حوالے سے طے ہوتا نظر آتا ہے جو تفویضی اور منصبی (Functional) لسانی چوکھٹوں کے مقابلے میں سیاقی جھرمٹوں کے واسطے کی پیداوار ہے جو خود شاعر کی داخلی شکست و ریخت کے شاہد ہیں اور قاری کو کچھ اس طرح سے بیدار کرتے ہیں کہ پورا کلام ایسا جمالیاتی بُعد اور تاثراتی مغالطہ پیدا کرتا ہے کہ ڈراما کی طرح کی ہم احساسی کا التباس پیدا ہوجاتا ہے۔

دیوارِ ماہ وسال پہ تاباں ہے کس طرح
وہ اک شبِ وصال کہ ہے غیرتِ سیاہ
آوارہ سیاہ دشت میں تصویرِ صدا ہے
سوکھے ہوئے خوابوں کا شجر نغمہ سرا ہے
پھر گردِ سفر تاب دکھائے ہے کرشمہ
پھر نخلِ نظر تاب مقابل میں کھڑا ہے
پھر دھوپ میں صحرا کا سفر ہم کو ہے درپیش
ہمراہ فقط چشمہ ابلنے کی صدا ہے

دودِ خیال اور خموشی کا دود، معرفتِ قربتِ سیاہ، سوکھے ہوئے خوابوں کا شجر، نخل نظرتاب، چشمہ ابلنے کی صدا کی طرح لبڈو (Libido) اور اِڈ کی ترنگیں اظہار کے دوسرے لسانی چوکھٹوں اور سیاقی جھرمٹوں سے نادر مرادی اشارتوں اور فکری سلسلوں کو متحرک کرتی ہیں جن سے ہم احساسی کا ادبی سطح پر حسیت کا انقطاع اور نفسیاتی سطح پر التباس پیدا ہوتا ہے۔

"اک لمس ہے کہ معرفتِ قربتِ سیاہ" کسی""پس رائیگاں" لمس کی برقی حدت اور کیفیت کی حوالہ دھند ہے۔"یہ "معرفتِ قربتِ سیاہ" کسی لمسی قربتِ سیاہ کی معرفت کا تلازم نہیں ابھارتی نہ ہی کسی قربتِ سیاہ کے بصری، لمسی یا سماعی قربت کا ائتلاف پیدا کرتا ہے۔ ہاں ہر حال یہ حافظے کی لاشعوری توالی کو متحرک ضرور کرتا ہے۔ یہ حافظے کی لاشعوری توالی کی بیداری سے بھی منسلک ہے۔اس تناظر میں "وہ اک شب وصال" کا"وہ اک" کسی واقعہ یا وقوعے کا التباس پیدا کرتا تو نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک انحرافی بدل ہے۔Divergent, Substitute نہ کہ انحصاری (Dependent) بدل۔ ہوسکتا ہے کہ شاعر کے شعوری ادراک میں کسی خاص واقعہ، وقوعے یا حادثے کا ارتسام بھی ہو لیکن ایسے سبھی ممکنہ بلکہ اغلب وقوعوں کا اخراج، انحرافی بدل، کے اصول پر دال ہوتا ہے۔ شاعری کسی ایک یا کئی ایک اہم یا نمائندہ واقعات کی تاثر پذیری کا انعکاس نہیں ہوتی ہاں اس کا ظلال Projective Presentability کی حد تک تجرید یا مظہر کے طور پر شعری بافت کی نوعیت متعین کرنے میں اہمیت ہے۔

روشن روشن آنکھ بجھی' آواز نہ دے
مشکل سے یہ رات کٹی آواز نہ دے

روشن روشن آنکھ جہاں لبڈوئی ارتکاز پر دال ہے وہیں اسے کسی سابقہ وقوعے

یا گزرے ہوئے واقعہ کے انسلاک کا اظلال قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں اور اسی طرح سے "پانی پہ لکھی جانے والی روشنی کی آیتوں" کو کسی تلازم کے طور پر قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں محسوس ہوتا۔

ہم نے ہی پانی پہ لکھیں روشنی کی آیتیں
ہم نے ہی روشن کئے ہر شب لبِ دریا چراغ

☆

پھر آیتِ تاریک اچانک ہوئی نازل
پھر کوئی چراغِ سفرِ شوق بجھا ہے

آیت تاریک کا نزول جب "چراغ سفرِ شوق بجھے" پر انجام کو پہنچے تو ایک ذاتی ایتلاف سے انکار کی گنجائش کم ہی رہتی ہے۔ لیکن ادب کی تنقیدی بازدید یا دریافت ذاتی واقعات یا وقوعوں کے نفسیاتی مطالعے کے مقصد سے نہیں کی جاتی بلکہ ادبی کلیات اور اسلوبی حوالے سے رفعت اور جمال کے فنی اغلبات کی دریافت یا بازدید ہوتی ہے۔ "آیتِ تاریک" "چراغِ سفرِ شوق" "پانی پہ روشنی کی آیتوں کا تحریر کرنا" یا لبِ دریا چراغ" کے منصبی ماخذ کی نفسیاتی حوالے کی بجائے شاعرانہ حسن کے جمالی اغلب کو گرفت میں لینا ہی تلاش اور تنقید کا کام ہے اور اس حوالے سے راز کے ہاں شاعرانہ حسن میں حروف ربط کی اہمیت قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کے ہاں حروفِ ربط کا استعمال ایک لبڑ ونل عمل ہے۔

راز کے ہاں علامات کا اپنی یا کسی یا کئی توصیفی حالتوں سے نسبت، یا اس طرح کے کسی یا کئی مناصب (Functions) کی ادائیگی کو منعکس کرنے کے عمل کی تکمیل کیلئے حروفِ ربط کا استعمال اس کی اسلوبی دروبست میں مشمول ہے۔ مثلاً "اک لمس ہے کہ معرفتِ قربتِ سیاہ" تصویرِ صدا، کوچہ اسرار، خانہ ظلمت، سایۂ شاداب کی

ٹھنڈک، جلوہ امکاں کی خوشبو، کرۂ تاریک، حرفِ جنوں کا غبار، نامہ اعمالِ سیاہ، گردِ سفر تاب، مرگ زارِ ہو، سلسلہ شعلہ زار، صدا وصوت کا دریا، دشتِ ظلمات، چراغِ سایۂ نخلِ غبار، آیتِ تقویمِ شجر، صفحۂ تاریکیِ سکوت، شہرِ چشم، سیلِ گم گشتگی، دشتِ بے چہرگی، چراغِ سفرِ شوق، ایسی مثالوں سے توؔ راز کا کلام بھرا پڑا ہے۔

بہرحال ذاتی واقعات یا کوئی وقوعہ یا حادثے کا شاعر کے حافظے کا ایک حصہ ہونے نہ ہونے سے شاعرانہ اغلبیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ شاعری شاعر کے کسی ذاتی تجربے کی کلام موزوں میں کھتونی یا اندراجات کا طومار نہیں ہوتی۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر کسی واردات یا تجربے سے گزرا ہی نہ ہو۔ شاعری کسی ایسے اغلب تجربہ اولیٰ کا تلازم ہوسکتی ہے جو ایک حسی پیکر کی طرح ہر تجربے میں بنیادی آرکی ٹائپ کی طرح موجود ہو۔ گویا تمام تجربات اور مظاہر یعنی سیاہ وحشتوں کے انبوہ میں جو غیر متغیر مشترکہ عنصر، آرکی ٹائپ یا غیر متغیر شیت Thingness رہے جسے ہم راز کا شاعرانہ کلیہ Universal بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ اک کلیت ہے اور یہی کلیت شعلہ شعلہ جلوہ امکاں کی صورت میں آشکارا ہے۔ یہ "وہ اک" کوئی واقعہ یا وقوعہ نہیں" وہی وہ اک" اوسط واقعیت یا اس کا کل اور اس کا انعکاس ہے۔

دراصل یہ دوسرے سبھی ممکنہ بلکہ اغلب وقوعوں کا اخراج، انحرافی بدل کے اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا سر چشمہ مادر بطنی کے بجائے مادر خواہی ہے۔

سوکھے ہوئے خوابوں کا شجر لبڈو کے مظہر اور جنسی توانائیوں کی تجرید کا امکان اظہار ہے۔ اس سوکھے ہوئے یعنی دروغِ بلند آواز کی طرح پس رائیگاں قوتوں کی داخلی دنیا لبڈو کے مظہر اور جنسی تکشیف و تجرید کی مناسب ترسیل ہے۔ اس کی نغمہ سرائی دراصل اڈ (Id) کی نمایاتی اور شکل پزیری ہے۔ یہ بنیادی مافیہ اس طرح کے اشعار سے حاصلِ اظلال ہے۔

دودِ سکوت سلسلہ ٔ شعلہ زار ہوں
یعنی صدا و صوت کے دریا کے پار ہوں

☆

اک پیکر ِشعاع مجھے تحفتًا ملا
شب رنگ خواہشات کے سایوں کے درمیاں

☆

سفر ہے کہ کوئی معجزہ ' کھلتا ہی نہیں
دور تک ساتھ مرے سنگ و شجر آئے ہیں

☆

آوارہ سیاہ دشت میں تصویر صدا ہے
سوکھے ہوئے خوابوں کا شجر نغمہ سرا ہے

☆

پھر معنی و مفہوم کو الفاظ ملے ہیں
پھر شہرِ خوشی میں عجب حشر بپا ہے

گو رآز کے شعری وقوف یا حیثیت کے سلسلے میں کسی واحد ٹھوس واقع کا حوالہ غیر متغیریت کی نفی ہوگی۔ بہر حال ایسا کوئی واقعہ یا وقوعہ اگر ان کی زندگی سے جڑا بھی ہوتو اس کی کوئی الگ یا علاحدہ اہمیت، سلسلہ شعلہ زار، سب رنگ خواہشات کے سائے ،آوارہ سیاہ دشت کے حوالے سے نہیں بنتی۔ شاید اسلئے کہ راز ہر بات پر اپنی نرگسیت کو فائق سمجھنے کی نفسیات کا خوگر ہے یہاں تک کہ وہ اپنی نرگسیت کے اس استغراق میں اورلبڈو کی ترنگوں اور محویت میں مگن گوشت پوست کے ایک واقعی محبوب کے خوابوں کا شریک بننے کا بھی روادار نہیں۔

اپنے خواب نرالے اپنے پاس ہی رکھ
تیری یاد میں گم ہوں ابھی آواز نہ دے

دیکھنے کی بات ہے کہ یہاں نرگسیت اور سایہ زنی ہر شے پہ فائق ہے کیونکہ ۔

پھر ابر کے ملبوس میں بجلی اتر آئی
پھر خانۂ ظلمت میں اجالا سا ہوا ہے

ابر کے ملبوس میں تقلیب کی ایک تحت فضا پائی جاتی ہے۔ اہمیت تو خانہ ظلمت کو ہے اور پھر متلازم ہے جو کسی وقوعے یا واقع پر دال ہے۔ ابر کے ملبوس کی علامتی در و بست میں بصری اور لمسی دونوں حسیات کا تحرک ہے۔ ابر کے ملبوس اور خانہ ظلمت کو ایک قنوطی تعبیر کے حوالے سے بھی قبول کیا جاتا ہے ان کی تخلیقی بازآید کی نرگسی سایہ زنی محتاجِ ثبوت نہیں۔

راز کے ہاں صدا و صوت، بصری، لمسی یا سمعی معاملت کی کسی ماسبق معنی خیز دلالت سے نہیں۔ ان کے ارتسامات کے مجرد تلازمات کی تنویریں اور برقائے اثرات رازؔ کے ڈکشن کی نوعیت متعین کرتی ہیں۔ صدا، صوت، وہ اک شب وصال، تصویرِ صدا، چشمہ ابلنے کی صدا، سب کسی جسمی (نہ کہ جسمانی) یا لحمی یا ارضی حوالے کی بجائے، صوت و صدا کے دریا کے پار ہوں، پر دلالت کرتے ہیں۔ چوسنے کی آواز کیلئے صدا اور بچپن میں ماں کی نسبت سے پیدا ہونے والی آوازوں کیلئے صوت کے سمعی ایتلافات، یہاں آواز ایک بازگشت ہے۔ نرگسیت کی بازآئید، یہ مادر خواہی کی تجرید کا سلسلہ شعلہ زار بھی ہے۔

اس سلسلے میں رازؔ کی بندشوں کا مطالعہ کارآمد ہوسکتا ہے۔ رازؔ کے ہاں ہر لفظ کے اطلاقی رابطوں اور تقلیبیت پر مشتمل ترکیبات سے ایک قابل امتیاز وضع اور عمومی نمونہ ابھرتا ہے۔ اس کے ہاں الفاظ کے انتخاب اور ترتیب کے پس پردہ معرفت

قربت سیاہ اور، شعلہ شعلہ جلوہ امکاں، یا حسرت سیاہ، سے پیدا ہونے والی حیثیت محض ایک لسانی عمل نہیں لبڈو کے خروش وتموج کا دائم حضور بھی ہے اور وجود کا آشوب بھی۔ اس کے ہاں الفاظ کے استعمال میں ایک اغلب راستی، تاکید اور تفریق وامتیاز سے پیدا ہونے والی ندرت، اس شعری جمالیات کا ماخذ ہے۔

مخفی سیاہ خواہشات، یا شبرنگ خواہشات کا ایک تموج ہے کہ لہروں سے سطح پر ایک وضع Pattern ابھرتی ہے اور اس طرح سے عکس بینی عمل کے انداز کی اسلوبی بوقلمونی ان کے شعری مزاج اور امتیاز پر منتج ہوتی ہے۔ کوچۂ اسرار، شہر کے سائے، ابر کے ملبوس میں بجلی، نخلِ نظر تاب، چشمہ ابلنے کی صدا، نخلِ شب، مقدس ظلمتیں، رگ زارِ ہو، معصوم ظلمت، برق و بارانِ سیرِ چشم، حافظ کا منظر، سیاہ شعاعیں، پُراسرار سی گلی، شب رنگ خواہشات وغیرہ۔

رازؔ کے ہاں کلیدی اہمیت کی علامات، پیکر اور تصاویر گو عصری ادبی روایات کی طرف متوجہ کرتی ہیں لیکن معروضات اور فعلیات کو اظہار و ترسیل کے واسطوں کی صورت میں برتنا اس کا ایک ذاتی عمل نظر آتا ہے۔ ان کے پسِ پردہ جو بارداریت ہے وہ دراصل ان کی نفسیاتی گرہوں خاص کر لبڈو کے تلاطم اور اڈِ (Id) کی ترنگوں کے ضبط سے پیدا ہونے والی تازہ دمی کی دین ہے اور اسی سے ان کی ہر بندش اور لفظ علامت، پیکر یا تصویر، قوت، شناخت اور بازآید کی تخلیقی تجدید حاصل کر لیتی ہے۔ اس طرح سے ان کی جنسی توانائیوں کی تسکین، سیری یا تنقیہ (Catharsis) ہوتا اور یہ ان کی نکاسی کے عمل سے اسے شعری ثقافتی اور تہذیبی عمل میں ڈھال دیتی ہے۔ میں لرزتا ہوں کہ اک منظر ہے ایسا حافظے میں، سایہ شاداب کی ٹھنڈک بدن پر نقش اس کے، بجلیوں کا رقص تھا اک درمیانی فاصلے میں، کوئل کی شاخ جھولتی شاخوں کے درمیان جنگل میں نخلِ نور اُگ آئیں گے جابجا، چشم لالہ میں شبِ حسرت سیاہ اک دشتِ بے

چہر گی چہرہ چہرہ، ان میں منظر، سایہ، بدن، نقش، بجلی، کوئل، شاخ، جنگل، نخل، نور، چشم، لالہ شب، چہرہ، خارجی، معروضات ہیں لیکن شاعر کا......ارادی Intentionality ان خارجی معروضات کو ایک طرح کی نفسیاتی ہیت بدلی اور مسخ شدنی Metamorhphosis گزار کر وہی کچھ بناتا ہے۔ اس کی لاشعوری حالت، جس کی متقاضی ہو۔ ورنہ بدن، سایہ، بجلی، شاخ، جنگل، نخل، لالہ، سب بطور خارجی معروضات، لسانی عوامل سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن نئ ترتیب بندی اور تقلیب کے عمل سے شاعر نے ان کو اظہار کی نئ وضعوں میں بدل دیا ہے اور اس کی لبڈونل Libidonal تحریکیں یا دبازت، ان کی ترکیب بدلی میں اہم ہیں جس سے ان میں انحصاریت کی بجائے انحرافی جھکاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

راز کی نرگسیت طرح دار اس گومگو کے مرکز پر متمکن ہے جو کسی بھی فنکار کو عظیم بنا سکتی ہے۔ ایک جانب سے ان کے ہاں زبان لاشعوری قوتوں اور گرہوں اور تخلیقی ترسیل کے مابین ایک پل کا کام دیتی ہے اور دوسری جانب سے اس کی شخصیت کے افقی اور عمودی گومگو کا اصراف بناتا رہے۔ گپھا، دشتِ ظلمات، دشتِ سیاہ، آیتِ تاریک، جلوہ گہہ، وحشتِ سیاہ، دودِ خیال میں جو ایک طرح کی نہفتہ دوئی پائی جاتی ہے، اسی افقی اور عمودی مجادلے اور گومگو کا انعکاس ہے۔ گپھا یا غار کے ساتھ ٹھوس لمسی رابطے کا احساس نیم تاریکی میں وہم ادراک آفرین کی کیفیات اور ان کی بصری بازآید اپنے داخل کے ہلکورے لیتے اندھیرے سے رابطے کا خوف مادر خواہی کے فریب یقین Delusion سے وابستہ ہے۔ اسی طرح سے سیاہ، شب، تاریک، ابر، ظلمت، میں رنگوں کی بصری حرکات کے امتناع سے اسی گومگو کا جبر اور عندیہ ملتا ہے جو۔

پھر آیتِ تاریک اچانک ہوئی نازل
پھر کوئی چراغِ سفر شوق بجھا ہے

☆

وہ سفر تھا کہ کوئی معجزہ کھلتا ہی نہیں
دور تک ساتھ مرے سنگ و شجر آئے تھے

☆

پھیلی ہے راتوں رات عجب ابتری سیاہ
گرتے ہی آنگنوں میں ہوئی برف بھی سیاہ

☆

ہر طرف اس شہر میں اک سنگ باری ہو رہی ہے
میں کہ ہوں زد میں بھی اور محفوظ بھی اک آئینے میں

اس آئینے میں رازؔ کی افقی شخصیت متناعات یعنی آئینہ تاریک اور سنگ باری کی زد پر ہے ۔ کیونکہ اس گپھا کے اندرونی دنیا پُر اسرار نہفتہ اور دبی ہوئی شب رنگ خواہشات سے آباد ہے ۔

میرے نہ ہونے کا ہے جشن گھر میں
سایوں سے آباد ہے گوشہ گوشہ

کھو جانا اور استغراق اس عمودی میلان کو برانگیختہ کرتا ہے جو رازؔ کو تخلیق و اختراع کی بلندیوں تک پہنچا سکتا ہے۔ اس دوحرکتیت سے رازؔ کا شاعرانہ تشخص خاص کر کشمیری شاعری کا تشخص متعین ہو جاتا ہے ۔ اس میں انائے برتر Super (Ego) کی تعزیری نگاہ عمودی رجحان کو ایک طہارت آگاہ رفعت سے ہم دوش کرتی ہے۔ چنانچہ ۔

برق و بارانِ سیاہ چشم کا جادو تھا عجب
ہاتھ باندھے ہوئے سب معجزہ گر آئے تھے

☆

اک چشم ہے کہ جلوہ گہہِ وحشت سیاہ
بینائی ہے کہ تیرگی نکہت سیاہ

☆

میں ہوں اگر مفکرِ اعظم تو اے خدا
اک سایہ ہے سیاہ شعاعوں کے درمیاں

اس جلوہ گہہِ وحشتِ سیاہ میں بھی شعاعوں کے درمیان جس سائے کا ذکر ہے اسے خوابیدگی' جنس کے عرصہ تکمیل اور تشکیل کے دور کی لاجنس جنسی توانائیوں سے تعبیر کرنے کا کوئی مفر نہیں۔ چنانچہ رازؔ کی اسی عرصہ خوابیدگی جنس Latency میں وہ پکڑ اور نفسیاتی حراست معرضِ وجود میں آئی ہے جواب کثریت اور تنوع پسندی کے درمیان انحرافی نکاسی کی راہ نکلتی اور سیری پاتی ہے۔

وہ سفر تھا کہ کوئی معجزہ کھلتا ہی نہیں!
دور تک ساتھ میرے سنگ و شجر آئے تھے

☆☆☆

☆......شبیر احمد شبیرؔ

رفیق رازؔ: دیارِ سکوت کا صاحبِ طرز شاعر

رمز و ایما کی تحدید، عروضی اوزان کی تقیید اور ضرورت کے مواقع پر حذفیہ ایجاز کے اختصار سے عبارت شعری اُسلوب کو معانی کی وُسعت اور مطالب کی جامعیت پر محیط کرنا شاعری کی معراج قرار پائی۔ انتقادی تناظر میں اِس سہ وصفی کسوٹی پر کھرا اُترنے کی صلاحیت گنتی کے شعرا ہی نمایاں کرتے ہیں۔ بایں وجہ کہ اس طرح کی اُسلوب سازی فنِ شاعری سے متعلق لوازمات کی آشنائی مشروط ہے۔

وادیِ کشمیر کے جن شعرا کی طبع آزمائی اِن تین اوصاف سے آراستہ ہے اُن میں رفیق رازؔ کئی لحاظ سے انفرادی شان کے حامل ہیں۔ رفیق رازؔ کے چشمہ نما خامۂ تخیّل سے پھوٹنے والی روشنائی کشمیری زبان کے متوازی اُردو زبان کے گلشنِ سخن کی آبیاری بھی کرتی رہی۔ دولسانی شاعرانہ ہُنر نے رفیق رازؔ کو دونوں زبانوں کے ادبی حلقوں میں خاص مقام عطا کیا۔ مادری زبان میں مورثی تناظر میں زبان، بیان اور الفاظ پر گرفت کے پیشِ نظر رفیق رازؔ کی شاعرانہ مہارت کا اعتراف استعجابی نہ سہی مگر اُردو ادب میں رازؔ کی سخنورانہ صلاحیت کا مُسلّم ہونا اُن کا طُرّہ دستار ہے۔ اُردو کے شعری ادب میں رفیق رازؔ کی شاعرانہ ہُنر مندی کا واضح عندیہ مشہورِ دہر اور فن شناس نقّاد شمس الرحمٰن فاروقی کی ادارت میں چھپنے والے ''شب خون'' میں رازؔ کی متعدد غزلوں کی اشاعت سے ملتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا شُمار برصغیر کے اُن ذی رتبہ

ناقدین میں ہوتا ہے۔ رفیق رازؔ کی تخلیقی گہرائیوں سے یکے بعد دیگرے ''انہار'' ''مشراق'' اور ''نخلِ آب'' نام سے تین معانی آفرین شعری مجموعات منظر عام پر آئے۔ فاروقی صاحب کی تحریک بخش حوصلہ دِہی کا تذکرہ رفیق رازؔ نے ''مشراق'' نامی شعری مجموعے میں ''حرفِ چند'' عنوان کے تحت یوں کیا ہے:

> ''میں بنیادی طور کشمیری زبان کا شاعر ہوں۔ گو میں اُردو زبان میں بھی طبع آزمائی شروع سے ہی کرتا رہا لیکن میری تمام تر توجہ کشمیری شاعری پر ہی مرکوز تھی۔ اُردو میں شعر گوئی کا سلسلہ جاری نہ رکھتا اگر جناب شمس الرّحمٰن فاروقی کی بے پناہ شفقت اور حوصلہ افزائی مجھے نصیب نہ ہوتی۔ انہوں نے میری غزلوں کو ازراہِ شفقت مُسلسل اہتمام کے ساتھ ''شب خون'' میں شائع فرما کر مُجھے اُردو کے ساتھ باندھے رکھا۔ یہ اُن کی بے پناہ عنایتوں کا نتیجہ ہے کہ میں آج اُردو زبان میں زیادہ اور کشمیری میں بہت کم شاعری کرتا ہوں''۔

شمس الرّحمٰن فاروقی کی اس بے پناہ شفقت اور مخلصانہ عنایت کے شامل حال ہونے کا استفادہ رفیق رازؔ کی غزلیہ شاعری میں جابجا دیدنی ہے۔ اِس استفادے نے رازؔ کے اشعار میں جاذبِ نظر نکھار پیدا کیا ہے۔ بدیہی امر ہے کہ ''شب خون'' سے رابطے کی بدولت فاروقی اور رازؔ صاحبان کے درمیان عروضی اوزان سے ماورا کئی ایسے اُسلوبی لوازمات کے تعلّق سے بھی مشاورت کا سلسلہ بندھا ہوگا جن کی باریکیوں تک عام شعرا کا دھیان نہیں جاتا۔ علم بیان کی گونا گوں اصلاحات اور اُن کے اطلاق و استعمال سے فاروقی کے ناقدانہ ذہن کی آشنائی سے بھی رازؔ کا مستفید ہونا ظاہر و باہر ہے۔ یہ اسی مشاورتی تسلسل کی دین ہے کہ رفیق رازؔ کی شاعرانہ تخلیقات خوش بیانی اور معانی آفرینی کے ساتھ ساتھ کئی دیگر بیانی محاسن کی بھی آئینہ دار ہیں۔ رفیق رازؔ کی شاعری ابہام سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ ابہامی اُسلوب

شاعری کا حُسن مانا جاتا ہے۔مگر حد سے زیادہ ابہام جس سے معانی کی ترسیل متاثر ہو شاعری کے لئے قبیح گردانا گیا ہے۔ اِس فنی اصول کی پاسداری میں رفیق رازؔ ابہام میں اعتدال کے روادار نظر آتے ہیں۔ رفیق رازؔ ابہام کی شدت کو جذبات کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔اُن کے خیال میں جذبات کی رو میں ٹھہراؤ آنے پر اِبہام کا پارہ بھی اُتر کر معتدل ہو جاتا ہے۔

اِک ذرا ٹھہراؤ سا جذبات میں اب آ گیا ہے
اب کہاں شعروں میں وہ اِبہام کی شِدت

وغیرہ علمِ معانی کی ایک اصلاح ''اِیہام'' سے موسوم ہے۔اِس اصطلاح کا دوسرا نام ''تورِیہ'' بھی ہے۔ایہام نامی اِس اصطلاح سے ایسا لفظ مُراد ہے جو دو معانی کا حامِل ہو۔ایک معنی قریب یعنی جس کے لیے لفظ وضع ہوا ہو۔دوسرا معنی بعید یعنی جو لفظ کو مجاز کی طرف لے جاتا ہے۔شاعرانہ عمل سے شعری متن میں لطافت کے متوازی معنوی وسعت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس ایہامی ذو معنویت کی ایک صورت حقیقی اور ایک صورتِ مصنوعی ہوتی ہے۔ایہام کی حقیقی صورت لغت کی رُو سے ہوتی ہے جبکہ مصنوعی صورت شاعر کی صناعت کے عمل سے وجود پاتی ہے۔مصنوعی صورت کا ایہام پیدا کرنا زبان و بیان پر شاعر کی کمال قدرت وگرفت اور اُس کے زاویۂ فکر کی کُشادگی کی غمازی کرتا ہے۔ اِس تمہید میں ایہام کا حامل یہ شعر رفیق رازؔ کی زبان شناسی اور فکری وسعت کی کامِل دلیل پیش کرتا ہے۔

ایک صُراحی بولی قُلقل اللہ ہُو
پھر کیا تھا ہر سمت مچا گُل اللہ ہُو
(نخلِ آب)

شعر کے مصرعِ اوّل میں برتے ہوئے لفظ ''قُلقل'' کی ایہامی مصنوعیت

توجّہ طلب ہے۔''قُلقُل'' کو حروف کی پیوستگی سے پڑھنے پر صُراحی سے پانی کسی یا اور سیال چیز کے خارِج ہونے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آواز مُراد ہے۔حروف کو انفصالی صورت میں پڑھنے پر''قُل قُل'' عربی گرامر کے مطابق فعلِ امر بن جاتا ہے۔یعنی کہو کہو...... چونکہ ''قُل قُل'' کی تکرار ہے اسلئے امر میں تاکید وارد ہوتی ہے۔ گویا مصنوعی ایہام کی رُو سے صُراحی دیگر جُملہ مخلوقات کو اللہ ہُو پڑھنے کی تاکید کرتی ہے۔اس تاکیدی حکم کی تعمیل میں جملہ مخلوقات کے اللہ ہُو کا وِرد کرنے سے چاروں اطراف گونج اُٹھتے ہیں۔شعر کا دوسرا مصرع پہلے کے مصنوعی ایہام کو ثابت کرتا ہے۔

عصری گردش میں نمودار ہونے والے واقعات و واردات کی اثر پذیری کے تئیں رفیق رآز کا شاعرانہ ذہن نہایت حسّاسیت کا مظہر نظر آتا ہے۔اِس تناظر میں رآز کی وہ بلند ہمتی قابلِ تعریف اور قابلِ تقلید ہے جس کی رو سے اُنہوں نے وقتی حوادث و واردات کو اپنے تخلیقی عمل پر حاوی کرنے کے بجائے ان کے تاثیری عمل کو شاعرانہ اُسلوب میں تحلیل کرنے کا ہُنر مندانہ طرز عیاں کیا۔دوسری ادا سے یوں کہا جائے رآز نے عصری گردش سے ابھرنے والے تلخ اور ہمّت پیما واقعات و واردات کی منفیات کو مثبت بیانی سانچے میں ڈھال کر اپنے تخلیقی عمل کا جُز بنا دیا۔رفیق رآز کے اس ہنر مندانہ طرزِ عمل کی لطیف جھلک اُن کے اشعار میں عیاں ہے۔

اے ہوائے دِیارِ درد و ملال
مرحبا مرحبا ،تعال تعال

لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں ایں ہوں میں دردِ عظیم کا

تضمین سے عبارت پہلے شعر کا دوسرا مصرع حافظؔ شیرازی سے عاریتاً لے کر عصری واقعات و واردات سے مُلحق درد و ملال کو اپنے وجود میں جاگزین ہونے کی

دعوت دے کے رفیق رآز انتہا درجے کی عالی ہمّتی کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسرے شعر کے اُسلوبی ظرف میں وقت سے ملے دردِ عظیم امانت سمجھ کر وقت کو لوٹا رہے ہیں۔ وقت کے بسیار معانی میں ایک معنی ہے''زندگی''۔ اِس معنوی تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ رفیق رآز اپنے دردِ عظیم کو اپنی ہی زندگی کے سپرد کر رہے ہیں۔ گویا از دِل خیزد بر دِل ریزد ضرب المثل رآز پر صادق آتی ہے۔

رفیق راز کا درکِ احساس محض ذاتی درد و کرب تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ گرد و پیش کی کربنا کی پر بھی محیط ہے۔ کہیں آس پاس کی کربنا کی رآز کے اشعار میں صراحتاً نمایاں ہے تو کہیں علائم واستعارات کے لطیف پردوں میں پوشیدگی کا عندیہ دیتی ہے۔

کشمیر کے اُردو شعرا میں رفیق رآز کا انفرادی شاعرانہ وصف یہ بھی ہے کہ جلوت کی ہنگامہ خیز ہواؤں سے خلوت کا چراغ بجھانا نہیں چاہتے۔ رآز کے خیال کی اَساس یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نزولِ شعر کی شمع گوشۂ خلوت میں ہی فروزاں ہوتی ہے۔ اپنی خلوت پسندی کا واضح عندیہ رفیق رآز اِس شعر میں دیتے ہیں۔

بجھا چراغ ہواؤں کا سامنا کرے
بہت اُداس ہُوا ہوں دریچہ وا کرکے

اپنے شاعرانہ تجربات اور تفریدی مُشاہدات کے آئینے میں رفیق رآز خلوت پسندی کو عرفان شناسی کا وسیلہ گردانتے ہیں۔

تنہائیوں نے صاحبِ عرفان کیا تو پھر
اسرارِ ذات مجھ پہ اچانک کھلا تو پھر

شعر کا اُسلوبی سیاق وسباق مُشار ہے کہ خلوت نشینی نے رآز پر اُن کی ذات میں پیوست راز ہا نمایاں کرکے اُن کو اپنے وجود کے مقصد سے آگاہ کیا ہے۔ شعر کی

ردیف ''تو پھر'' مقصد آ گہی کی وسعتوں کو حدِ نہایت تک مستزاد کرتا ہے۔

خلوت پسندی اور سکوت لازِم وملزوم ہیں۔ اس التزامی تناظُر میں رفیق رازؔ کی خلوت پسندی سکوت سے کیونکر استثنا پا سکتی ہے۔ رفیق رازؔ کی سکون پروری کا یہ عالم ہے کہ وہ نہ صرف سکوت کو صدا سے آلُودہ کرنے سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ اُن کے نزدیک سکون کو مقدس ترین زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ سکُوت کی رفعت و فضیلت بیان کرتے ہوئے رفیق رازؔ کہتے ہیں:

افلاک سے ارفع ہے مرا حُجرۂ سکوت — پاتی یہاں ہے بار فقط اِک ندائے غیب

سُلطانِ لازماں بھی ہے یہ لمحۂ سکُوت — سردار یہ زمانۂ دوراں ہی کا نہیں

دیوار کی طرح ہے یہ دروازۂ سکُوت — شورِ سگانِ دہر سے کہدو کہ لوٹ جائے

میری پناہ گاہ یہی عرصۂ سکُوت — پہنائیوں میں اس کی ہیں دونوں جہان گُم

کئی اشعار میں رفیق رازؔ کی شاعرانہ ذات کی تجسیمی سطح پر سکوت کا استعارہ ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

وہ تیری کُن کی صدا گونجنے سے پہلے ہی
محیط دشت وجبل پر سکُوت سا تھا میں

گفتگو پر سکُوت کی برتری کے تعلّق سے رفیق رازؔ کا یہ شعر فکر ونظر کا محور بن جاتا ہے۔

لکھوں تو حرف وصدا کو لکھوں میں اشرفیاں
مگر سکُوت کو اِک گنجِ بے قیاس لکھوں

اس شعر کے فکر انگیز متن سے مجھے ایک عربی شعر یاد آیا جس کا متن ہے۔

''اِن کان کلامك من فقته یانفس — فان السکوت مِن ذهب '' ......؟

(یعنی اے میرے نفس اگر تیری گفتگو چاندی ہے تو سکُوت بے شک سونا ہے)۔

یہ عربی شعر اِس بات کا نمایاں عندیہ ہے کہ گفتگو کی نسبت سکُوت کو انمول اثاثہ ماننے میں رفیق راؔز تنہا نہیں ہیں۔ سکوت کے تعلق سے رفیق راؔز کے ایک شعر میں نظر آنے والا لفظی رِعایت کا حُسن اُن کی فن شناسی کا غمّاز ہے۔

یہ ہُونٹ ہو گئے میرے پتھر رفیق راز
اب ٹوٹتا ہے دیکھئے کب روزۂ سکُوت

شعر کا مصرعِ ثانی یوں بھی لکھا جا سکتا تھا:۔

''اب کُھل سکے گا دیکھئے کب روزۂ سکُوت''

غیر اختیاری یعنی روزہ دار کا اضطراری عمل ہے۔ مگر فنی سطح پر رفیق راؔز کے حساس شاعرانہ تخیّل نے بھانپ لیا کہ پہلے مصرع میں ہُونٹوں کی تشبیہہ پتھر سے ہے۔ ظاہر ہے کہ پتھر سے کھلنے کا عمل غیر متعلق ہے۔ پتھر ٹوٹ ہی سکتا ہے، کُھل نہیں سکتا۔ اِس تناسُب سے راؔز نے کمال فنکارانہ مہارت سے مصرعِ ثانی میں ''روزۂ سکُوت'' کے کھلنے کے بجائے ''روزۂ سکُوت ٹوٹنے'' کا محاورہ استعمال کیا۔ یوں دونوں مصاریع کے متن میں محاوراتی مناسبت پیدا ہو کر شعر فصیح بن گیا۔

رفیق راؔز کا فنکارانہ عمل یہ ہے کہ وہ سکوت کی گہرائیوں کی غواصی سے اُسلُوب اور اِظہارِ خیال کے موتی نکالتے ہیں۔ سکوت رفیق راؔز کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اِس بارے میں رفیق راؔز کا یہ شعر اُن کے دعویٰ کا ترجمان ہے۔

سکوت ہے تو ہمارا وسیلۂ اِظہار
پہ کھولتے ہیں زبان بھی کبھی کبھی ہم لوگ

یعنی راؔز کے اظہار کی اصل اساس سے سکوت ہی ہے تاہم ضرورت کے مواقع پر یہ سکُوت صوتی صورت میں بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ سکُوت سے اظہار کُریدنے کا عندیہ رفیق راؔز اس شعر میں بھی دیتے ہیں۔

نہیں ہے شورِ زیست سے کوئی مطلب
مری تو شاعری کا مواد سنّاٹا

سکوت کے اعماق سے خیالات کے اظہار کا اُسلوب نکالنے کے اِس حیران کُن عمل کے تناظُر میں رفیق رازؔ کو دیارِ سکُوت کا صاحب طرز شاعر بھی کہا جاسکتا ہے۔ چونکہ سکُوت سے اظہار اُبھارنے کا عمل مبالغانہ ہے اس لئے جس سکُوت کے دیار میں خلوت نشین ہوکر رفیق رازؔ شاعری کرتے ہیں اُس کی جغرافیائی حدود و جہات کا تعیّن اور پیمائش عقل کے پیمانوں سے نہیں ہوسکتی۔ معقولات دائرے سے باہر اِس عالمِ سکُوت کے جملہ عناصر اور کیفیات کو محسوسات سے ہی بھانپا اور آنکا جاسکتا ہے۔ رفیق رازؔ کے شعری اُسلوب کا استعاری اور مجازی اعجاز بھی لطیف ہونے کی خوبی عیاں کرتا ہے۔ یہ اِستعاری اعجاز کہیں تصریحی کہیں مکنیہ کہیں اصلیہ کہیں تبعیہ اور کہیں تخیئلیہ صورتوں سے عبارت ہے۔ اصلیہ صورت میں رفیق رازؔ کے شعری اسلوب میں استعارے کی صورت یوں ہے۔

سر پر تنا ہوا ہے وہ خیمہ رفیق راز
محتاج ہی نہیں جو کسی بھی طناب کا

شعری متن میں خیمہ سے ظاہری خیمہ مُراد لینے میں دوسرے مصرع کا متن ''محتاج ہی نہیں جو کسی طناب کا'' مانع ہے۔ کیونکہ ظاہری خیمہ طنابوں کی احتیاج سے بے نیاز ہو ہی نہیں سکتا۔ پہلے مصرع میں خیمے کا تنا ہوا ہونا مفعولی صورت ہے۔ اِس تمہید میں شاعر کا تخیّل مجازِ عقلی کی جانب گیا ہے۔ یعنی شاعر اُس عظیم قادرِ مُطلق کی طرف اشارہ کرتا ہے جس نے خیمہ تانا ہے۔ اِس مجازی تناظُر سے واضح ہوا کہ رازؔ بے طناب خیمہ سے آسمان مُراد لیتے ہیں۔ گویا مجازِ عقلی کی معیّت میں ''خیمہ'' استعارۂ اصلیہ بن گیا۔ اِس استعارانہ اعجاز نے شعر کی معنوی وسعتوں کو لامحدود کردیا۔ تفصیل

اِس استعاری اجمال کی یوُں ہوگی کی شاعر خیمہ نُما آسمان کے نیچے ارتقا پانے والے تخلیقی ارتقا اور معاملات کی انجام پذیری کے تعلق سے اُس قادرِ مطلق کے کمالِ قدرت کی طرف دھیان مبذول کرنا چاہتا ہے جس کا کوئی بھی عمل ظاہری اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ اِس استعاری اُسلوب کی تائید رآز کے اُس شعر سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ اپنی ذات سے زمین کے خائف ہونے کی علّت افلاک سے اپنے ربط کو قرار دیتے ہیں۔

مجھ سے زمین خوف زدہ ہے رفیق
یہ جانتی ہے ربط ہے افلاک سے مجھے

رآز کے اشعار میں استعارۂ تخئیلیہ کے خوشنما جلوے بھی نمایاں ہیں۔ اِس تناظر میں یہ دو اشعار قابلِ توجہ ہیں۔

مت کر طلوع آنکھ کے خورشید کو ابھی
محوِ سخن ہیں اوس کے قطرے گلاب سے
آسماں سر پر اُٹھا تے تھے سنّاٹے
اور دریائے خموشی بھی تھا طُغیانی پر

پہلے شعر میں آنکھ کو خورشید سے مماثل کرکے اوس کے قطروں کے فنا ہوجانے کا سبب گردانا۔ دوسرے مصرع میں اوس کے قطروں کی گلاب سے ہم کلامی ثابت کی۔ ظاہر ہے کہ ذی رُوح نہ ہونے کی وجہ سے اوس کے قطروں کی گلاب سے ہم کلامی خیالی تناظر میں ہی ممکن ہے اور حقیقت سے اِس کا کوئی تعلّق نہیں ہے۔ ایسے میں شعری اُسلوب سے استعارۂ تخئیلیہ کا حُسن آشکار ہوتا ہے۔

دوسرے شعر میں سناٹوں کا آسمان سر پر اُٹھانا جہاں ایک طرف محاورتی صورت عیاں کرتا ہے وہیں دوسری جانب سناٹوں کے سر پر اُٹھانے کا عمل بھی خیالی سطح

پر ہی ممکن ہے۔ اِسی طرح دریائے خموشی کا طغیانی پر ہونا بھی عالمِ خیال سے عبارت ہونے کی بِنا پر استعارۂ تخئیلیہ کا اِظہار ہے۔

مجاز کی اقسام سے مجازِ مُرسل کی کئی صورتیں بھی رفیق راؔز کی شاعری میں دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ راؔز عالمِ اصغر سے موسوم اپنے انسانی وجود کو عالمِ اکبر کا جُز گردان کر اپنے کالبُدِ خاکی کو کائنات کے جملہ عوامِ و عجائبات کا نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اِس شعر کا دوسرا پہلو وحدت الوجودیت کی طرف بھی مُشار ہے۔ شعر یوں ہے۔

اپنے وجود میں جھانک کے میں تو ڈر ہی گیا
جز میں یقیناً رہتا ہے کُل اللہ ہُو

مجازِ مرسل کی دوسری مثال یوں ہے۔

ہو بین گلستان وقفس رابطہ بحال
یعنی صدائے پر ہی کسی آشیاں سے آئے

شعر کے مصرعِ ثانی میں لفظ ''پر'' جُز ہے اور اِس جُز سے کُل کی صورت میں ''پرندہ'' مُراد ہے سبب سے مُسبّب مُراد لینے کے تئیں مجازِ مُرسل کی مثال ہے۔

لے گا تمام دشت کا پہلے یہ جائزہ
فی الحال گشت پر ہے یہ ٹکڑا سحاب کا

سحاب سبب ہے اور اس سے اُترنے والی بارش جس کا دشت کو انتظار ہے مسبّب ہے۔

رفیق راؔز کے غزلیہ اشعار میں تشبیہات کا کہکشانی سِلسلہ نظر آتا ہے۔ ایسے اشعار کا تمثیلی اور تفصیلی تذکرہ چونکہ مضمون کی طوالت کا باعث بنے گا اِس لئے ''تشبیہہ جمع'' کے حُسن سے آراستہ راؔز کے ایک شعر کو مثال کے طور پیش کرتا ہوں۔

آنکھیں عقیق ہائے چمن ہیں کہ دو چراغ
میرا وجود ہے کہ کوئی روضۂ سکوت

شعر کے پہلے مصرع میں بیک وقت آنکھوں کو ''عقیق ہاے چمن'' اور ''دو چراغوں'' سے تشبیہہ دی ہے۔ یعنی مُشبہ ایک ہے اور مشبّہ بہٖ یکے بعد دیگرے دو ہیں۔ اِس تشبیہی صورت کو علمِ بیان میں تشبیہہ جمع سے موسوم کیا گیا ہے۔

مبالغانہ اُسلوب کے حامل رازؔ کے اشعار بھی توجّہ طلب ہیں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں مبالغانہ اُسلوب کے حامل رازؔ کے اشعار بھی توجّہ طلب ہیں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں مبالغہ میں لفظی رعایت کا حُسن بھی جھلکتا ہے۔ اِس تناظُر میں ایک شعر کا متن ملاحظہ ہو۔

مجھ سے کہانی پیاس کی ہوتی نہیں رقم
لکھتا ہوں آب پر میں فقط آب، آب سے

آب پر آب سے آب لکھنا مبالغے کا درجۂ غُلو ہے جو نہ عقل کی رو سے اور نہ ہی عادت کی رُو سے ممکن ہے۔ لفظی رعایت کا فنکارانہ انداز یہ ہے کہ پہلے مصرع میں ''پیاس'' کی شدت دوسرے مصرع میں برتے لفظ ''آب'' سے مناسبت رکھتا ہے۔ اِن دوخوبیوں سے مستزاد ایک اور اسلوبی خوبی اِس شعر سے عبارت لفظاً ''آب'' کی تکرارِ ملیح ہے۔

رازؔ کی شاعری کے بے کراں بحر میں خاکساری اور انکساری کے موتی بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ خاکساری بلند مرتبہ کا وسیلہ بن گئی ہے۔

ملا ہے خاک نشینی سے یہ مقام مجھے
زمین ہے تخت، فلک تاج ہے مرے سر کا

رواں کیا ہے مجھے کن بلندیوں کی طرف
کہ آسمان بھی لگتا ہے سایہ شہ پر کا

رازؔ کا یہ شعر کسی شاعر کے اِس شعر سے توارُدی مماثلت کا حامل ہے۔

پستی سے سربلند ہو اور سرکشی سے پست
اِس راہ کے عجیب نشیب و فراز ہیں

تہذیبی اور اخلاقی اقدار انسانی سماج کا سب سے عظیم سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ کے تلف ہونے کی صورت میں انسانی دُنیا سُرعت سے تباہی کی راہ پر گامزن ہوجاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں تہذیبی اور اخلاقی اقدار کے اسی اتلاف کے احساس نے رازؔ کے درونی شاعر کو مضطرب اور بے قرار کیا۔ رازؔ ان تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی عظمت کا تصور ابھار کر استعاری اُسلوب سے یوں گویا ہوتے ہیں۔

تمام نخل ثمر دار اُکھڑ گئے جڑ سے
یہاں سے موسمِ راحت فزا نے ہجرت کی

اخلاقی اور تہذیبی اقدار کے زوال نے انسانی سماج کو جس آپسی نفرت سے دوچار کیا ہے رازؔ اُس نفرت کا منبع دل کو قرار دیتے ہیں۔

یہ دل کے حکم کی تعمیل ہی تو کرتی ہے
یہ آنکھ دیکھتی ہے ہر کسی کو نفرت سے

رازؔ کا یہ مضمون اُس حدیثِ شریف سے ماخوذ ہے جس میں اِرشاد ہے:

''القلبُ سلطان ُالبدن'' یعنی دِل بدن کے جملہ اعضا کا بادشاہ ہے۔ گویا دِل سے جو حکم ارادے کی صورت میں آنکھ، کان اور دیگر اعضا کو ملتا ہے اُس کی تعمیل کرنا اُن کا شعار و اشتغال ٹھہرتا ہے۔ رفیق رازؔ اپنے اسلوب کا جُداگانہ انداز محسوس کر کے نرگسیت کے حامل بھی نظر آتے ہیں۔ اِس تعلق سے اُن کے غزلیہ اشعار میں کئی مقامات پر شاعرانہ تعلّی نمایاں ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ہمیں وہ سلطنتِ حرف کے شہنشہ ہیں
رفیق رآز ہمارا ہی نام ہے سائیں

☆

تیری غزل پڑھی تو یہ جانا رفیق رآز
پانی کے شور میں ہے روانی کا شور بھی

☆

ہر شہر میں ہے ذکر تمہارا رفیق رآز
دہلی ہو لکھنو ہو کراچی ہو یا کٹک

☆

بحرِ معنی اگر رواں کروں
کم پڑیں گے یہ لفظ کے صحرا

☆

ہمارے شعر میں آباد ہے جہانِ طلسم
ہماری طرز میں اک شان ہے روایت کی

☆

لفظ کی تہہ میں یہ کیسا شور ہے پنہاں
طرز تری ہے رفیق رآز جُدا سی

☆

ہمارا طرزِ بیان ہے الگ جُدا اُسلوب
سخن کے شہر میں کتنے ہیں اجنبی ہم لوگ

رفیق رآز کا اُسلوبی خاکہ تصوف کے رنگوں سے مُزین ہے۔ دسیوں اشعار

میں تصوّف سے عبارت اصطلاحیں اپنے پس منظری اسرار کا خلاصہ پیش کرتی ہیں ۔اِس تعلق سے رفیق رازؔ خود اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رازؔ کرتا ہے زبانِ خامشی سے تو عیاں
صوفیوں کا رنگ چھایا ہے ترے اِظہار پر

رفیق رازؔ کی خیالی ندرت کے محاسن کا مُظاہرہ اُن کے کئی اشعار حدِّ نہایت تک کرتے ہیں۔اِس مظاہرۂ حُسن کا ایک مثالی نمونہ یہ شعر ہے۔

ایک ہی شعلہ تھا اقلیمِ ہوا میں روشن
وہ جو اک جسم تھا فانوسِ قبا میں روشن

ایک غزل کا یہ مطلع بیانی سطح پر کئی انواع کے فنّی محاسن کی آماجگاہ ہے۔اِس شعر میں معنوی ربط بھی ہے اور رعایتِ الفاظ و تراکیب بھی ۔علمِ معانی میں ایک اصلاح ''قصر'' سے موسُوم ہے۔قصر نامی اِس اصطلاح کی دو اقسام ہیں۔ایک حقیقی اور دوسری غیر حقیقی جس کو قصرِ اضافی بھی کہا گیا ہے۔اِس شعر کے تعلّق سے دونوں اقسام کی تفصیل طویل ہوسکتی ہے۔اجمالی سطح پر عیاں ہے کہ اِس شعر میں رازؔ نے قصرِ حقیقی کا حُسن اُجاگر کیا ہے۔جب کسی عبارت یا شعر میں (صرف، یا ہی) جیسے الفاظ آئیں تو استثنائی صورت حدِّ نہایت تک جا پہنچ کر شعریت کو معانی و مطالب کی سیر کراتی ہے۔یہی حدِّ مُنتہا اِس شعر میں اقلیم ہوا کے ایک ہی شعلے کے روشن ہونے سے آشکار ہوئی ہے۔رازؔ کی مُراد یہ ہے کہ صِرف ایک ہی شعلہ ایسا تھا جس کو اقلیم ہوا میں روشن رہنے کا یارا تھا۔قصرِ حقیقی کا اس حُسن کو برقرار رکھتے ہوئے مصرعِ اوّل کی خیال بندی کو مصرعِ ثانی کے مضمون و متن سے مربوط کر کے دونوں مصاریع کو ایک دوسرے کا ترجمان بنانا رازؔ کا دوسرا تخیّلی کارنامہ ہے۔فانوس قبا کو تخیّلی اعجاز سے ترکیب اضافی بنا کر جسم سے منسوب کرنا تیسرا شاعرانہ کرشمہ ہے۔اس کی تکمیلی شرح کرنے پر ایک

کتاب وجود پاسکتی ہے۔

رفیق رازؔ کی ہر غزل میں وقفے وقفے سے بیانی محاسن کا یہی عالم نظر آتا ہے۔ معانی کی کثیر الجہتی ایک جہت کو دوسری جہت پر ترجیح دینے پر آمادہ کرتی ہے۔ ہر جہت بیانی سطح پر دوسری جہت سے واضح ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ ایسے میں حتمی فیصلہ کرنے میں خاصی دشواریاں پیش آتی ہیں کہ دیارِ سکوت کے صاحبِ طرز شاعر رفیق رازؔ کے کس شعر کے کون سے معانی اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

☆۔۔۔شارق عدیل

دیواں ہے مرا گرمیٔ اظہار سے روشن

اردو شاعری میں غزل ایک ایسی دل نواز شعری صنف ہے جسے اپنے حسن پر کل بھی ناز تھا اور آج بھی ہے، اور میرا خیال ہے کہ آنے والے زمانوں میں بھی یہ منظر بدلنے والا نہیں ہے۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ترقی پسند تحریک کے زمانے سے لے کر آج تک بعض ناقدین غزل کی تخلیقی راہوں میں سفر کرنے والے شعراء کی تخلیقی مہارتوں کو مسترد کرنے کی کوشش کرتے آرہے ہیں اور یہ تاثر دینے میں لگے ہیں کہ اس دور میں جو غزل تخلیق کی جارہی ہے، نہ تو اس کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی اس کی کوئی معنویت ہے، جب کہ اس دور میں غزل کا موضوعاتی اور معنوی قافلہ نئی تخلیقی منزلوں کو عبور کرتا ہوا نظر آرہا ہے، لیکن غزل مخالف ناقدین کو یہ صداقت دکھائی ہی نہیں دیتی ہے، تو پھر وہ غزل کے سچّے اور کھرے شعراء کو پڑھنے کی زحمت کیوں گوارہ کریں گے۔ یہ تو بس اپنے ہر خیال کی تائید میں چند بے تکی شعری مثالیں پیش کر کے غزل کی مخالفت میں آواز بلند کرنے کے لئے بے تاب رہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ جب ترقی پسند تحریک کے ناقدین نے غزل کی تخلیقی مخالفت میں اپنی ساری طاقت کو جھونک دیا، تب بھی غزل گو شعرا نے ترقی پسندوں کے ہر الزام کو اپنے تخلیقی عمل سے غلط ثابت کر دیا تھا۔ اس دور میں بھی غزل مخالف ناقدین کی ذہنی آلودگی کو صاف کرنے کے لئے رفیق رازؔ جیسے شاعر موجود ہیں جو غزل کے مزاج، غزل کی لفظیات

اورغزل کی تہہ دار فطرت سے پوری طرح واقف ہیں اور تخلیقی لمحوں میں غزل کے ہر دو مصرعوں کو مفہوم کی ردا اتنی احتیاط سے عطا کرتے ہیں کہ قاری ان کے اسلوب کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ البتہ اس دور میں کچھ ایسے شعرا ضرور ہیں جو غزل کو پوری طرح Modern بنانے کے جنون میں اپنی صلاحیتوں کو برباد کرنے کی ضد پر اڑے ہوئے ہیں جب کہ غزل اپنی فطرت سے کبھی دست بردار ہونے والی نہیں ہے، پھر بھی یہ غزل پر فضول حملہ آور ہونے سے باز نہیں آتے ہیں۔ رفیق رازؔ ایسے جدید شاعر ہیں جو غزل کو اپنی محبوبہ بنا کر اس طرح اُس کی ناز برداری کرتے ہیں کہ وہ ان کی بانہوں میں سمٹ کر خود سپردگی کی شمع کو اس طرح روشن کرتی ہے کہ سارا تخلیقی ماحول جگمگانے لگتا ہے۔

خاکسار نے رفیق رازؔ کا کوئی بھی شعری مجموعہ کبھی نہیں پڑھا، لیکن اُن کا کلام غزل کی صورت میں ''شب خون'' اور ''شاعر'' میں تواتر کے ساتھ شائع ہوا کرتا تھا جو میری نظروں سے بھی گزرتا تھا اور مکتوب کی صورت میں ردِ عمل ظاہر کرنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔ ''نخلِ آب'' رفیق رازؔ کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا تھا، لیکن میرے مطالعہ میں اب آیا ہے۔ میری نظر میں رفیق رازؔ کا یہ غزلیہ مجموعہ ان کے اسلوب اور شعری قد آوری کی طرف ایک بھرپور اشارے کے مترادف ہے۔ اس مجموعے کے سرورق کی پشت پر جو غزل براجمان ہے وہ چونکاتی بھی ہے اور مجموعے کو حرف حرف پڑھنے کے لئے قاری کو اُکساتی بھی ہے۔ مذکورہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

گلے پہ خاک تمہارے سُر اور تال پہ خاک
غزل پہ خاک مضامینِ پائمال پہ خاک
دبا ہوا ہے ابھی ذہن کے دفینے میں
پڑی ہوئی ہے ابھی گوہر خیال پہ خاک

یہ کس کے دشت کو گلزار کر کے آئے ہو
چمک رہی ہے ابھی تک تمہاری شال پہ خاک

پرانے زخم تو دل کے ہیں سب ہرے ہی ابھی
نیا برس ہو مبارک، گزشتہ سال پہ خاک

یہ بت بنے گا خدا تو جسے تراشتا ہے
یہ ڈال دے گا ترے دستِ باکمال پہ خاک

یہ غزل نو اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا ہر ایک شعر اپنے مفہوم کے حوالے سے گفتگو کا طالب ہے اور غزل کی تخلیقی وسعتوں کے تعلق سے اس انداز سے اظہارِ خیال کرتا ہے کہ قاری سوچتا رہتا ہے کہ گلے باز شعراء نے غزل کی معنوی کیفیات کو اور پامال مضامین کی بہتات نے نئی غزل کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ دوسرا شعر ،شعری فکر کی بہترین مثالوں میں درج کیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ شاعر جس گوہر خیال کو نظم کرنا چاہتا ہے وہ اس کے ذہن کے دفینے میں دبا ہوا ہے اور شاعر کی گرفت میں پوری طرح نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے شاعر جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں اس پر خاک ڈالنے کے خیال کو آواز عطا کرتا ہے جو شعر کی معنوی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ تیسرا شعر غزل اور محبوبیت کے حوالے سے اس قدر متاثر کرتا ہے کہ دل اس کی شعری نفاست اور شائستگی کا معترف ہو جاتا ہے، چونکہ شعر کا مفہوم وصل کی رعنائیوں میں پوری طرح شرابور ہے۔

چوتھا شعر دل کے پرانے زخموں کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ اس میں زندگی سے وابستگی پر اصرار کرتی ہوئی حوصلے کی نمود خود بخود اُبھر آتی ہے اور قاری غزل کی اس وارفتگی پر شاد ہو جاتا ہے۔ پانچواں شعر معنوی اعتبار سے تو ایک دم نیا نہیں ہے

مگراس کی قابل ذکر معنوی صفت یہ ہے کہ یہ بت تراش کوتا کید کرتا ہے کہ تو جس بت کوتراشنے میں منہمک ہے وہ خدا بن کر تیرے دست کمال کو بھی رسوائی کے غار میں دھکیل دے گا۔ رفیق رازؔ کے اس غزل کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موصوف کو اپنی تخلیقی جسارتوں پر مکمل اعتبار ہے اور وہ اپنے ہر ایک شعر کو کئی معنوی پہلوؤں سے سوچنے کے بعد ہی سپردِ قرطاس کرتے ہیں۔ مجموعے کی اوّل غزل کے چند اشعار اور دیکھیں ؂

قصر وجود کے تو کئی اور در بھی تھے
لیکن نکل گیا میں خموشی کے باب سے
مجھ سے کہانی پیاس کی ہوتی نہیں رقم
لکھتا ہوں آب پر میں فقط آب، آب سے
دنیا کی ان مثالوں میں رکھا ہے کیا جناب
اک دو حوالے دیجئے دل کی کتاب سے
مت کر طلوع آنکھ کے خورشید کو ابھی
محوِ سخن ہیں اوس کے قطرے گلاب سے
بھر دی رفیق رازؔ نے مشکیزۂ غزل
جاری ہوئی تھی جوئے معانی غیاب سے

ارباب فکر ونظر کا خیال ہے کہ جس غزل میں تین یا چار اشعار اچھا کہلانے کے لائق ہوتے ہیں تو اُسے عمدہ غزلیات کی فہرست میں درج کیا جاسکتا ہے، لیکن رفیق رازؔ کی ہر غزل اربابِ فکر ونظر کے خیال پر پوری طرح کھری اُترتی ہے اور اشعار کی گنتی کو نظر انداز کرکے اپنے مکمل وجود کے بہترین ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ تحریر

کردہ غزل کا پہلا شعر ہی اپنی معنوی فضا کی خوبصورتی پر اصرار کرتا ہے، لیکن یہ گمانِ مطلع کے عیب کی زد میں آ گیا ہے۔ رفیق راؔز جیسے غزل کے بانکے شاعر کو اس طرح کے معمولی عیوب سے بچنا چاہئے۔ غزلیہ شاعری کی یہ پابندیاں ہی شاعر کو فنکار بناتی ہیں۔ غزل کے شاعر کے لئے ان پابندیوں کا احترام کرنا ضروری ہے۔ مجموعے میں شامل دوسری غزل کو دیکھئے اور قوافی کے برتنے کے سلیقے کی رفیق راؔز کو داد دیجئے ؎

مانا کہ یہ جہاں بھی حسین و جمیل ہے
میلان اس طرف نہیں طبع سلیم کا
لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں ، امیں ہوں میں دردِ عظیم کا
کر دے نہ راکھ دشت سماعت کو یہ سکوت
کچھ اور پھیل جائے نہ شعلہ جحیم کا
در وا ہوئے ہیں بارگہہ حرف کے تمام
اللہ کا کرم ہے یہ ، صدقہ دو میم کا
پستی میں بھی ذلیل کا رتبہ بلند ہے
قرآن تک میں ذکر ہے پہلے رجیم کا

تحریر کردہ غزل میں جو قوافی استعمال میں لائے گئے ہیں وہ سب شاعر کی کہنہ مشقی کے شاہد بھی ہیں اور یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ رفیق راؔز ثقیل سے ثقیل الفاظ کو غزل بنانے کے ہنر سے واقف ہیں اور وہ بھی اس بہاؤ کے ساتھ کہ غزل کا ہر مصرع موسیقیت کی پالکی پر سوار نظر آتا ہے۔

رفیق راؔز نے غزل کو کھنکتا ہوا معنوی و موضوعی حسن عطا کرنے کے لئے جو لہجہ

،جو اسلوب اختیار کیا ہے اُس نے ہی انہیں اپنے عہد کا ایک معتبر شاعر بنا دیا ہے اور ثقہ ناقدین کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ رفیق رازؔ کی غزل میں سماج و معاشرے کے ساتھ ان کے اپنے دُکھ سکھ بھی نظر آتے ہیں اور زندگی کے حوالے سے بھی موصوف کی غزل اجنبی احساسات کی مبصر نہیں ہے۔ اب مختلف فکر و احساس کے حامل چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیں ؎

دل کی فصیلِ سنگ میں پڑتی نہیں دراڑ
خوشبو جہانِ غیب کی اس میں کہاں سے آئے

☆

دشت سیہ میں چھوڑ گیا روشنی کے داغ
کیا ایلچی تھا مملکتِ آفتاب کا

☆

ہم تو اک رنگ تھے دنیا نے اُڑایا تھا جسے
اب تری آنکھ کے اعجاز سے منظر ہوئے ہیں

☆

بجا، کہ شہر میں ارزاں بہت ہیں خواب مگر
یہاں تو نیند ہی ہم پر حرام ہے سائیں

☆

حساس ہوں اور اس پہ وہ شدت کی پیاس ہے
سنتا ہوں اب سراب میں پانی کا شور بھی

☆

تصویر تھی کہ خواب کے رنگوں کا انتشار
تعبیر تھی کہ اہل بصیرت کی دھند تھی

☆

شجر سے لپٹ کر نہ روئے گی یہ
ہوا جو چلی ہے وہ صحرا کی ہے

☆

سیاہ شہر کی قسمت میں میرا فیض کہاں
چراغ ِ نذر ہوں جلتا ہوں آستانے میں

☆

کتنی دیر جہاں پر طاری شب رہتی
کتنی دیر اندھیرے غار میں رہتا میں

☆

کس برج میں ہے چرخِ فقیراں کا ماہتاب
کس چاک پر ہے خانۂ ویران کا چراغ

''نخل آب'' کی ابتدائی غزلیات سے بغیر کسی مشقت کے یہ اشعار صرف یہ سوچ کر مضمون میں شامل کیئے گئے ہیں تا کہ رفیق رازؔ کی شعری فکر کو آسانی سے فروزاں کیا جا سکے۔

رفیق رازؔ کی غزل کا مطالعہ بتا تا ہے کہ ان کی غزل میں موضوعات کا جو دریا رواں ہے اُس کی کوئی منزل نہیں ہے اور نہ ہی غزل کی معنوی پیچیدگیاں اُن کی شاعری

میں بار بار اُبھرتی ہیں۔اس لئے پورے یقین کے ساتھ یہ اعتراف کیا جا سکتا ہے کہ وہ عصری غزل کے بہت ہی البیلے شاعر ہیں اور یہی سبب ہے کہ محمد یوسف ٹینگ نے ''نخلِ آب'' کی غزلیات کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے :

''شاعر کی ایک بڑی آزمائش اُس وقت ہوتی ہے جب وہ مانوس اور پامال لہجوں کی دلدل سے نکل کر اُن ہی الفاظ میں نئی روشنی تلاش کرنا چاہتا ہے جو معنی کی ہم آہنگی اور تہہ نشینی کے باوجود تازہ مہک پیدا کر سکیں''

میں، محمد یوسف ٹینگ کے اس خیال سے کلی طور پر اتفاق کرتا ہوں اور رفیق رازؔ کو اس عہد کا باوقار تخلیقیت سے لبریز جدید شاعر تصور کرتا ہوں جو نخلستان کی سخت مزاج زمینوں پر بھی سخن کے گلاب کھلانے کی قدرت رکھتا ہے۔ میں اپنے مضمون کا اختتام ایک ایسے شعر پر کر رہا ہوں جس کا ثانی مصرع مضمون کا عنوان ہے اور رفیق رازؔ کی غزل کا صادق ثنا گر بھی ہے ؎

ہے میری غزل سروِ چراغانِ مضامیں
دیواں ہے مرا گرمیٔ اظہار سے روشن

☆☆☆

☆......دیپک بدکی

رفیق راز: زندگی کا ترجمان شاعر

رفیق رازؔ وادی کشمیر کے اُن گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے اردو ادب کیلئے اپنی زندگی وقف کر لی ہے۔ جن دنوں انہوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہر طرف جدیدیت کا بول بالا تھا۔ اس لئے وہ اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آخر کار اسی رنگ میں رنگ گئے۔ ان کی غزلیں شب خون میں چھپتی رہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے لئے نئے راستے ڈھونڈ نکالے اور نئی منزلوں کی نشاندہی بھی کر لی۔ بہر حال حکیم منظور کا ماننا ہے کہ رفیق رازؔ "جدید ہیں نہ ترقی پسند، صوفی ہیں نہ فلسفی، وہ خالص Genuine شاعر ہیں جو فعال اور متحرک ہیں، فکر روزگار بھی کرتے ہیں اور فکر شعر بھی۔ منفی، مثبت اور مہمل کی فسوں کاریوں کے رمز شناس بھی ہیں۔" مشہور نقاد حامدی کاشمیریؔ، رفیق رازؔ کے بارے میں لکھتے ہیں "وہ ان معدودے چند نئے شعراء میں نمایاں، امتیازی اور مستحکم حیثیت رکھتے ہیں جو تخلیق شعر میں دو بنیادی لوازم کو عزیز رکھتے ہیں۔ ایک جو شعر میں کسی منصوبہ بندی سے اپنے کسی خیال یا نظریئے کو ڈھالنے کے بجائے لفظوں اور پیکروں کو اپنے بل بوتے پر ترکیبی صورت میں ڈھلنے اور نادرہ کار شعری تجربے میں منقلب ہونے پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے جو روایت کے گہرے شعور کے ساتھ جدت کاری سے کام لیتے ہیں"۔

رفیق رازؔ کو زبان پر اتنی دسترس ہے کہ وہ جس لفظ کو چھوتے ہیں اسے سونا

بنا دیتے ہیں۔تنقید نگار جدید شاعروں سے اس لئے خفا ہیں کہ ان کی وجہ سے ترسیل دم توڑ چکی ہے۔رفیق راؔز کی شاعری ان نقادوں کیلئے کھلا چیلنج ہے وہ جدید شاعر ہیں لیکن مبہم نہیں۔ایسی منظریت تو رومانی اور ترقی پسند شاعروں کے پاس بھی نہیں ملتی۔انہوں نے جذبات کی جس طرح عکاسی کی ہے،انہیں کا خاصا ہے۔ان کے الفاظ خاموش بھی ہیں اور سب کچھ بیان بھی کرتے ہیں۔ان کی آنکھ روتی بھی ہے مگر ظاہراً خشک بھی ہے۔وہ اندھیروں میں پھنس بھی گئے ہیں مگر اجالوں کو ڈھونڈ بھی رہے ہیں۔ان کی شاعری میں جن علامتوں کا ذکر ہے،اس کی چند مثالیں پیش ہیں۔

اس شہر میں بھی عمر کا اک حصہ گزارا
اس شہر میں بھی کوئی بھی نکلا نہ شناسا

☆

کام نہیں آتی ہے تیری یاد کہ پسپا ہوتا ہوں
شام ڈھلے تنہائی پورے گھر پر حملہ کرتی ہے

☆

ہر شخص اپنے آپ سے مصروف ہے بہت
تنہا نہیں ہے کوئی بھی تنہائیوں کے بیچ

☆

مجھ پر شبِ فراق نے چھوڑا ہے یہ اثر
سایہ بھی اب لگے ہے شبِ تار یا اخی

☆

سورج اور چاند ستاروں کو بجھائے جانا
سرحد حشر تلک رات بچھائے جانا

رُکتا ہوں ہر اک موڑ پہ آنکھوں میں لئے دھوپ
ڈرتا ہوں وہی نقش نمودار نہ ہو جائے

☆

امڈ پڑتے ہیں سناٹوں کے لشکر شام ہوتے ہی
بھیانک مجھ کو لگتا ہے مرا گھر شام ہوتے ہی

☆

یہ گرجتا ہوا قلزم بے کراں کا سماں ہر طرف
لکھ نہ دے پیاس کی چلچلاتی ہوئی داستاں ہر طرف

قنوطیت کا عالم یہ ہے کہ درودیوار، درد، آنکھیں، آنسو، گیسو، سوچ، نامہ اعمال، یہاں تک کہ برف بھی شاعر کو سیاہ لگتا ہے جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ جس ماحول میں جی رہے ہیں وہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

آج پھر کھیلی گئی ہے خون کی ہولی کہیں
ہوگیا ہے آج پھر اخبار کا کالم سیاہ

انفرادی سطح پر شاعر جب اپنے اندر جھانکتا ہے، اپنے وجود کی بے ثباتی پر فکر مند ہوتا ہے تو اسے دنیا بنانے والے کی یاد آتی ہے۔ رفیق راز کے ہاں صوفی شعراء کا اثر نمایاں ہے اور وہ اپنی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کو، اپنے ہونے نہ ہونے کے مسئلہ کو اور تصوف کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے۔

سوچ کہ تھی میرے ہی نشے میں چور
میرے نہ ہونے کی علامت بھی تھی

وہ سکوت لامکانی' وہ حرائے لازمانی
کہ مہک رہے ہیں دونوں تری آہٹوں سے مولا

جلوۂ خواب کے مہتاب اگا دے شب بھر
چشم بے نور کے صحرا کو فروزاں کر دے
تیرا ہونا تیرے ہونے کی پہنائی پر ہے محیط
میری ادنیٰ سوچ کہ پھر بھی جال بچھائے رہتی ہے

اپنے محبوب کے درشن کیلئے شاعر حضرت موسیٰ اور کوہ طور کا ذکر یوں کرتا ہے۔ ذیل میں درج پہلا شعر بہت ہی خوب کہا ہے جس میں حد درجہ ندرتِ خیال ہے اور شاید اس طرح اس خیال کو کسی اور شاعر نے نہیں باندھا ہے:

وصل کے دن بھی وہ دونوں دو کناروں کی طرح تھے
بجلیوں کا رقص تھا اک درمیانی فاصلے میں

☆

جسم کے کوہ طور پہ لرزہ طاری ہے
آنکھ نظارہ کرنے پر آمادہ ہے

☆

تم بھی کرو زبانِ تجلی میں ہم سے بات
ہم بھی لکھیں گے طور پہ اک فقرۂ سیاہ

اپنے محبوب کی سادہ لوحی، روایت پسندی اور مجبوری کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

ہائے وہ شخص کہ بے نور دریچوں پہ مرے
دود آلودہ چراغوں سے سحر لکھ کے گیا
چار قدم چل کے دیکھتا تھا پلٹ کے
ایک روایت کی دھند سر میں ابھی تھی

رفیق راز کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ جب تک کوئی معروف نقاد شاعر کو سرٹفکیٹ نہیں دیتا تب تک اس کو شاعر نہیں مانا جاتا ہے۔

اب پڑھے جانے لگے ہیں غور سے اشعار میرے
جانے اس نے بات ایسی کیا لکھی ہے تبصرے میں

☆

یوں تو غبار دشت خموشی ہوں میں مگر
لفظوں کے پیرہن میں پیمبر دکھائی دوں

اتنا سب کچھ ہو کر بھی رفیق راز ہمت نہیں ہارتے۔ انہیں خدا پر پورا بھروسہ ہے اور اس بات کا ایقان ہے کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی۔

ہمارے خون کی خوشبو کہ جاگ اُٹھے گی
معطر اس سے یہ اکیسویں صدی ہوگی
مجھ کو چھوتے ہوئے ہر لمحہ گزرتا ہے کوئی
کبھی خوشبو تو کبھی موجہء صرصر کی طرح

شمس الرحمٰن فاروقی رفیق راز کے بارے میں رقمطراز ہیں "رفیق راز اُن شعرا میں نمایاں ہیں جنہوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ گرد و پیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاربہ رفیق راز کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ لیکن وہ گرد و پیش کی زندگی کو سیاہ چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھتے نہیں اور نہ وہ اپنے محاربے کو جھنڈے کی طرح اٹھائے پھرتے ہیں''۔

☆☆☆

☆......خالد حسین

رفیق رازؔ: رمز شناس شاعر

سنسکرت کے کلاسیکی شاعر کالی داس کے مطابق عرفان کا گیان ہی شاعری کو پروان چڑھاتا ہے اور فنکار اپنے فن کی بُلندیوں کو چھوتا ہے۔ یہ بات رفیق راز کی سنجیدہ، پرُ مغز اور مفکرانہ شاعری پر پوری اُترتی ہے۔ اُس کی شاعری کے دریا میں زندگی کے مشاہدات و تجربات غوطہ زن رہتے ہیں۔ اب یہ قاری کی نظر اور سمجھ پر منحصر ہے کہ وہ موتی چُنتا ہے یا سیپ۔ رفیق راز بذاتِ خود ایک سوچ ایک فکر کا نام ہے۔ اُس کی شاعری میں جابجا فِکری پہلو تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ اُس کی لفظیات اپنے ہم عصروں سے منفرد ہے اُس کے اشعار دِل سے زیادہ ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔

ؔ دِل کی فصیل سنگ میں پڑتی نہیں دراڑ
خوشبو جہانِ غیب کی اس میں کہاں سے آئے

ؔ مجھ میں خود کا سامنا کرنے کی اب ہمت نہیں
وہ ہزیمت رزم گاہِ ذات میں کھائی کہ بس

ؔ اپنے وُجود میں جھانک کے میں تو ڈر ہی گیا
جُز میں یقیناً رہتا ہے کل اللہ ہُو

ہر بڑا شاعر زندگی کو خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ انسانی ذہن کو لافانی روشنی سے منوّر کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی ادب کی بنیاد سچائی، انسان دوستی اور

اظہار کے حسن پر قائم ہوتی ہے۔ بڑا شاعر بناوٹ اور ظاہری صورت کو زندگی سے خارج کر دیتا ہے اور وحدانیت اور حقانیت کا لبادہ اوڑ کر ربّ اور بندے کے درمیان رابطہ استوار کرتا ہے اور یوں ربی عشق کا دروازہ کھلتا ہے۔

؎ اس رزم گاہِ ذات میں ہنگامہ ہو بپا
مجھ کو مرے خُدا کبھی مجھ سے دو چار کر

؎ خاک ہی شہر و بیاباں کی اگر دولت ہے
تو یہ آوارہ تیرا صاحبِ ثروت ہے بہت

؎ ٹوٹ سکتا ہوں مگر بجھ نہیں سکتا میں کبھی
فقر کی آگ ہے اِک میری انّا میں روشن

رفیق رازؔ لمبے ادبی سفر اور کٹھن ریاضتوں کے بعد دانائے راز بنا ہے، جبھی تو شاعری میں اپنا مقام بنا پایا ہے۔ اُس کے تخیّل میں معرفت اور روحانیت موجزن ہے ۔ وہ تصوف کی کشتی کو سلیقے سے چلاتا ہے اور اپنی صوفی روح کو منشا کے مطابق شاعری کی قبا پہناتا ہے۔ اُس کے ہاں غم جاناں سے کہیں زیادہ غم دوراں کا اظہار ملتا ہے۔

؎ بس ایک خواب کا فتنہ اُٹھا ہے روح کے اندر
بس ایک حشر بپا ہے درونِ شہر خموشاں

؎ نہیں ہے ٹوٹتا ، ٹوٹے قلندروں کا سکوت
کہ سخت جاں ہے بہت سنگ زاد سناٹا

؎ تم پر کھُلے گا سرِّ جمالِ سکُوت کیا
تم سے تو سر ہوا نہ بیاباں ایک بھی

رفیق رازؔ کے لئے مادہ پرستی ایک فریب ہے۔تنگ نظری اور بنیاد پرستی سماجی بیماریاں ہیں۔انسانی رشتوں کی کیفیت، سماجی زندگی کے نظریات اور تصورات پر اُس کی گہری نظر ہے۔اسی لئے وہ زندگی کی ناہموار سچائیوں کو اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے ۔ تخئیل کی امیری، بصیرت اور فنی مہارت نے اس کی شاعری کو معتبر بنایا ہے جبکہ اشعار غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

جسم کے سنگ سے چشمے کی طرح پھوٹ پڑوں
اور سناٹے کے صحراؤں میں داخل ہوجاؤں

میں پانی تھا سورج گھور رہا تھا مجھے
کیا کرتا بے بس تھا بادل ہونے تک

رفیق رازؔ نفرت، طاقت، حسد اور گھمنڈ کو پیار اور محبت کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔ وہ سیاست میں ہٹ دھرمی اور مکر وفریب کے بنجر پہاڑ کا ٹنا چاہتا ہے۔زمانے کی نیرنگیوں کو دیکھ کر اس کے دِل کے اندر جو بھنور پڑتے ہیں وہ اُس کے اظہار کا وسیلہ بنتے ہیں۔وہی اُس کی تخلیق کا اصل سر چشمہ ہیں۔

نہ اور زخم اِسے دو یہ زخم زخم زمیں
دِکھا چکی ہے تماشا لہو اُگلنے کا

اِنھی کی مہر سے رہتا ہوں روز خبروں میں
بلائیں نام ہی لیتی نہیں ہیں ٹلنے کا

سیاست کی کھردری زمین نے انسانی وحدت کی فصل برباد کردی ہے۔ بداعتمادی اور بے اعتباری کی گانٹھیں، راج نیتی کھلتے ہی نہیں دیتی۔جس کی وجہ سے وادی محرومی، بے بسی اور بے کسی کے حصار میں گرفتار ہو چکی ہے اخلاقی قدریں زوال خوردہ ہیں۔ماحول میں اضطراب اور بے چینی ہے۔بارود کی بُو سے ہر آنکھ اشک بار

ہے۔اِن تلخ حقائق نے رفیق رازؔ کی ذہنی فضا کو گرد آلود کر دیا ہے۔عوام کا درد اُس کا اپنا درد بن گیا ہے۔وہ علامتوں اور استعاروں کے ذریعہ کشمیر کے سیاسی، معاشی اور اخلاقی منظرنامے کی عکاسی کرتا ہے۔

سبزہ تو دیکھ موسم گل میں بھی زرد ہے
آہستہ چل زمیں کی چھاتی میں درد ہے

شہر میں راتوں کو سونے کی روایت نہ رہی
لوگ ڈرتے ہیں بہت خوابوں کی ارزانی میں

صبح کشمیر بھی ہے شامِ غریباں جیسی
ایک دو دِن کے لئے آ کے یہاں دیکھئے گا

بپا کردیں قیامت ہی چٹانیں
اگر یہ کھول دیں اپنی زبانیں
اب ان لاشوں کی وہ حالت ہوتی ہے
کہ رد کر دِیں گدھوں نے بھی اُڑانیں

اک لمحے نے کیوں دھار لیا روپ صدی کا
بیتا ہوا یہ لمحہ گذر کیوں نہیں جاتا

یوں بھی ہوا کہ صدیوں میں اک پل گذر گیا
گزری ہیں اک پل میں بھی صدیاں کبھی کبھی

رفیق رازؔ کی شاعری کے رنگ پکے بھی ہیں اور سچے بھی۔اشعار میں صوفیانہ لہریں الفاظ کا حسن بڑھاتی ہیں۔اُس کا اپنا ایک الگ ڈکشن ہے۔اُس کی شاعری خرد

افروز ہے اور ذات سے باہر نکل کر کائنات سے رشتہ جوڑتی ہے۔

ایک سورج ہے یہاں قید کئی برسوں سے
دِل کے زنداں میں کبھی رات نہیں آتی ہے

دودھ کی نہریں تو لاسکتے ہیں یہ تیشۂ بدست
بھید ان چپ چاپ چٹانوں کا پاسکتے نہیں

یہ کرشمہ تیری تصویر کا ہی لگتا ہے
ورنہ دیوار کسی گھر کی کہاں بولتی ہے
اکیلا پا کے مجھ کو وار کرتا ہے
میرا ہم زاد میرا دشمنِ جانی

رفیق رازؔ کی شاعری کا تجزیہ کریں تو معلوم پڑتا ہے کہ وہ جمالیات سے زیادہ فکریات کے قریب ہے۔ کلام میں تغزل کا رنگ مدہم ہے۔ اس کی غزلوں میں شنگار رس کی جگہ احساس کی شدت ملے گی۔ وہ خود بھی کہتا ہے۔

؎ کچھ میرا بھی کلام تھا اُلجھا ہوا بہت
کچھ اُس کے ذہن میں بھی روایت کی دُھند تھی
میرا چراغ شہر سخن میں چمکتا کیا
گہری یہاں بہت ہی سیاست کی دھند بھی

شاعروں، ادیبوں اور نام نہاد دانشوروں کی خرید وفروخت سے وہ بہت نالاں ہے چنانچہ کہتا ہے؎

؎ قلم سونے کا آیا ہے اب کے نذرانہ
وہ چاہتے ہیں کہ میں سنگ کو کپاس لکھوں

تمام رات اسی فکر میں گذرتی ہے
کہ جسم فِکر پہ کس حرف کا لباس لکھوں

ہُنرِضمیر فروشی کا ہم بھی سیکھ گئے
مقام شکُر ہے ہم بھی کمانے لگے ہیں

رفیق رازؔ اپنی غزلوں میں عقل وخرد کے جام پلاتا ہے اور دُنیائے عرفان کی سیر کراتا ہے۔ وہ آفاقی غزل کا رمز شناس ہے۔ اس تماشہ گاہِ حیات میں وہ بربریت کی زنجیریں توڑنا چاہتا ہے تاکہ فطرت آزاد ہو۔ لوگ طبقاتی نفرت کو تیاگ دیں اور صوفیانہ افکار پر عمل کریں۔

؎ دیکھا نہ اس نے کون ہے عاشق ، رقیب کون
سیلاب کی بلا تھی وہ ہر اک کے گھر گئی
لے جائے گا کبھی نہ کبھی اس کو سیلِ وقت
بوسیدہ سی فصیل پہ کچھ بھی لکھا نہ کر

اُس کے اشعار میں پختہ شعور ہے جو رفیق رازؔ کو دیدۂ بینائے قوم بناتا ہے۔ اُس کا اپنا رنگ وآہنگ ہے جو غزلوں کے قالب میں ڈھلا ہوا ہے۔ غمِ دوراں کے مسائل اُس کی غزلوں میں گہری صداقت کے ساتھ اُبھرتے ہیں۔ وہ مجھے سقراط، منصور اور سرمد کے افکار کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ یہ مختصر سا مضمون میں رفیق رازؔ کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ہماری آبلہ پائی کا کچھ لحاظ تو کر
سزا ہی لکھنی ہے تو لِکھ سزائے سبزۂ گل

☆☆☆

☆......رئیس الدین رئیس

رفیق راز: انکشافِ ذات کا شاعر

رفیق راز خوش نصیب ہیں کہ نئی غزل کے شعرا میں انہوں نے اپنی مشق وریاضت ژرف نگاہی' جانکاہی اور عرق ریزی کے بل پر اپنا منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ان کی تخلیقی توانائی کو جدت وندرت اور نادرہ کاری کے نئے سانچوں اور پیمانوں کی تلاش رہتی ہے۔ وہ غزل کی عمارت سازی میں سبھی کچھ نیا نیا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی نئی غزل' نئے مضمون' نئی فکر' نیا لہجہ اور نئے اسلوب سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ غزل کی تعمیر میں نئے الفاظ' نئے تلازمات' نئی اصطلاحات' نئے استعارات' نئی علامات' نئے اشارات اور نئی نئی تراکیب کو بروئے کار لا کر غزل کو قطعاً نیا انوکھا اور منفرد رنگ وروپ عطا کر دیتے ہیں۔نظریاتی اور روایتی رنگ کی شاعری سے انہیں چڑ ہے۔ پامال اور فرسودہ مضامین کی روایتی جگالی کے وہ انتہائی خلاف ہیں۔سڑی گلی روایت کی بوسیدہ ہڈیوں کی مالا گلے میں ڈالنے والوں کا وہ مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔

بہت گھسیٹا اُسے میں نے داستانوں میں
میں کیا بلا ہوں پری دل میں سوچتی ہوگی

خود اپنی شاعری کے اسلوب اور اپنے منفرد لب ولہجے کے سبب وہ اپنی شاعری سے ہر طرح مطمئن اور آسودہ نظر آتے ہیں۔انہیں فخر ہے کہ ان کے آسمانِ تلازمات سے شفق کی لالی پھوٹتی ہے اور ان کے بے صدا پتھریلے استعاروں کی چھاتی

سے فکر و معنی کے سرشاری و شادابی سے لبریز ٹھنڈے میٹھے چشمے ابلتے رہتے ہیں۔

چُپ چاپ ہے سنگِ استعارہ
بیتاب ہے فکر آبشاری

☆

ہر ایک شعر میں روشن ہے صبح ملکِ سخن
ہر ایک لفظ میں رقصاں شفق کی لالی

رازؔ کی شاعری میں مناجات بھی ملتے ہیں۔ ان کی حمد و ثنا بھی انفرادیت و ندرت سے آراستہ فکر و خیال کے نقرئی چراغوں سے تنویرِ نور چھلکاتی محسوس ہوتی ہے۔ دیکھئے کہ بے در و بام گھر، بیاباں اور بجھتے رنگوں کا دھواں جیسی اصطلاحات اور تراکیب نے ان کے شعری نظام میں کس بلا کا تنوع پیدا کر دیا ہے ؎

بے در و بام سے اس گھر کو بیاباں کر دے
آج کی رات مجھے لالۂ حیراں کر دے

☆

بجھتے رنگوں کا دھواں یہ جو مری آنکھ میں ہے
تو خدا ہے تو اسے موسمِ امکاں کر دے

رازؔ کی شاعری بلند آہنگ صداؤں اور گہرے شوخ رنگوں سے اور موسیقی کی نغمہ ریز تانوں سے عاری، فکر و شعور کو مرتعش کر دینے والی ایسی مدھم لہجے کی شاعری ہے جو ندی کی سبک خرام موجوں سے مشابہہ ہے۔ لگتا ہے شاعر عالمِ سکوت میں خاموش بیٹھا ذات، حیات اور کائنات کے رازِ دروں سے پردہ ہٹا کر حقائق سے روشناس ہونے کا آرزومند ہے۔ وہ مظاہر کائنات کو اپنی داخلی دنیا کی تجربہ گاہ میں سمیٹ کر ان سے نتائج اخذ کرنے میں مصروفِ کار نظر آتا ہے۔ مختلف سوالات اور مختلف تمنائیں

اس کے دامن دل سے الجھنے لگتی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہو۔

ہوائے لمس کو عرصہ ہوا ہے گزرے ہوئے
بدن کے دشت میں کیوں ہے غبار سا باقی

☆

ہے ترجمان یہ خوشبوئے خامشی ہی مری
کہ اب تو کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا باقی

☆

بقید رنگ ہے آوارہ خوشبوؤں کا خرام
کہ شہر برگ و ہوا زندگی سے خالی ہے

☆

راہ میں روشن ہیں آرزو کے دیئے بھی
دھند کے اُس پار تابناک ہے تو بھی

☆

تو کسی دن لباس شعلہ میں
میرے برفیلے جنگلوں میں اُتر

☆

رات کہ تیری صدا ہی آئی نہ خوشبو
راس نہ آیا مجھے یہ موسمِ ہو بھی

☆

پیاس بجھے گی مری کتنے سرابوں کے بعد
اور ہیں کتنے سفر تیرے مرے درمیاں

عشق جنوں گیر کی ظلمت بھی تھی
روشنی آتشِ وحشت بھی تھی

رفیق رازؔ نے شاعری کیلئے اکثر مشکل اور غیر شگفتہ زمینیں اختراع کر کے ان میں فکر و معنی کے رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔ ان کی شاعری میں مستعمل لفظوں کے معنی اکثر لغات سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں معنی کی پیاز جیسی بہت سی پرتیں ہوتی ہیں جو قاری کے سامنے معنی کے بہت سے در جھروکے اور روشن دان وا کر دیتی ہیں اور قاری اپنی پسند کے در یا جھروکے میں جھانک کر درِ معنی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے ایک شعر کے کئی کئی مطلب ہوتے ہیں جو ان کی شاعری میں وسعت، تہہ داری اور معنی آفرینی پر دال ہیں۔

ان کی شاعری کی ایک اور اہم صفت پیکر تراشی ہے۔ وہ قلم کو برش اور قرطاس کو کینواس بنا کر لفظی مصوّری سے نئے منظر سجا کر انہیں اپنی زبان عطا کر دیتے ہیں اور منظروں کی زبان ان کے افکار و خیال کی ترجمان بن جاتی ہے۔ یہ انتہائی مشکل کام وہی شاعر انجام دے سکتا ہے جس میں تخلیقی توانائی کی بجلیاں بھری پڑی ہوں اور جو لفظی در و بست سے کام لینے کے ہنر میں باکمال بھی ہو۔ رفیق رازؔ اس مینا کاری کے کام میں ہر طرح طاق ہیں۔ پیکر تراشی یا لفظی مصوری کے حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نخل شب تاب کے سایوں پہ رقم ہوتی ہوئی
ایک صد رنگ صدا گردِ سفر آلودہ

☆

قابل دید ہے فقیر کی چُپ
اک شعاعِ فلک نورد سی ہے

دشتِ گمانِ زرد میں یہ کس نے لکھ دیا
دریائے ریگِ سبز کہ بہتا ہوا بھی ہے

☆

پتتے ہوئے سراب فلک پر ہے داغ بھر
اک لختِ ابرِ تر کہ برستا ہوا بھی ہے

☆

اس چشم نیم باز کے صحراؤں میں بھی اب
ملتے نہیں ہیں خواب کے آثار یا اخی

☆

ہوا کی زد میں ہے اس شخص کا اب بھی یہ خاکستر
ہمیشہ جس کے سینے میں دِل بیباک روشن تھا

خارجی عوامل سے انسلاک کے بغیر شاعر یاانفعالیت اور قنوطیت سے گہنائی ہوئی رجعت زدہ بیمار شاعری بن کر رہ جاتی ہے۔ رازؔ اپنے معاشرے ماحول اور دنیا بھر میں رونما ہونے والے تغیرات واقعات اور سانحات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہمیں عصر حاضر میں رونما ہونے والے واقعات کا ردِعمل پر چھائیوں کی طرح ان کی شاعری میں قلا بازیاں کھاتا واضح طور پر نظر آجاتا ہے۔ احساسِ زیاں، تشکیک اور خوف کے سائے ان کی فکر سے گزر کر جب اشعار کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو یہ گوہرِ آبدار بن کر ہماری توجہ پوری طرح اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں ۔

شاخوں پہ پرندوں کو تذبذب ہے بلا کا
اک قتل سر سایہ اشجار نہ ہوجائے

منظر تمام اب کے ہیں نایاب شہر میں
آیا ہوا ہے دھند کا سیلاب شہر میں

☆

پتے لرز رہے تھے، خطرہ تھا آندھیوں کا
گھر ہو رہے تھے، خالی موسم تھا ہجرتوں

رفیق رازؔ فکر و فلسفے کے شاعر تو ہیں ہی ان کی طرز فکر کبھی کبھی قلعہ تصوف کی فصیلوں سے جا ٹکراتی ہے۔ ان کے غور و خوص کا طریقہ ہی کچھ ایسا ہے۔ کبھی وہ خود کو کائنات کا جز و بن کر حسن ازل سے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی ساری کائنات کو اپنی ذات میں سمیٹ کر انکشافِ ذات کے چراغ روشن کر دینا چاہتے ہیں ان کا یہ انداز فکر انہیں ایک صوفی کا روپ دیدیتا ہے۔

قابلِ دید ہے فقیر کی چُپ
اک شعاعِ فلک نوردسی ہے

☆

پیاس بجھے گی مری کتنے سرابوں کے بعد
اور ہیں کتنے سفر تیرے مرے درمیاں

آمد بر سر مطلب یہ کہ رفیق رازؔ نئی غزل کے ایسے شاعر ہیں جن کی تہہ دار علامتی شاعری اپنی انفرادیت اور نادرہ کاری کے سبب انہیں شہرت و مقبولیت کے اعزاز سے سرفراز کرے گی۔

☆☆☆

☆......بشیر اطہر

رفیق راز: ایک دوست' ایک شاعر

رفیق رازؔ سے اگر چہ میری ملاقات پہلے ہوچکی تھی لیکن اصل میں ان کے ساتھ دوستی کی بنیاد ریڈیو کشمیر کے پروگرام 'پراگاش' کی بدولت پڑی۔ اس پروگرام کو ہم دونوں نے شروع کیا۔ میں سکرپٹ رائٹر تھا اور وہ پروڈیوسر تھے۔ شاید انہیں میری صاف گوئی اور حقیقت پسندی بھا گئی۔ مجھے واقعی ان کی علمی بصیرت، گفتگو میں مزاج کا اچھوتا رنگ اور ملنساری پسند آئی۔ آدمی بہت دلچسپ ہیں۔ حقیقت پسند ہیں۔ زیادہ لوگوں سے گھل مل نہیں سکتے۔ دوستوں کو بنانے اور انہیں دھتکارنے میں پل بھر بھی نہیں لگتا۔ کبھی شعلہ تو کبھی شبنم۔ پسند اور ناپسند کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ تجسس اس حد تک کہ کبھی کبھی اُس پر شک کا لفظ صادر آتا ہے۔ ہر ایک واقعہ کو صرف اپنی عینک سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہ بات ان کے گنے چنے دوستوں کو بھی گوارا نہیں۔ مزاج تند، زبان کبھی قند تو کبھی ہنزل۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ ارادتاً کسی کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے لیکن الفاظ میں اتنی دھار کہ کاٹے بغیر نہیں رہتے۔ فیاض اتنے کہ جواب نہیں۔ مجھے یاد آتا ہے جب ہم دونوں کو ریڈیو سے 'پراگاش' کے چیک ملے تو بحیثیت پروڈیوسر انہیں کوئی زیادہ رقم ملی۔ فوراً کیش کر کے مجھے چائے کی دعوت دی اور آدھی سے زیادہ رقم خرچ کی۔ حالانکہ بے روزگار تھے، لیکن بس یہ ضد پکڑ لی کہ انہیں زیادہ رقم ملی، اس لئے بل چکانا ان کا فرض ہے۔ میری ان کی دوستی کے بعد ہم ایک دوسرے کے گھر کبھی کبھار

آتے جاتے رہتے۔ ان کے قریب رہ کر ایک احساس ہمیشہ دل کو ستاتا رہا کہ ان کی شخصیت حالانکہ ایک کھاتے پیتے گھر میں پروان چڑھی، پھر بھی کوئی کمی ہے جو انہیں آج تک کھٹکتی ہے۔ کبھی کبھی اتنے سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ اتنی تیکھی بات کرتے ہیں کہ قریب سے قریب تر دوست بھی اپنی راہ لیتے ہیں لیکن مجھے ان کی شخصیت کی جتنی تھوڑی بہت جانکاری ہے، اس کے تناظر میں ہمیشہ ایسی باتوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔

1976ء اور 1979ء کے آس پاس ان کی کچھ غزلیں اور نظمیں کافی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ ان میں چرار شریف میں لکھی ان کی نظم بھی شامل ہے، جو ایک شکوہ ہے، التجا ہے، منقبت ہے اور دعا ہے۔ کشمیری غزل 'زُون دِمہِ نئے بلایہ' بھی اس وقت کے آس پاس مشہور ہوئی۔ جب میں 1979ء ممبئی میں بحیثیت کشمیری کمنٹری سپیکر تعینات ہوا تو کچھ دنوں کے بعد ان کی ایک چٹھی آئی جس میں ان کی فرسٹریشن اور روزگار نہ ملنے کی وجہ سے زندگی سے متعلق ناامیدیاں چھائی تھیں۔ 1982ء میں جب میں I.I.S میں سلیکٹ ہوا تو یہ خوش خبری آئی کہ راز صاحب ریڈیو میں Pex بن گئے ہیں۔ اس کے بعد میں واپس سرینگر آیا اور ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ ہم دونوں کی دوستی ابھی تک Intact ہے۔

جس کی خاموشی پہ دنیا کر رہی ہے تبصرہ
اپنے اندر گنبدوں جیسی صدا رکھتا ہے وہ

اب ذرا سی بات ان کی شاعری کی' ورنہ میری بات ادھوری رہے گی۔ رفیق راز اردو اور کشمیری، دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ وہ ایک منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کا شعری کینواس کافی وسیع ہے۔ وہ جہاں ذات کے اندر اور باہر کی تلاش و تجسس میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، وہیں وہ اپنے ارد گرد سماجی اور سیاسی اُتھل پُتھل سے بھی بے نیاز نہیں ہیں۔ وہ ہر تغیر و تبدیلی کو محسوس کرتے ہیں اور ہر اُس

چیز پر آنسو بہاتے ہیں جوان کی حقیقی دنیا میں طغیانی لاتی ہے۔ان کی زبان ان کے جذبات کا ساتھ دیتی ہے۔حالانکہ کئی بار یہ دقیق اور بسا اوقات مبہم محسوس ہوتی ہے۔ نئی تراکیب، علامتیں اور استعارے تراشنا رفیق راز کی شاعری کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ان کا جداگانہ اسلوب دلچسپ ہے اور نئے موضوعات کی تلاش انہیں جدید کشمیری اور اردو شاعروں میں ایک الگ مقام عطا کرتی ہے۔

کشمیری شاعری پر مبنی پہلے ہی مجموعے ''نَے چھے نالاں'' پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کا ملنا ان کی شاعری کے معیار کا غماز ہے۔اردو میں 'انہار' اور پھر کشمیری شاعری کا ایک اور مجموعہ 'دستاویز' رفیق راز کی شعری شناخت کے مظہر ہیں۔فطرتاً ذہین، شاعری کے رموز اور اسرار سے مکمل واقفیت، علم عروض پر استادانہ دسترس، رگ رگ میں رچا بسا کشمیری آہنگ، نئے الفاظ کے استعمال کا تجسس، اردو فارسی اور عربی زبانوں کے ادب سے شناسائی، تخیُّل کی دولت سے مالا مال رفیق راز ایک ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں جدت کے ساتھ ساتھ روایات اور تصوف کا امتزاج انہیں نہ صرف منفرد بلکہ ایک مکمل سخن ور بنا دیتے ہیں۔شعر کہنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے پُرمغز اور نکتہ سنج نقاد بھی ہیں جن کے مقالات قابل توجہ اور قابل ذکر مواد فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆

☆۔۔۔غنیؔ غیور

رفیقؔ راز......صاحبِ اسرار شاعر

غزل سے مراد اشعار میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے کوئی نئی بات پیدا کرنا یا پھر کوئی ایسا ان دیکھا اور ان سُنا نکتہ اجاگر کرنا جو قاری کو بھر پور تازگی کا احساس دلائے اور اس کے دل و دماغ پر آبشاری کیفیت طاری کردے! ایسی کیفیت جو موجِ نوخیز کی طرح دم نہ توڑ بیٹھے بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے دل و دماغ پر دیرپا جادوئی کیفیت طاری کرے اور مزید ایسے کلام کو بار بار پڑھنے پر یہ کیفیت برقرار رہے۔ میرے خیال میں یہاں شاعری ساحری کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ حقیقی فن پارہ میں سحر انگیزی کے علاوہ کچھ استعارے یا ایسے جدلیاتی الفاظ بھی موجود ہوتے ہیں جو اسے زمانی شکست و ریخت سے محفوظ رکھتے ہیں بلکہ آنے والے وقت میں نئے نئے مفاہیم دیتے ہیں۔بے شک ایسی عمدہ غزل کہنا بہت مشکل ہے۔شاعر خوبصورت اور اَن چھوا استعاراتی اور تشبیہاتی نظام وضع کرتا ہے جو حشو وزائد سے پاک ہوتا ہے۔اچھے شاعر کا کلام کلیشہ زدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ دوررس نظر سے اپنی تخلیقات میں انوکھا پن اور نئی تان پیدا کرتا ہے۔

رفیقؔ رازؔ اپنے حالات سے بے خبر نہیں بلکہ ان کے بہت سے مشاہدے جو ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اشعار میں ڈھل گئے۔پچھلی تین چار دہائیوں کے حالات کی پرچھائیاں لطیف استعاروں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔مثلاً

اگر چٹان کی یہ چپ کلام ہے سائیں
تو پھر ہماری سماعت ہی خام ہے سائیں
بجا کہ شہر میں ارزاں بہت ہیں خواب مگر
یہاں تو نیند ہی ہم پر حرام ہے سائیں

رفیق رازؔ کے کلام میں بکثرت علامتیں اور استعارے موجود ہیں۔ ابتدا ہی سے ان کے کلام میں یہ عنصر نمایاں ہے۔ کہیں کہیں روایتی اشعار بھی ہو گئے ہیں جیسا کہ انھوں نے کشادہ دلی سے خود ہی اعتراف کیا ہے۔

اس غزل میں رفیق راز تری
رنگ آنا ہی تھا روایت کا
چار قدم چل کے دیکھتا تھا پلٹ کے
ایک روایت کی دھند، سر میں ابھی تھی

لیکن یہ روایتی رنگ بہت کم غزلوں میں دیکھا جاتا ہے اور رفیق رازؔ اس دھند سے جلد ہی باہر نکل جاتے ہیں مثلاً اگر ان کا دھیان معشوق کے بدن کی طرف جاتا ہے تو وہ اس کا اظہار انوکھے استعاراتی انداز میں کرتے ہیں۔

کیا کروں تیرے بدن کی تعریف
شعلہ اک کاغذی پوشاک میں ہے

سرزمینِ کشمیر کو چشمہ زار کہا جائے تو بجا ہے یہاں اطراف میں ڈھلوانوں سے بہتے ہوئے جھرنے دیکھ کر انھوں نے کیا خوب شعر کہا ہے :

پیاس میری بھی بجھاتے ہیں پہاڑی جھرنے
ورنہ مامور ہیں یہ تیری ثنا خوانی پر

روایت پسندوں اور جدت پسندوں کے درمیان جھگڑا پہلے ہی سے چل رہا

ہے لیکن وقت بہترین منصف ہوتا ہے جو شعرا روایتی یا مشاعروں کی سستی شہرت یا پذیرائی کے لئے شاعری کرتے ہیں، دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ ان کے چراغ جلد ہی بجھ جاتے ہیں اور جبکہ سچے فن پارے زمانی شکست وریخت سے بچ بچا کر یادگار زمانہ بن جاتے ہیں۔ رفیق رازؔ کے بعض خوبصورت اور لازوال اشعار دیکھئے

میرا چراغ شہرِ سخن میں چمکتا کیا
گہری یہاں بہت ہی سیاست کی دھند تھی

ابھی تو بر سرِ پیکار موجِ آب سے ہوں
ابھی ہوں بیچ میں اس پار دیکھئے کیا ہو

☆

اٹھو کہ جوش پہ آئی ہوئی ہے وہ رحمت
یہ وقت دست کے کشکول میں ہے ڈھلنے کا

☆

یہ جو آنسو ابھی ابھی ٹپکا
استعارہ ہے شادمانی کا

☆

سبزہ تو دیکھ موسمِ گل میں بھی زرد ہے
آہستہ چل زمین کی چھاتی میں درد ہے

☆

اٹھی ہے تو محال ہے اب اس کا بیٹھنا
دو قافلوں کے بیچ میں حائل جو گرد ہے

رفیق رازؔ کے متعدد شعری مجموعوں کے مطالعہ سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ فکر وفن

کے اعتبار سے رفیق رازؔ اس وقت جموں و کشمیر کے اہم ترین شعرامیں سے ہیں اور میدانِ غزل کے شہسوار ہیں۔ان کے بہت سے مصرعے/اشعار/غزلیں ہمارے ادبی سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ابلیس کا تو نام ہے انکار سے روشن

......

بھیڑ میں تنہا یقیناً ہوں مگر اتنا نہیں
چاپ اوروں کی سنائی ہی نہ دے ایسا نہیں

رفیق رازؔ کا کلام سطحیت اور پایابی جیسے نقائص سے پاک ہے بلکہ بہت سے اشعار کے اندر معانی کی تہہ بہ تہہ پرتیں موجود ہیں ۔یہی صفت ان کے کلام کو معاصرین سے ممیّز کرتی ہے۔بے شک وہ اس عہد میں بلندی پر پہنچ چکے ہیں اوران کی تیسری آنکھ کھل چکی ہے۔

زمیں پہ بوجھ ہیں یہ بے ثمر خمیدہ شجر
ہیں انتظار میں آرے کے سن رسیدہ شجر
غزال تک ترے صحرا کے پُرسکوں ہیں بہت
ہمارے شہر میں ہیں خوف سے رمیدہ شجر

رفیق رازؔ خاموش طبع شخصیت کے مالک ہیں ۔ان کی خاموشیاں ان کے صاحبِ اسرار ہونے کا پتہ دیتی ہے۔

چپ ہوئے یا نہر جاری ہوگئی ہے فکر کی
لب کھلے اس کے کہ شیشی کھل گئی ہے عطر کی
لب سی لئے ہیں ہم نے کچھ ایسے رفیق رازؔ
جیسے ہمارے سینے میں کوئی خزانہ ہو

زیر بحث مضمون رفیق رازؔ کی شاعری کے مختلف فنی و اسلوبیاتی پہلوؤں کو محیط ہے ہیں۔ رفیق رازؔ کی مشکل پسندی اور مبہم گوئی کے متعلق بعض معترضین کے سوالات کے جوابات بھی دیئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ رفیق رازؔ کا بیشتر کلام مبہم اور دقیق ہے۔ ان کے یہاں استعارات اور علامات کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں اور وہ اسے شاعری کا حسن و جمال سمجھتے ہیں۔ جدید ناقدین میں شمس الرحمٰن فاروقی نے اس نظریہ کی حمایت کی ہے۔ رفیق رازؔ، شمس الرحمٰن فاروقی کے قریبی دوست بھی رہے ہیں اور شروع ہی سے ان کا کلام 'شب خون' میں چھپتا رہا ہے۔ 'شب خون' اپنے عہد کا موقر ترین اور نہایت معیاری جریدہ سمجھا جاتا تھا۔ رفیق رازؔ کے کلام کے گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حکیم منظور کے بعد جموں و کشمیر میں اردو غزل کے معتبر شاعر ہیں۔ حکیم منظور نے کشمیری ثقافت سے استعارے لئے ہیں۔ جبکہ رفیق رازؔ کی شاعری اردو کلاسیکی کی جڑ پر نئی پیوند کاری ہے۔ بیشک دونوں شعرا کا مطالعہ نہایت معنی خیز و اہم ہے۔ رفیق رازؔ کے کلام میں کلاسیکی آثار بھی پائے جاتے ہیں اور کہیں کہیں متقدمین شعرا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس لیے زیر نظر مضمون میں رفیق رازؔ اور اردو کے دیگر کہنہ مشق شعرا کے تقابلی مطالعے کو ذیلی ابواب میں جائزہ لینے کی کوشش کی گئی اور ان کے انفرادی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔

پگھل کے آنکھ سے ٹپکے ہیں اشک بن کر ہم
بدل کے بھیس قفس سے فرار ہو گئے ہیں

☆

غنیم صف سے نکلتے ہی مجھ پہ چڑھ دوڑا
رجز کی رسم ہی دنیا نے اب بھلا دی ہے

☆

کل رات جلوہ گہہ میں قیامت کی دھند تھی
دیکھا تو میری اپنی بصارت کی دھند تھی

☆

ہماری طرح حروفِ جنوں کے جال میں آ
کبھی تو جلوہ گہِ نون جیم دال میں آ

رفیق رازؔ کبھی تو وہ جلوہ گاہ نجد میں نظر آتے ہیں۔کبھی اپنے وجود کی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔کبھی دھونی رماتے اور سکوت کی خوشبو بکھیرتے ہیں۔کبھی بظاہر برہنہ قلندروں کی طرح کائنات کو زیب تن کرتے ہیں۔کبھی سناٹوں میں زمزمہ خوانی کرتے ہیں،کبھی بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔کبھی زرخیز لمحوں سے زمینِ حرف میں شجر کاری کرتے ہیں۔حرف سے زرخیز لمحوں میں شجر کاری بھی کی ہے اور وہ نئے نئے آہنگوں اور متنوع زمینوں کے خالق بھی ہیں۔کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں :

ہر ایک حرف میں اس کے مہک سکوت کی ہے
رفیق رازؔ کا اُسلوب ہے جدا سب سے

☆

بکھرے ہوئے ورق تھے قلم تھا، دوات تھی
ٹوٹی سی ایک میز پہ کُل کائنات تھی

☆

روح سے ہیں بیزار بہت
یہ ملک ِ بدن کے باشندے

☆

بے صدا حرف غل مچاتے ہیں
جب کسی کی سمجھ میں آتے ہیں

☆

ایک آواز پھڑپھڑاتی ہے
اک سماعت کے دام میں آکر

☆

گئے سال کی روشنی پی گیا
نئے سال کا یہ کلینڈر سیاہ

حق تو یہ ہے کہ رفیق رازؔ کے یہاں بے پناہ تخلیقی وفور نے شعور ولاشعور کے نئے نئے دریچے وا کئے ہیں اور وہ آفاق وانفس کی سیر کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھئے :

معنی کی خوشبو نیا پیکر ہے:۔

مجھ میں بھی تھی تیز سی خوشبو معنی کی
مہک رہا تھا میں بھی مہمل ہونے تک

رفیق رازؔ کے یہاں تخیل نت نئے پیکروں میں ڈھلتا ہے :

یا خاکِ بدن میں ہوں کوئی صرصرِ سفّاک
یا ہوں میں کوئی موجہ بیتاب تہِ آب

رفیق رازؔ کا کلام عام فہم نہیں بلکہ وہ خاص الخواص کے ذوق سلیم کے مطابق ہے۔ رفیق رازؔ کے یہاں بہت سے کلیدی الفاظ اور استعارے بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ پہلے بھی فارسی ادب میں استعمال ہو چکے ہیں۔ البتہ رفیق رازؔ نے انہیں حسن استعمال سے نئے قالب میں ڈھالا ہے اور انہیں نئے معانی ومفاہیم کا حامل بنایا

ہے۔ رفیق رآز کے یہاں ان الفاظ کا استعمال روایتاً نہیں ہوا بلکہ انہوں نے نئے معانی کا سلسلہ تخلیق کیا ہے جسے کلاسیکی روایت کے ذریعہ نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ اسے سمجھنے کی تگ ودو یا درایت نقد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ رفیق رآز کے یہاں کچھ ایسے کلیدی الفاظ کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں

● ......سکوت

سکوت میں رفیق رآز کو کبھی روشنی دکھائی دیتی ہے اور کبھی وہ اس کو تحیّر کا استعارہ قرار دیتے ہیں۔ بات یہاں ہی نہیں رکتی وہ سکوت سے نوع بہ نوع پیکر تراشتے چلے جاتے ہیں، گویا سکوت رفیق رآز کے کلام میں وسیع سلسلۂ معانی اور جہانِ حیرت وسرگشتگی ہے۔ سکوت پر رفیق رآز کے اشعار پڑھ کر بیدؔل کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ رفیق رآز کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرے سکوت میں تجھ سے ہی روشنی تھی کوئی
مرا سکوت بھی تجھ سے ہی استعارہ ہوا

☆

اُجالا رات کو بیرونِ زنداں ہوگیا ہوگا
فقط یہ رخنۂ دیوار حیراں ہوگیا ہوگا

☆

یارب سیاہ پوش نہ ہو شعلۂ سکوت
روشن تمام رات رہے خیمۂ سکوت

☆

آنکھیں عقیق ہائے یمن ہیں کہ دو چراغ
میرا وجود ہے کہ کوئی روضۂ سکوت

یہ دشت جا نماز ہے ،وہ غار درسگاہ
یہ سلسلہ جبال کا ہے سورۂ سکوت

☆

ایک لشکرِ حروف نے فوراً ہی دھر لیا
ہم قلعۂ سکوت سے جوں ہی رہا ہوئے

سکوت/ خامشی فارسی میں:

مارا چو شمع مرگ بود خامشی غنیؔ
اظہار زندگی بزبان کنیم ما
(غنیؔ کشمیری)

(ترجمہ: شمع کی طرح خاموشی ہمارے لئے موت کے بمنزلہ ہے لہٰذا ہم زندگی کا اظہار اپنی زبان سے کرتے ہیں۔)

گلوگیر ہوگئی یا وہ گوئی
رہا میں خموشی کو آواز کرتا
میر تقی میرؔ

خامشی/سکوت

کس قدر گونج ہے اس رات کے سنّاٹے میں
نہ یقیں آئے تو آواز لگا کر دیکھو

☆

یہ پانی خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں
احمد مشتاقؔ

● ......نخل (عربی لفظ: کھجور کا پیڑ)

نخل، اسلامی وثقافتی تناظر میں رفیق رازؔ کے یہاں وسیع تر مفاہیم ومعانی کا حامل ہے۔نخلِ آب، نخل نور، نخل جسم، نخلِ بدن، نخلِ بیابانی وغیرہ تراکیب محض رنگینیٔ خیال کے لئے نہیں باندھی گئی ہیں بلکہ ان میں پیاز کی پرتوں کی طرح تہہ در تہہ معانی موجود ہیں۔

اچھے شعر میں کبھی کبھار اوپری سطح غیر شفاف ہونے کے باعث معنی دھندلے یا کبھی بالکل روپوش ہوتے ہیں لیکن اگر ایسا شعر سچا شعر ہے اور غیر شعر نہیں تو اس میں کیفیت ضرور ہوتی ہے۔کہا جاتا ہے شعر خوب معنی ندارد، اصل میں اس کے معنی وہ نہیں جو لوگ سمجھتے ہیں اس بارے میں ہمارا موقف یہ ہے:

شعر خوب نیازی بہ توضیح المسائل ندارد

بہر حال، ہم شعرا پر کوئی قدغن بھی نہیں لگا سکتے۔رفیق رازؔ کے یہاں ''نخل'' کئی کروٹیں بدلتا ہے۔

مجھ پہ خورشیدِ جہاں تاب کے اکرام کہاں
مجھ پہ سایہ ہے کسی نخلِ بیابانی کا

☆

شاخوں پہ جس کے شعلے ہیں پھل پھول کی طرح
بیٹھا ہوا ہوں چھاؤں میں اُس نخلِ آب کی

☆

اس بار چلی ہوا یہ کیسی
اب تک ہے نخلِ جسم لرزاں

☆

تھا دیدنی وہ خود سے بچھڑ جانے کا سماں
سایہ سا کوئی نخلِ بدن سے نکل گیا

فارسی شاعری میں نخل :

تا بہ کی این تیشہ خواہی زد بہ پای خود بس است
این کہن نخل تمنا را نیف کندی هنوز
وحشی بافقی

☆

هر کہ از نخلِ تمنا روزہ مریم گرفت
نقل انجم در گریبانش چو عیسیٰ ریختند
صائب تبریزی

☆

نخل تمنا، نخلِ انجم صائب کے یہاں بلکہ نئی تراکیب ہیں۔

با کہ گویم آنچہ زان نخل تمنّا دیدہٗ ام
زان قد آشوب قیامت را دو بالا دیدہ ام
کلیم ہمدانی

اردو شاعری میں لفظ نخل :

لے گئی منصور کو تقدیر نخلِ دار تک
مجھ کو پہنچائے مقدر قامتِ دلدار تک
امین الدین شاہ قیصر

☆

ضعف پیری بڑھ گیا جوشِ جوانی گھٹ گیا
اب عصا بنوایئے نخل تمنا کاٹ کر
شآد لکھنوی

☆

بن گئی بات ان کا کرم ہو گیا شاخ نخل تمنا ہری ہو گئی
میرے لب پر مدینے کا نام آ گیا بیٹھے بیٹھے مری حاضری ہو گئی
عبدالستار نیازؔی

☆

اب دیکھئے نخل لفظ غنیؔ کشمیری کے یہاں کیسے استعمال ہوا:۔

میزند پہلو بہ نخل طور از آتش چنار
زیبد ار خود را کلیم وقت داند باغبان
غنیؔ کشمیری

(ترجمہ: آتش چنار سے نخل طور کا پہلو ابھرتا ہے باغباں اگر خود کو کلیم وقت کہے تو بجا ہوگا۔)

● ......غبار

رفیق رازؔ کے یہاں غبار لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ غبار کبھی سفر کی دلالت کرتا ہے کبھی رفتگاں کی سرگزشت اور کبھی رفتار کی خبر دیتا ہے۔

اپنے پیچھے غبار چھوڑا ہے
دشت سے اس طرح میں گزرا ہوں

☆

گرد و غبار و نالہ و فریاد اور دھواں
کیا کیا نہ پوچھ اور بھی ہم سے ہوا بلند

پیچھے گرد و غبار تھا میرے
آگے دیوارِ تن کا سایا تھا

☆

کسی کے سر پہ جنونِ سفر سوار نہیں
فضائے دشت کہ آلودہ ٔغبار نہیں

مثلاً غنیؔ کاشمیری نے غبار آسیا وسیع تر مفہوم میں برتا ہے۔

غنیؔ در ملک دنیا انقلابی آرزو دارم
کہ خاک از گردش گردون غبار آسیا گردد

(ترجمہ: غنیؔ میں اس جہاں میں ایسا انقلاب دیکھنا چاہتا ہوں کہ غبار آسیا کی طرح زمانہ کی گردش سے خاک اڑتی ہوئی دکھائی دے۔ غبار آسیا سے مراد، آٹے کا غبار ہے جو غلہ پیستے وقت چکی کے اردگرد اڑتا ہے۔ غنیؔ نے چلتی چکی کے تحرک اور گردش کو انقلاب پر محمول کیا ہے۔)

اقبالؔ کا حرکی نظریہ حیات چکی کی گردش جیسا ہی ہے۔ غبار بیدلؔ و غالبؔ کے یہاں بھی مستعمل ہے۔

آہ از غبار ما کہ واگیر شوق نیست
یعنی بخاک ریختہ است آسمان ما

حضرت بیدلؔ

افسوس میرا غبار، ہوا گیرِ شوق نہ ہوسکا یعنی میرا آسمان خاک میں پڑا ہے۔

شکوہ ٔ یاراں غبار دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ رفیق رازؔ نے یہ الفاظ پہلی بار نہیں استعمال کئے ہیں البتہ انہیں نئے تناظر اور نئے مفہوم میں ضرور برتا ہے۔ رفیق رازؔ کی شاعری کلاسیکی

ادب سے پیوست ہوتے ہوئے بھی جدید تر عصری لہجے کی آئینہ دار ہے۔ ان کا اسلوب شب خونی عناصر رکھتے ہوئے بھی مختلف ومنفرد معلوم ہوتا ہے۔ گہرے تجربہ اور ریاضت نے رفیق رازؔ کو اقلیم شعر میں اعلی مقام پر پہنچا دیا ہے۔

● ...... چنار

رفیق رازؔ نے حسب روایت چنار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

مت سوچ موسموں نے لگائی یہ کس طرح
کس آگ میں نہائے ہوئے ہیں چنار دیکھ

مثنوی شتائیہ میں غنیؔ کشمیری نے دست چنار کی ترکیب بھی استعمال کی ہے۔ یہ سوز دل کا استعارہ ہے۔شکوہ کا شعر یوں ہے۔

اگر چہ گرفت آتش اندر کنار
نشد گرم یک لحظہ دستِ چنار

(ترجمہ: موسم خزاں میں اگر چہ چنار سلگتا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر دست چنار یعنی چنار کا پتہ لحظہ بھر کے لئے گرم نہیں ہوتا۔)

میزند پہلو بہ نخل طور از آتش چنار
زیبد ار خود را کلیم وقت داند باغبان

یعنی آتش چنار سے نخل طور کا پہلوا بھرتا ہے۔ باغباں اگر خود کو کلیم وقت کہے تو بجا ہوگا۔خزاں میں چنار کے سرخ پتے سلگتی ہوئی آگ جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شاعرانہ خیال اور ترکیب اسی مفہوم میں اقبالؔ نے استعمال کی ہے ممکن ہے یہ خیال اقبالؔ نے غنیؔ کشمیری سے لیا ہو۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

● ...... دھند

رفیق رازؔ نے خموشی کو دھند کے تناظر میں استعمال کر کے درج ذیل شعر پر بدیع الاسلوبی کی مہر ثبت کی ہے۔نہایت خوبصورت شعر:

اس جگہ کون ہے یہ چلّہ کشی پر مامور
دھند کس نے یہ خموشی کی یہاں پھیلا دی

مزیداشعار :

چھوٹ جائے گی اک آن میں ہم کو نہ تھا پتہ
اب جاکے یہ کھلا کہ محبت کی دھند تھی

☆

کچھ میرا بھی کلام تھا الجھا ہوا بہت
کچھ اس کے ذہن میں بھی روایت کی دھند تھی

☆

یہ دہر وہر تو نہ تھا ہم دو کے درمیاں
حائل بس ایک گہری رفاقت کی دھند تھی

☆

چار قدم چل کے دیکھتا تھا پلٹ کے
ایک روایت کی دھند سر میں ابھی تھی

رفیق رازؔ

خلل پذیر شد از ضبطِ گریہ نور نگا
ز استین گلہ دارد چراغِ دیدۂ ما

غنیؔ کشمیری

(ترجمہ: آنسو روکنے سے میری نگاہ دھندلی ہوگئی۔ میری آنکھ کے چراغ کو میرے آستین سے گلہ ہے۔)

توضیح: معمول یہ ہے کہ رونے سے پہلے آنسو روکنے کیلئے آستین کو آنکھوں پر گزارا یا رکھا جاتا ہے نیز یہ کہ شمع کو آستین کی ہوا سے بجھایا جاتا ہے۔ یہاں غنی کشمیری نے اپنی آستین سے گلہ کیا ہے کہ اس نے آنسو نہیں روکے اور مزید ضبطِ گریہ سے نورِ نگاہ زائل ہوگیا ہے۔

● ......کھڑاؤں

لفظ کھڑاؤں کشمیر میں خاص معنی بھی رکھتا ہے۔ لکڑی کی چپل کو کھڑاؤں کہتے ہیں جو گھروں میں پہنتے تھے لیکن کشمیر میں ایک چوڑی اور ذرا بھاری کھڑاؤں برف میں بھی پہنی جاتی تھی۔ مارکیٹ میں نئے نئے جوتے آنے سے آج کل اس کا رواج متروک ہے۔ رفیق رازؔ نے کھڑاؤں پر معنی خیز اشعار کہے ہیں۔

جب تک رہے گی زیرِ قدم مٹّی گاؤں کی
تب تک رہے گی بند زباں بھی کھڑاؤں کی

☆

بہت پیچھے سفر میں چھوڑ آیا
کھڑاؤں کی صدا بھی نقشِ پا بھی

معاصر ادب میں لفظ کھڑاؤں :

عروج آتا ہے بھاری کھڑاؤں پہنے ہوئے
مگر زوال یہاں ننگے پاؤں آتا ہے

احمد عطاء اللہ

ایک فقیر چلا جاتا ہے پکی سڑک پر گاؤں کی
آگے راہ کا سناٹا ہے پیچھے گونج کھڑاؤں کی

جمال احسانی

●.....بجلی

ہمارے ہونے کی بجلی گری تھی بس اک بار
یہ حادثہ نہ یہاں پھر کبھی دوبارہ ہوا

رفیق رازؔ

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو

اقبالؔ

رفیق رازؔ کے یہاں صلابت آمیز زبان کا استعمال ملتا ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ کی اختراع اور فارسی آمیزی اگر چہ قابل اعتراض نہیں البتہ ذوقِ سلیم پر ناگوار ضرور گزرتی ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسی تراکیب کواستعمال کئے بغیر دقیقہ گوئی ونکتہ سنجی وتخیّل آرائی تک پہنچنا آساں نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بیدلؔ و غالبؔ نے سہل پسندی کے بجائے مشکل پسندی کا راستہ اختیار کیا اور تراکیب سے تخیل آرائی ونکتہ سنجی کومربوط ومضبوط بنایا۔

رفیق رازؔ کے یہاں دوحرفی، سہ حرفی و چہارحرفی تراکیب نے کلام کوگنجینۂ طلسمِ معانی بنادیا تھا۔بعض تراکیب:

موسمِ غیب، جلوۂ رنگ، نخلِ حیران، شعلۂ خواب، دشتِ بینائی، منظر فصلِ وہم وگماں، خوشبوئے لالہ کربِ آوارگاں، تصویرِ محشرِ شام، نخلِ ثمر دار، درِ گنجینہ اسرار، بارشِ حسرت، قلزمِ صوت و صدا، سایۂ بے خانماں، سازشِ سیارگاں، شعلگئی لالہ نگاہ، چراغ دانِ جسم، شعلۂ انکار، گرمئ اظہار، دولتِ بیدار، قافلۂ ذات، ستارہ ہائے امکاں، قلعۂ حیرانی، قلعۂ سکوت، نورِ حیرت، دولتِ اسرار، عرصہ آفاق، آلودۂ ظلمت

وغیرہ۔

قافلۂ رفتہ، خطۂ ویراں، شرارۂ امکاں، سیرِ نادیدہ، شہرِ سخن، قلزمِ آواز، کنارِ خاکداں، ویرانۂ جاں وغیرہ۔ حیرت کی بات یہ ہے ایک ہی لفظ سکوت کے لئے درجنوں تراکیب باندھی ہیں۔ یہ تنوع اور رنگارنگی دیدنی ہے اور اشعار طلسمِ گنجِ معانی ہوگئے ہیں:

عریانیٔ سکوت، پردۂ سکوت، حجرۂ سکوت، لمحۂ سکوت، لرزۂ سکوت، سورۂ سکوت، صفحۂ سکوت، جرعۂ سکوت، نغمۂ سکوت، روزۂ سکوت، سبزۂ سکوت، آوازۂ سکوت، روضۂ سکوت، شعلۂ سکوت، خیمۂ سکوت، دروازۂ سکوت، خطبۂ سکوت وغیرہ۔

رفیق رازؔ کے یہاں اکثر اشعار کی بالائی سطح میرؔ کی طرح سہل اور رواں نہیں ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ میرؔ سے تمام تر عقیدتوں کے باوجود رفیق رازؔ کا اسلوب غالبؔ کی طرح صلابت آمیز واقع ہوا ہے۔ اشعار میں خیالات ادا تو ہوتے ہیں مگر ابہام کے ساتھ۔

ہم جانتے ہیں ابہام جب شعر کا مفہوم کی ادائیگی میں بہت زیادہ التوا کا باعث ہوتو مذموم ہوجاتا۔ فاروقی اور ان کے ''شب خون'' سے منسلک شعرا کے یہاں یہ عیب ایک طرح سے ہنر تسلیم کیا جاتا ہے۔ فاروقی نے جدید شعر کے ابہام وجدلیاتی لفظ بنیادی شرط رکھی ہے۔ رفیق رازؔ کے یہاں ایسے الفاظ کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ رفیق رازؔ کا یہ لاجواب شعر دیکھئے :

خنک اندھیرے میں دیوارِ روح کے اس پار
بدن کی شاخ پہ مصلوب ہوگیا تھا میں

ترجمہ: ٹھنڈے اندھیرے میں یعنی روح کی تمازت وحرارت کے بغیر میں

نفس پروری کا شکار ہوگیا۔ بہت ہی خوبصورت شعر ہے۔ یہاں خنک اندھیرا، نفسانی خواہش اور غفلت شعاری کا تازہ استعارہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ نفسانی خواہشوں کے چکر میں میرے بدن کی شاخ میرے لئے پھانسی کا پھندہ بن گئی۔

بہر کیف مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رفیق رازؔ ایک ہمہ جہت تخلیقی فنکار ہیں اور کلاسیکی ادب کے متبحر عالم بھی۔ انہوں نے بہت سے اشعار اردو کے بڑے شعرا کے جواب میں کہے ہیں اور کہیں کہیں غالبؔ کی طرح مستعار خیال کو شعری پیکر میں منقلب بھی کیا ہے۔ راز کا اختصاص یہ ہے کہ ان کا شعری برتاؤ اور ڈکشن بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ راز صاحب کا کلام اوسط درجے قاری کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کی تفہیم و ادراک کے لئے ذہین و فطین اور صاحب ذوق و شوق قاری کی ضرورت ہے جو ان کے کلام میں پوشیدہ جہتوں کو اجاگر کر سکے اور ان کے کلام کی قدر سنجی کر کے نقد و نظر کے گوناگوں زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر ریاض توحیدؔی

رفیق رازؔ کا شعری آئینہ

چند حرفوں نے بہت شور مچا رکھا ہے
یعنی کاغذ پہ کوئی حشر اٹھا رکھا ہے
(نخلِ آب...ص۱۵۴)

شاعر کا مقام متعین کرنے میں مخصوص شعری بصیرت بنیادی اہمیت رکھتی ہے، جس کی پہچان منفرد شعری لہجہ، تخئیل آفرینی، تخلیقی اسلوب اور فنی ہنرمندی وغیرہ خصائص میں پوشیدہ ہوتی ہے، نہیں تو کتنے لوگ شعر کہتے آئے ہیں اور کتنے شعر کہہ کے چلے بھی گئے لیکن صرف چند ہی اس تخئیلی سلطنت میں اپنی نشستیں سنبھالنے میں کامیاب رہے۔ عصری اردو شعری منظرنامے میں رفیق راز اپنے منفرد شعری لہجے، تخئیل آفرینی، تخلیقی اسلوب اور فنی ہنرمندی کے خصائص کی بدولت مخصوص مقام بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ رفیق راز کے فنی اختصاص پر معروف نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے، بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی واردات پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز ان شعرا میں نمایاں ہیں جنہوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔''

منفرد اسلوب و لہجے کا یہ نمایاں مقام چند برسوں کی ریاضت کا ثمر نہیں بلکہ اس مقام کی بنیاد کئی دہائیوں کی فنی ریاضت، تخلیقی جگر سوزی اور مشاہداتی و تجرباتی عرق ریزی پر قائم ہے، جس کا اندازہ ''نخلِ آب'' کے تخئیلی عالم سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مجموعہ ''انہار'' اور ''مشراق'' کے بعد ''نخلِ آب'' راز صاحب کی شعری بصیرت کے کئی تخلیقی رازوں کو منکشف کر رہا ہے:

ترتیب ہی الگ ہے مرے شہرِ ذات کی
شعلہ تو اک ثمر ہے یہاں نخلِ آب کا

دنیا کی ان مثالوں میں رکھا ہے کیا جناب
اک دو حوالے دیجئے دل کی کتاب سے

لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں، امیں ہوں میں دردِ عظیم کا

کسی بھی تخلیقی متن کا تخلیقی برتاؤ متن کو ادبی اعتبار بخشنے میں بنیادی رول نبھاتا ہے اور قاری جب تنقیدی نقطۂ نگاہ سے تخلیقی متون پر ارتکاز کرتا ہے تو 'اکتشافی تنقید' کے پیش نظر قرأت کے دوران تخلیق کار کا یہی تخلیقی برتاؤ (Creative Treatment) لفظ و معنی کے دلچسپ تجربے سامنے لاتا ہے اور معیاری تخلیق تفہیم کی متنوع جہتیں کھول دیتی ہیں۔ لسانی سطح پر دیکھیں تو لفظوں اور تراکیب کا استعمال ایک قسم کا لسانی عمل ہوتا ہے اور یہ عمل ہر زبان کے بڑے تخلیق کاروں کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ اب اس توضیح کے پیش نظر پہلے شعر کو زیر بحث لائیں:

ترتیب ہی الگ ہے مرے شہرِ ذات کی
شعلہ تو اک ثمر ہے یہاں نخلِ آب کا

تو یہاں پر بھی لسانی عمل کا یہ تخلیقی وتصریفی برتاؤ دلچسپ تجربے کی عکاسی کرتا ہے۔شعری کردار پہلے ہی مصرعے میں 'شہرِ ذات' کی ترتیب یعنی اپنے قلبی احوال اور افکار کی انوکھی ترتیب کا دعویٰ کرتا ہے اور تخئیل کی بنیاد پر اپنے دعوے کا راز دوسرے مصرعے میں 'نخلِ آب' کی نرالی ترکیب اور شعلہ وثمر جیسے مانوس الفاظ کے وجدانی تجربے میں پوشیدہ رکھتا ہے تاکہ باذوق قاری شعر کی تہہ داری میں کھو کر تفہیم کی شروعات کرے۔اب یہاں پر پہلے 'نخلِ آب' کی تصوراتی امیج یا فینٹسی (Fantasy) پر غور کریں تو یہ لسانی عمل کا خوشگوار تاثر چھوڑ رہا ہے۔بظاہر یہ ترکیب مانوس الفاظ یعنی نخل (کھجور کا درخت یا اردو لغت میں عام درخت)اور آب (پانی) کا مرکب معلوم ہوتی ہے اگرچہ عربی میں بھی نخل بطور فعل ''نخل السحاب المطر''یعنی بادل کا پانی برسانا' استعمال ہوتا ہے لیکن جب بحیثیت ترکیب ''نخلِ آب''اور پھر شعر میں اس کے تخلیقی استعمال پر غور کریں تو تفہیم کا مسئلہ ذرا سا نازک بن جاتا ہے۔نخلِ آب کی ترکیب پر مجھے یورپی ملک مانٹی نیگرو(Montenegro) کا ایک پیڑ یاد آیا جو آبشار کی طرح پانی چھوڑتا ہے جو Water Tree کے نام سے مشہور ہے اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔لفظی معنی کے طور پر دونوں تراکیب میں گرچہ مماثلت نظر آتی ہے تاہم ممکن ہے کہ یہ تصور شاعر کے تخئیل میں کسی فوارہ کا نظارہ کرنے کے دوران ابھرا ہو کیونکہ آج کل فواروں کی ڈیزائننگ بھی ایسی ہوتی ہے کہ لگتا ہے جیسے پیڑ کی شاخیں پانی چھوڑ رہی ہوں'اس کے باوجود شعر میں یہ ترکیب جس ممکنہ مفہوم یا تجربے کی عکاسی کرتی ہے'اس سے لگتا ہے کہ یہ شاعر کی ذہنی اختراع ہے جس کو شعر کے اندر تخلیقی انداز میں بڑی ہنرمندی سے برتا گیا ہے اور 'نخلِ آب' کے قرین قیاس استعاراتی معنی دیدۂ تر بن جاتا ہے۔اب اس شعری ترکیب کے تصوراتی اور تخلیقی معنویت پر ارتکاز کریں تو نخلِ آب بمعنی دیدۂ تر (بھیگی آنکھیں) جو کہ اب جور وستم سے تنگ آکر شعلہ بن گئی

ہیں یعنی جب کسی کمزور انسان پر بار بار ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں تو صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے بعد وہ بھی دفاع کرنے یا بدلہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ پانی سے شعلہ بن جاتا ہے۔اس طرح شعر میں شاعرانہ تدبیر کاری Poetic Devices کے استعمال اور شعر کی معنوی جہت کا احاطہ کریں تو شاعر کہتا ہے کہ میرے شہرِ ذات یعنی خوشگوار زندگی (کیونکہ شہر کا استعارہ بذات خود خوشگوار احساس یا زندگی کی عکاسی کرتا ہے) گزارنے کے طور طریقوں کو گردش زمانہ نے مثبت سے منفی بنا دیا کیونکہ پہلے جو نخلِ آب فوارے کی طرح فرحت بخش نظارہ دکھاتا تھا اب وہی آگ کے شعلے برسا رہا ہے یا پہلے جن آنکھوں میں شبنمی چمک ہوتی تھی اب وہ شعلہ برسانے لگی ہیں۔تصوراتی طور پر شعر تجریدی اسلوب کی عکاسی کرتا ہے لیکن معنوی تناظر میں معنی خیز علامتی تفہیم پیش کرتا ہے جو کہ ایک عمدہ شعر کی طرح متحدالمفہوم کی بجائے متنوع المفہوم معنی انگیز کرنے کی نشانی ہے۔

رفیق راز کے بیشتر اشعار مشاہداتی تجربے کی دلکش فنی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں جذبات انگیزی سطحی خیالات نہیں بلکہ سنجیدہ فکر کا مدبرانہ اظہار ہوتا ہے۔وہ خارجی یا ظاہری شور شرابے کے برعکس داخلی سکوت کی دنیا پسند کرتے ہیں‘ اس لئے ملائم لہجے میں دنیا کی مثال پر ُدل کی کتاب‘ کے حوالے کو فوقیت دیتے ہیں۔ کیونکہ جب انسان کا دل مطمئن ہو تو پھر دنیا کی شان وشوکت بھی اطمینان کا باعث بنتی ہے اور اگر یہ شان وشوکت دل کی ویرانی کا سبب بنے تو پھر صاحب بصیرت روحانی کرب کا شکار ہو جاتے ہیں:

دنیا کی ان مثالوں میں رکھا ہے کیا جناب
اک دو حوالے دیجئے دل کی کتاب سے

اسی قسم کے ایک حکمت آمیز اصلاحی شعر میں لسان العصر اکبر الہ آبادی نے بہت پہلے اشارہ کیا تھا:

نقشوں کو تم نہ جانچو، لوگوں سے مل کے دیکھو
کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

شاعری تجربات کا فن ہے اور یہ فن تجربات و مشاہدات کی پیش کش کے لئے فنی لوازمات کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ کسی بھی باشعور انسان کے افکار مقامی ماحول یا حالات و واقعات کی اثرانگیزی سے بچ نہیں سکتے ہیں اور جب کوئی حساس فن کار ایسے ماحول میں سانسیں لیتا ہے تو ان حالات و واقعات کا مشاہداتی اظہار وہ اپنی تحریر/تخلیق میں کرتا ہے، جس کا اظہار ساحرلدھیانوی نے دلچسپ انداز میں یوں کیا ہے:

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

انہیں تجربات و مشاہدات کا فنی اظہار راز صاحب بھی دل فگار انداز میں کرتے ہوئے خود کو شاعر کی بجائے 'دردِ عظیم' کا 'امیں' کہہ کر کہتے ہیں کہ میں اپنے کلام میں وہی امانتیں لوٹا رہا ہوں جو وقت نے مجھے سونپی تھیں۔ شعر کی موضوعاتی مماثلت دیکھ کر ''خدائے سخن'' میر تقی میرؔ کا مشہور زمانہ شعر یاد آتا ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

شعر میں لفظ و خیال کا متوازن استعمال نظر آتا ہے یعنی امانتیں، امیں، شاعر، دردِعظیم۔ امانتیں تو زیادہ تر مادی تصور کی عکاسی کرتی ہیں لیکن یہاں پر انہیں سماجی کردار کے طور پر پیش کیا گیا اور امین بھی مادی امانتوں کے حوالے سے نہیں بلکہ بطور فنی ردعمل جو دردِعظیم کی صورت میں ہے:

لوٹا رہا ہوں وقت کو اپنی امانتیں
شاعر نہیں امیں ہوں میں دردِ عظیم کا

'دردِ عظیم' کا یہ امین شاعر جب تجربات ومشاہدات کوفن کے قالب میں ڈالتا ہے تو شعر کے اندر فکرو احساس اور دھیمے لہجے کا طنز آمیز رویہ بدلتا رہتا ہے اور معنوی صورت گری کا ابہامی نقشہ سامنے آتا ہے:

یہ جو ہر سمت ترے نیزے کی شہرت ہے بہت
سچ تو یہ ہے کہ مرے سر کی بدولت ہے بہت

یہاں رہتے ہیں سر سجدوں میں دائم
یہاں دیتا نہیں کوئی اذانیں

پہلے شعر میں تو شعری کردار طنز آمیز ملائم لہجے میں اور کچھ حد تک مدھم احتجاجی لے میں اپنے حریف کے غرور کو یہ کہہ کر للکار رہا ہے کہ تمہارے گھمنڈ اور شہرت کا احسان تو میری خودداری کا مرہون منت ہے۔ دوسرے شعر کا متن مثبت اور منفی احساس کے ابہامی یا ذومعنی تاثر (Ambiguous Imprssion) کا حامل ہے جو قول محال (Paradox) کی اچھی عکاسی کرتا ہے۔

مابعد جدید تنقیدی مکالمے کے پیش نظر شعر کی معنویت پر غور کریں تو شعر کا پہلا لفظ 'یہاں' (تابع فعل) اشارۃً شاعر کے اپنے سماجی ماحول کی عکاسی کرتا ہے یعنی کشمیر کے امن پسند ماحول کی' چونکہ کشمیر اپنی مہمان نوازی اور امن پسندی کی بدولت'' پیروں فقیروں' ریشی منیوں'' کی وادی کہلاتا ہے تو شعر کا پہلا امکانی معنی یہ نکلتا ہے کہ یہاں کے لوگ ہمیشہ اپنے سروں کو ندامت اور عجز سے جھکائے رہتے ہیں نہ کہ تکبر و غرور کے لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ایک طرح سے بین المتن (Inter text) تصوف پسند فکر بھی موجود ہے۔ اس توضیح کے باوجود شعر کی یہ فنی وموضوعاتی معنویت خوشگوار تاثر چھوڑ جاتی ہے کہ اس کا معنوی اطلاق کسی بھی جگہ یا مقام کی موزوں صورت حال پر ہوسکتا ہے۔

شعر و فکشن کی تخلیق کا مدار فکر و فن (Art And Thought) کے امتزاجی ملاپ پر ہوتا ہے اور فکر و خیال کے تخلیقی برتاؤ کا ہنر کسی بھی تخلیق کار کے اسلوب کو سنوارنے میں نعمتِ عظمیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔اسلوبیاتی تنقید میں کسی بھی متن کے (خصوصاً شعری و افسانوی متن) ساختیاتی رچاؤ میں تخلیق کار کا اسلوبیاتی اظہار (Stylistic Expression) بڑی اہمیت رکھتا ہے اور دوران تجزیہ شعری متن کے صوتی و لفظی، ساختی و نحوی اور فنی و معنوی لوازمات پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے۔ان لوازمات کے پیشِ نظر رفیق راز کی شاعری صوتی و لفظی، ساختی و نحوی اور فنی و معنوی خوبیوں کی عمدہ مثال پیش کرتی ہے۔ان کا شعری متن نادر اور اچھوتی لفظیات اور ترکیبوں سے مزین ہے جیسے شعلۂ حنا، نافۂ شعور، رمیدہ ہوا، دشتِ خاموش، تحفۂ حیرت، سیہ سکوت، صحرائے سیاہ، شہرذات، آئینۂ افسوں، مصحفِ ذات، سبزۂ پامال، دیدۂ شیر وغیرہ اور ان ہی تراکیب کی وجہ سے کئی اشعار علامتی روپ اختیار کر گئے ہیں۔ غالباً اپنے کلام میں ان ہی نادر ترکیبوں اور علامتی اسلوب کی موجودگی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کسی پہ حال ہمارا کھلے تو کیسے کھلے
غزل ہی کہتے ہیں بے حد علامتی ہم لوگ
ہمارا طرز بیاں ہے الگ ' جدا اسلوب
سخن کے شہرمیں کتنے ہیں اجنبی ہم لوگ

''نخل آب'' کی بیشتر غزلوں میں مذکورہ خصائص کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور فکری و فنی طور پہ کسی بھی معاصر قادر الکلام شاعر کے کلام کے سامنے بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔ان خصوصیات کے باوجود بحیثیت قاری چند محسوسات کا اظہار نامناسب نہیں ہوگا۔چونکہ آج کی دنیا' گلوبل ویلج' کہلاتی ہے اور اب شعر

وادب کا قاری محدود خطہ تک محدود نہیں رہا بلکہ آج کل سوشل میڈیا یا اورای۔ بک وغیرہ جیسے جدید اور اہم برقی وسیلوں کی بدولت کسی بھی زبان کا تخلیق شدہ یا تخلیق ہو رہے ادب کا مطالعہ راست اور ترجمہ شدہ صورت میں بہ آسانی دستیاب ہے۔آج کا قاری بدلتی صورت حال کے پیش نظر زیادہ تر وہ ادب پسند کرتا ہے جو کسی خاص علاقے کی سیاسی وسماجی، تہذیبی و ثقافتی صورت حال کی عکاسی کرتا ہو۔اس تعلق سے دیکھیں تو رفیق راز کے زیر مطالعہ مجموعے میں چند ایسی مثالیں نظر آتی ہیں جو اس زمرے میں آتی ہیں اور آشوب زندگی کی عکاسی کرتی ہیں:

جن لبوں پر کبھی روشن تھے صداؤں کے چراغ
ان پہ اک جوئے خموشی بھی رواں دیکھئے گا
نوک خنجر پہ یہ تارے یہ گل تر یہ چراغ
دیکھئے ان کو بھلا اور کہاں دیکھئے گا

ایک ادیب کا یہ اخلاقی، ادبی اور سماجی فریضہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی زمینی صورت حال کو قلم بند کر کے دوسری اقوام یا نئی نسل تک پہنچائے۔

'نخل آب' غزلیات پر مشتمل ہے۔اس میں قریباً ۱۲۵ غزلیں شامل ہیں' اور اردو غزل کا اپنا ایک فنی و ثقافتی مزاج ہے جس میں سریلی لے Melodious Tune کی اتنی اہمیت ہے کہ اردو کے علاوہ غیر اردو خواں کی سماعتوں میں بھی رس گھول دیتی ہے اور وہ بھی میر و غالب وغیرہ کی غزلوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔اس مجموعہ کی غزلیات میں سریلی لے یا غنائیت کی یہ کیفیت کم کم ہی محسوس ہوتی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ کلام راز پر فلسفیانہ افکار کا غلبہ نظر آتا ہے اور انہوں نے سنگلاخ زمینوں کو زیادہ برتا ہے۔انہوں نے کچھ غزلیں ان بحور میں بھی لکھی ہیں جن کو شعرا عام طور پر چھوتے تک نہیں کیونکہ ایسی بحور کم شگفتہ ہوتی ہیں۔

بہر حال ان ضمنی باتوں کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ راز صاحب کا کلام فنی تکمیلیت کی اس منزل پر کھڑا ہے جہاں عمومیت کے برعکس انفرادیت کے پھول نظر آتے ہیں اور جو تفہیم و تعبیر سے قاری کی طبیعت کو مہکارتے ہیں۔

ہمیں وہ سلطنتِ حرف کے شہنشہ ہیں
رفیق راز ہمارا ہی نام ہے سائیں

☆☆☆

☆......ڈاکٹر جاوید رسول

رفیق راز: صاحب اسلوب شاعر

اردو شعری تنقید میں ابھی تک کئی پیراڈائم شفٹ ہوئے۔شعر پرکھنے کے کئی روایتی زاویے اور تھیوریاں بدل گئیں۔حالی کا تنقیدی ماڈل وہ پہلا پیراڈائم تھا جس نے کلاسیکی شعری روایت کو توڑ کر شعر کی ماہیت اور مقصد کے نئے ضابطے متعین کیے۔یہ الگ بات ہے کہ وہ اصول بعد میں ''ادب برائے اصلاح معاشرہ'' کے اجتماعی تصور میں متشکل ہوئے،لیکن حالی کی تنقیدی تھیوری جس سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اس سے مفر نہیں۔بلکہ غور طلب بات یہ ہے کہ اس تھیوری کے رد میں قریباً چار دہائیوں تک کوئی ایسا نیا تنقیدی تصور پیش نہیں کیا جاسکا جس کی مثال دی جائے۔ہاں البتہ قریباً چالیس سال بعد ترقی پسند تنقیدی ماڈل نے اس تصور کو قدیم ضرور ٹھہرایا اور ایک نئے پیراڈائم کی بنیاد رکھی۔لیکن دیکھا جائے تو بجز مارکسی افکار کے اس ماڈل کے مرتبہ اصول شعر بھی کافی حد تک حالی کے اصول شعر کی ہی پیروی کرتے ہیں۔شعر غیر مبہم اور غیر علامتی ہو، زبان ایسی ہو کہ عوام و خواص دونوں بغیر کسی ذہنی دقت کے سمجھ سکیں، چند ایسے ترقی پسند شعری اصول تھے جن میں صاف طور پر حالی ماڈل کی بازگشت سنی جاسکتی ہے۔حتیٰ کہ ترقی پسندوں کا یہ اصول کہ شعر حقیقت پسندانہ ہو اور اس میں جوش و جذبہ کی فراوانی ایسی ہو کہ جاگیردار ڈر جائے اور مزدور جاگ جائے،بھی حالی کے نظریہ شعر کی یاد تازہ کرتا ہے۔لیکن اس سب کے باوجود اس میں

کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند شعری ماڈل اردو ادب کی تاریخ میں ایک موثر اور کامیاب ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ترقی پسندی ایک مضبوط روایت بن چکی تھی جسے توڑنا جدیدیت کے لیے شاید اتنا آسان نہ ہوتا اگر اس کا دائرہ کار سیاسی نعرہ بازی تک محدود نہ ہو کر رہ جاتا۔جدیدیت اردو ادب کی تاریخ میں بالخصوص شعری تنقید میں سب سے بڑا اور ہنگامہ خیز پیراڈائم شفٹ تھا جس نے شعر پرکھنے کی مروجہ روایت کو نہ صرف چیلنج کیا بلکہ ان تمام امور کی اہمیت کو نئے انداز میں اجاگر بھی کیا جنہیں ماضی میں رد کیا جا چکا تھا۔شعر کو مقصدی جکڑ بندیوں سے آزاد، شاعر کی تخیلاتی آزادی اور ذاتی ادراک کا نتیجہ سمجھا گیا۔''شعر میں کیا کہا گیا ہے''یعنی (شعر کی علمیاتی بحث) کے بجائے''شعر کیسے کہا گیا ہے''(شعر کی وجودیاتی بحث) کو جدید تنقید کا بنیادی ہدف مقرر کیا گیا اور یہیں سے دراصل شاعری کے اسلوبیاتی مطالعہ کا باضابطہ آغاز ہوتا ہے۔لیکن یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ بعض ضرورتوں کے پیش نظر کہیں کہیں پر جدید شعری تنقید کا اسلوبیاتی سروکار شعر کی لسانی پیکریت،تشبیہ استعارہ یا علامتیت کے علاوہ ان تمام تر داخلی اور خارجی عوامل سے بھی ہوتا ہے جن سے شعری اظہار تشکیل پاتا ہے۔

رفیق راز جدید شاعر ہیں، ان کا تعلق جدیدیت کی اس آخری قبیل سے رہا ہے جس میں ظفر اقبال، عادل منصوری، پرکاش فکری اور زیب غوری جیسے سر برآوردہ شعرا شامل تھے۔اب یہ امتیاز قائم کرنا کہ رفیق راز کا شعری اسلوب ان سب سے مختلف یا یکتا ہے کسی کے لیے بھی دشوار گزار ہو سکتا ہے۔ظاہر ہے یہ تمام شعرا جدید لب ولہجہ کے شاعر رہے ہیں اور جدید لفظیات یعنی ڈکشن کی کئی چھوٹی بڑی مماثلتیں ان سبھی کے شعری اظہار میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ڈکشن کے علاوہ بھی کوئی ایسا راستہ ڈھونڈا جائے جس کے ذریعے ان کے انفراد کو نمایاں کیا جا سکے۔یہی سوچ کر میں نے رفیق راز کی اردو اور کشمیری شاعری کا فکری

مطالعہ کیا اور چونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ''میں بنیادی طور پر کشمیری زبان کا شاعر ہوں'' لہذا میرے لیے ان کی فکری جہتوں کا مطالعہ کرنا اور آسان ہو گیا۔ اس طرح میں نے ان کے شعری اسلوب کے انفراد کو نمایاں کرنے کے لیے دو طریقے چن لیے:

اول: ان کے شعری اظہار میں لفظیات یعنی ڈکشن کا مطالعہ

دوم: ان کے شعری اظہار کا فکری یعنی علمیاتی مطالعہ

اتنا تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہر بڑے شاعر کی پہچان اس کے کلام میں موجود ان کلیدی استعاروں یا علامتوں کے ذریعے ہو سکتی ہے جو اس کی کُل تخلیقیت یا فکر کی نمائندہ ہوں۔ مثلاً راز صاحب کے بارے میں ہم یہ حکم تو لگا سکتے ہیں کہ وجودی اور متصوفانہ مسائل کا اظہار ان کے کلام کا خاصا ہے لیکن اسے ثابت کیسے کریں؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی شاعری میں ان مرکزی استعاروں یا علامتوں کی پہچان کی جائے جو مذکورہ حکم کو ثابت کر سکیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ بڑا شاعر بننے کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ محض خود ساختہ علامتوں کا ہی استعمال ہو جیسا کہ بیشتر جدید شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ اگر کوئی شاعر اپنے ماحول یا ثقافت سے علامتیں چن کر ان سے نئے معانی یا پیکر پیدا کرتا ہے تو اس کے بڑے شاعر بننے کے امکان بھی بڑھ جاتے ہیں۔ جیسا کہ راز صاحب کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ نخل، ابر، شعلہ، خامشی، سکوت، روح، نور اور سیاہ جیسی علامتیں صاف طور پر ہم کشمیریوں کے اجتماعی لاشعور کی علامتیں ہیں۔ یہ ہمارے شعری اور مذہبی سرمایہ کے ذریعے ہمارے ماحول میں رچ بس چکی ہیں۔ ظاہر ہے راز صاحب جس کشمیری شعری روایت کے امین ہیں اس کا براہ راست تعلق وجود کی مطلق حقیقتوں سے رہا ہے۔ لہذا مذکورہ تمام علامتیں پہلے سے ہی معنی کی کوئی نہ کوئی صورت ہمارے ذہن میں رکھتی ہیں۔

نخل ہوس کے سایے میں جلنے سے پیشتر
باغ بدن پہ چھائی ہے کیسی بہار دیکھ

☆

آوارہ گرد ابر کے ٹکڑے کا کچھ نہ پوچھ
پل بھر کو مہر و ماہ نے چہرہ چھپا لیا

☆

والیِ شہر ابر تھا لیکن
برف زاروں میں بو گیا شعلہ

☆

گزر نہ جائے کہیں خامشی میں یہ شب بھی
مراقبہ تو ہوا اب ذرا جلال میں آ

☆

ہم کہ ادھر سوچ میں ڈوب رہے تھے ادھر
سرحد ادراک پہ پھیل رہا تھا دھواں

☆

جب تک کیا سکوت کا میں نے مقام طے
گردش میں تذکرے رہے میرے وجود کے

☆

روح کی گہرائیوں میں اک آگ روشن تھی کبھی
اب پس دیوار تن بس اک دھواں ہے اور میں

☆

پھر کٹ نہ جائے قافلۂ نور راہ میں
پھر روشنی طلب نہ کرے کوفۂ سیاہ

ایسا نہیں ہے کہ مذکورہ علامتوں کا استعمال صرف راز صاحب کے یہاں ہی ملتا ہے دوسرے اردو شعرا کے یہاں بھی یہ الفاظ مستعمل ہیں۔ چند مثالیں دیکھ لیجیے:

دشت بے سمت سے گزری ہے ہوا آہستہ
شجر شب سے گرا برگ صدا آہستہ

(زیب غوری)

دیکھتا ہوں روشنی کا نخل کمھلاتا ہوا
لمحہ لمحہ پانیوں پر شاخ گل جھکتی ہوئی

(زیب غوری)

چھیڑا تو بہت سبز ہواؤں نے مگر زیب
شعلہ ہی کوئی خاک کے خرمن میں نہیں تھا

(زیب غوری)

اندر کا جب سکوت بھی زیر و زبر ہوا
کیا خامشی کا مول کہ باہر ہوا ہے تیز

(پرکاش فکر)

روح سے گرد سفر کا بوجھ ہے چمٹا ہوا
ہر کنواں خالی ملا ہے ہر جگہ ڈالی ہے ڈول

(پرکاش فکر)

ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ سوال اٹھا ہوا ہو کہ ''شجر شب'' کو ''نخل شب'' کی مثال کے طور پر کیوں پیش کیا گیا۔اس ضمن میں عرض ہے کہ ''نخل'' بطور

نشان (Signifier) شجر یا درخت ہی کی امیج ہمارے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ جیسے رات اور شب، سورج اور خورشید، نور اور روشنی، ابر یا بادل اور سکوت یا خامشی وغیرہ ۔گویا ثابت یہ ہوا کہ راز صاحب کے کلام کی کلیدی لفظیات کا استعمال دیگر جدید شعرا کے یہاں بھی ہوا ہے لیکن چونکہ راز صاحب کا تخلیقی ذہن ایک خاص روایت سے متاثر رہا ہے اس لیے ان کے شعری اظہار میں ان علامتوں کا بالخصوص پیکریت کے لحاظ سے دوسروں سے مختلف اظہار ملنا فطری ہے۔ مثلاً راز صاحب 'نخل کے سایے میں جلنے' کا پیکر کھینچتے ہیں لیکن ہمارے مشاہدے کے مطابق تو آدمی دھوپ میں جلتا ہے جبکہ پیڑ کا سایہ اسے جلنے سے بچاتا ہے تو کیا یہ پیکر مہمل ہے۔ ہرگز نہیں، بلکہ یہ سارا کھیل لسانی پیکریت کا ہے جس نے پیڑ کی معروضی حقیقت کو ہی بدل کے رکھ دیا ہے۔ غور کیجیے تو لفظ ''جلنے'' سے پیڑ جس ہوس ناکی کا نمائندہ بنا ہے اس نے عام مشاہدے کے برعکس پیڑ ہی کی صورت میں ہمارے لیے ایک نئی شئی کو جنم دیا ہے۔ ہمارا مشاہدہ تھا کہ پیڑ کا سایہ ٹھنڈک یعنی روحانی تسکین بہم پہنچاتا ہے لیکن اب یہ سایہ آگ یعنی خواہش نفس کو ابھارتا ہے۔ یہاں جب تقابل کے لیے زیب کے مصرع ''شجر شب سے گرا برگ صدا آہستہ'' میں شجر کے استعمال اور اس سے پیدا ہونے والی پیکریت کو ملاحظہ کرتے ہیں تو ''پیڑ سے پتے کا آہستگی سے گرنا'' راز صاحب کے پیکر کے مقابلے میں علم کے بجائے مشاہدے کو ظاہر کرتا ہے۔ اسلوبیاتی اعتبار سے دیکھیں تو دراصل یہیں پر راز صاحب کا انفراد نمایاں ہوجاتا ہے اس صورت میں کہ وہ لفظ (شئی) کی معروضی حقیقت کو بدل کر نیا معنی یا نیا پیکر تراشتے ہیں۔ اچھا! ان کے کلام کی ایک اور دلچسپ خصوصیت یہ بھی ہے کہ بعض جگہوں پر علامتوں کی تکرار، تکرار خیال کا موجب بن جاتی ہے۔ لیکن علامتوں کے استعمال اور لفظوں کی ترتیب و تنظیم میں ان کی شعوری کارفرمائی اس قدر چونکا دیتی ہے کہ خیال ایک ہونے کے باوجود شعر میں کوئی نہ کوئی تغیر ضرور

محسوس ہوتا ہے۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھ لیجیے:

اب بھی ہلتا ہے مرا نخل بدن سر تا پا
اب بھی چلتی ہے ہوس ناک ہوا دھرتی پر

ملنے لگا برگ برگ نخل بدن کا
آئی کہاں سے یہ جنگلوں کی ہوا سی

☆

دود خیال ہے کہ خموشی کا درد ہے
اک لمس ہے کہ معرفت قربت سیاہ

مری خامشی کہ واقف ابھی حرف سے نہ ہو
ابھی اس کو ہے گزرنا کئی سخت مرحلوں سے

یہاں پہلے اور دوسرے شعر میں خیال ایک ہی ہے یعنی ''ہوس ناکی سے بدن کا لرزیدہ ہونا'' لیکن دونوں میں علامتی نظام کی تشکیل ایسی ہے کہ خیال ایک ہونے کا شائبہ تک نہیں گزرتا بلکہ دونوں شعر جداگانہ محسوس ہوتے ہیں۔جہاں پہلے شعر میں ''ہوس ناکی'' کا براہ راست استعمال ہوا ہے وہیں دوسرے شعر میں ''جنگلوں'' کو ہوس ناکی کی علامت کے طور پر برتا گیا ہے جس سے فائدہ یہ ہوا کہ شعر میں تکرار خیال کے باوجود شعری حسن زائل ہونے سے بچ گیا۔اسی طرح تیسرے اور چوتھے شعر میں بھی خیال ایک ہے لیکن علامتی سروکار دونوں میں مختلف ہے۔آخری شعر میں لفظ ''حرف'' ''معرفت قربت سیاہ'' کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔واضح رہے ''قربت سیاہ'' لاشعور سے رغبت جبکہ معرفت اس کی حقیقت کے ادراک کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔گویا ''حرف'' کی قدر ''معرفت'' میں مضمر ہے۔کہنا یہ ہے کہ ان اشعار میں تکرار خیال کے باوجود مجموعی حسن برقرار ہے۔یہی

دراصل راز صاحب کی پہچان ہے کہ وہ لفظوں کی ترتیب و تنظیم میں دھیان صرف کرتے ہیں، یہ نہیں کہ جو ذہن میں آیا بس لکھ دیا۔ برحق ہے کہ ان کے کلام میں تخلیقی شعور کی کارفرمائی کسی بھی صاحب ذوق قاری کو متحیر کر سکتی ہے۔

یہ ان کے کلام کے اسلوبیاتی مطالعہ کا پہلا طریقہ تھا۔ اب ذرا مطالعہ کا رخ ان کے کلام کی مرکزی فکر کی طرف موڑتے ہیں، ممکن ہے اس فکر کے ذریعے ان کا اسلوبیاتی انفراد نمایاں ہو ___ جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ راز صاحب کی شاعری کے حوالے سے یہ حکم تو لگایا جا سکتا ہے کہ وجودی اور متصوفانہ مسائل کا اظہار ان کے کلام کا خاصا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے ثابت کیسے کریں۔ اس کے لیے ہم نے طریقہ اول کے ذریعے ان کے کلام سے جن کلیدی علامتوں کا حوالہ دیا ہے وہ نمونے کے طور پر ان کے فکری منہج کو تو ظاہر کرتی ہیں لیکن مفروضے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ طریقہ ناکافی ہے۔ اس لیے ان علامتوں کی مزید اور تفصیلی گرہ کشائی ناگزیر بن جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادھر راز صاحب کشمیری شعری روایت سے چیزوں کو نکال کر نئے انداز سے استعمال میں لا رہے تھے اور ادھر اردو میں جدیدیت کے زیر اثر نئی شعری لسانیات کی تشکیل کا سلسلہ جاری تھا۔ صرف گرامر کی سطح پر ہی نہیں بلکہ فکر کی سطح پر بھی نئی تبدیلیوں کے راستے ہموار کیے جا رہے تھے۔ انسان کی تنہائی اور وجودی بحران کو مرکزی حسیت کے طور پر پیش کرنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جدیدیت دراصل ردعمل کی صورت حال پیدا کرنا چاہتی تھی۔ شب خون میں شائع ہوئی بیشتر غزلوں میں وجودی مسائل کی بازگشت کا یکساں ہونا محض کوئی اتفاق تو نہیں تھا، ظاہر ہے یہ ترقی پسندی کے اجتماعی نرغے سے نکلنے کا ایک لائحہ عمل تھا جسے خوش قسمتی سے وجودیت کی پشت پناہی حاصل رہی۔ بہرکیف! یہ نئی تبدیلیاں راز صاحب کے شعری مزاج کے موافق تھیں۔ چونکہ وہ کشمیری شعری روایت کے ذریعے وجودی مسائل میں پہلے سے

ہی دلچسپی دکھا چکے تھے لہذا ان کے لیے یہ راہ مزید آسان ہوگئی۔لیکن ان کا انفراد دیکھیے کہ انہوں نے صرف متصوفانہ شعری روایت پر ہی قناعت نہیں کی بلکہ یہ جانتے تھے کہ یہ پیرائیہ اظہار کلاسیکی شعریات کے احیاء میں ان کا معاون تو ہوسکتا ہے لیکن انہیں جدید شعرا کی صف میں شامل نہیں کرسکتا۔یہی سوچ کر انہوں نے نئی اور پرانی لفظیات کے ساتھ ساتھ تصوف اور وجودیت کی ایک امتزاجی صورت پیدا کی۔

جب تک کیا سکوت کا میں نے مقام طے
گردش میں تذکرے رہے میرے وجود کے

☆

میں اپنے ہونے کے جنگل میں کھوگیا ہوں کہیں
میں لاپتہ ہوں خود اپنا سراغ پا کر بھی

☆

انسان کیا ہے اصل میں ظلمات ہجر میں
تغیر کی تلاش میں خواب سحر زدہ

مذکورہ اشعار میں دیکھ لیجیے تصوف اور وجودی فلسفے کی آمیزش کہاں کہاں نہیں ملتی۔سکوت یا خامشی جہاں ایک طرف صوفی روایت میں مراقبے کا استعارہ ہے وہیں دوسری طرف یہی سکوت وجودی فلسفے میں Solitute خلوت یا تنہائی کا استعارہ ہے۔ بقول کرکیگارڈ ''مجموعی حیثیت سے تنہائی کا دورانیہ انسان کے اندر روح کے موجود ہونے کی علامت ہے''۔اس طرح پہلے شعر میں سکوت کا مقام طے کرنا دراصل اس دورانیہ کی طرف اشارہ ہے جسے کرکیگارڈ "Longing For Solitude" کا نام دیتا ہے۔اسی شعر میں وجود کے تذکروں کی گردش دراصل ہونے یا نہ ہونے کی کشمکش کو ظاہر کرتی ہے جو یکساں طور پر تصوف اور وجودیت دونوں سے مطابقت رکھتی ہے۔پھر

دوسرے شعر میں بھی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ شاعر کو ہونے یعنی Existence کا وہی مسئلہ درپیش ہے جو پہلے شعر میں تھا۔ یہاں عرفان ذات یعنی وجود برائے خود Being For Itself کا جو مضمون باندھا گیا ہے اس میں تصوف اور وجودیت کا امتزاجی آہنگ نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس کے برعکس چوتھے شعر میں اس سب سے بڑے فلسفیانہ مسئلے کی وضاحت ملتی ہے جس پر جدید شاعری کی مجموعی فکر کا ارتکاز رہا ہے۔ یعنی انسان۔ یہاں اس شعر کی الگ سے کسی وضاحت کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن چونکہ یہ شعر ہمارے لیے امتزاج والے قضیے کو حل کرسکتا ہے لہذا تھوڑی سی وضاحت ضروری بھی ہے۔ خیر، اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ تصوف اور وجودیت دونوں کے مطابق انسان دراصل اس دنیا میں اپنی اصل کی طرف لوٹنے کے سفر میں ہے اور یہ دنیا اس کے لیے محض ایک ظلمت کدہ ہے۔ مثلاً سارترے کا مشہور قول ہے "Man is condemned To Be Free" یعنی انسان کو اس دنیا میں آزاد رہنے کی سزا دی گئی ہے، وہیں کامو کہتا ہے کہ چونکہ دنیا اور اور انسانی زندگی لایعنی ہیں اس لیے خود آگہی رکھنے والا انسان ہمیشہ اپنی زندگی کے لیے کسی نہ کسی معنی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، جیسا کہ راز صاحب کہتے ہیں ''انسان کیا ہے؟ تغیر کی تلاش میں خواب سحر زدہ''۔ راز صاحب کی شاعری میں فکر کی یہ انتہا واقعی لاجواب ہے۔ یہی تو ان کا خاصا ہے جو انہیں دوسرے جدید شعرا میں منفرد مقام بخشتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ بھی ان کے کلام میں اسالیب فکر کی کئی جہتیں ہیں جو ان کے امتیاز کو نمایاں کرسکتی ہیں، مثلاً فنادگی کا فلسفہ اور صوفی اصطلاح میں ''لا'' کا فلسفہ ان کے فکری معروضات میں شامل ہیں۔

راز فانی کے تصور میں گرفتار ہیں ہم
ایک ہی رنگ سے ہیں شام وسحر آلودہ

☆

پھر خوف نے دیوار و در و بام کو چوما
پھر شب کی سیاہی نے مرا نام لیا ہے

☆

کچھ نہیں تھا بجز تیرگیٔ فکر فنا
اپنے ہونے کا شرر ہی رہ ادراک میں ڈال

☆

منتظر ہمارے ہونے کا اک کرب لاوجود
ہم کیا ہیں ایک شعبدۂ دیدۂ سیاہ

☆

بس یہی ہے میرے ہونے کا ثبوت
میرے اندر ہے کوئی انکاری

اگرچہ فنادگی مذہبی روایات کے ذریعے ہزاروں سال پہلے ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصہ بن چکی تھی لیکن وجودی فلسفے نے اس سے پیدا ہونے والی کرب انگیز کیفیات کو دریافت کرنے کی از سرنو کوشش کی ہے۔ ہائڈیگر کے فلسفے میں Dread یعنی دہشت درحقیقت انسان کی محدودیت اور کم مائیگی کے احساس کا نتیجہ ہے۔ چونکہ تمام تر موجودات میں سے انسان وہ واحد وجود ہے جو اپنے ہونے کا شعور رکھتا ہے اس لیے احساس مرگ اور خواہشات کی ناتکمیلیت کا احساس اسے دہشت میں مبتلا کرتا ہے۔اس احساس سے ابھرنے کے لیے بلکہ اس کا سامنا یعنی اسے Confront کرنے کے لیے راز صاحب بھی وجودی فلسفیوں کی طرح ''ادراک ذات'' کو ضروری سمجھتے ہیں۔اب جہاں تک ان کے کلام میں "لا" کے فلسفے کا تعلق ہے تو یہ بھی فقط کوئی متصوفانہ فکر نہیں بلکہ اس سے وہ سینسر شپ بھی مراد لی جاسکتی ہے جو بعض لاشعوری

خیالات کو نکارتی ہے۔ وجودی فلسفے میں یہ شئیت سے انکار کے متحمل شعور کی علامت ہے۔اس طرح راز صاحب کے فکری موضوعات کی وضاحت سے یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ ان کا شعری اظہار اپنے خاص اسلوب اور فکری منہج کے باعث دیگر جدید شعرا سے مختلف تھا۔ہم نے دو مختلف طریقوں سے ان کے اسلوبیاتی انفراد کو نمایاں کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن بالآخر یہ قاری کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہمارے اطلاقی عمل کو موثر جانتا ہے۔

☆☆☆

☆......ڈاکٹر جاوید انور

رفیق راز کے تخلیقی زاویئے

رفیق رازؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تخلیقی فکر اپنے ادبی میلانات کے حوالے سے خود کو جدیدیت کی ادبی فکر اور میلانات سے مربوط کر دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں ارادی اور غیر ارادی طور پر جدید عناصر کی کار فرمائی میرے اس خیال کی مدلل تصدیق کرتی ہے۔ مثال کے طور پر جدیدیت کا ایک اہم عنصر وجودیت کا فلسفہ ہے جسے مغرب اور مشرق دونوں جگہ چند خیالات سے مطابقت ہو کے بھی مختلف مقامات پر کلی بنیاد کے باوجود شرح و تعبیر میں بڑی بڑی تفریقات کا اعزاز حاصل ہے۔ چونکہ رفیق رازؔ ان تمام نظریات سے بخوبی واقف ہیں اس لئے ان کی شاعری کی انفرادی خصوصیات بھی اس میں ضم ہوگئی ہیں اور اس طرح رفیق رازؔ کے یہاں یہ فلسفہ ایک تخلیقی جہت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ جدیدیت میں فردیت پر جو سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اس کی مثالیں بھی رفیق رازؔ کے یہاں بہ کثرت مل جاتی ہیں۔ حمد و نعت کے اشعار میں بھی انہوں نے اپنا تخلیقی جوہر استعمال کیا ہے۔ اس حوالے سے چند اشعار ؎

اب بھی اس پار کے منظر نظر آتے ہیں مجھے
خاکِ امید کو کچھ اور پریشاں کر دے

☆

رہاہے تیرے سوا دل میں اور کیا باقی
کہاں گئے وہ تمنا و خواب یا باقی

☆

ابھی تو آنکھ ہے مصروف جلوۂ حیرت
ابھی زمین ہے تھوڑی سے زیرپا باقی

☆

کیسا شہہ سوار تھا، برق کی تلاش میں
کائنات کو غبار سے غبار لکھ گیا

☆

کھلتی ہے آنکھ جلتے مکانوں کے درمیاں
لگتی ہے آنکھ پڑھ کے فسانے ثمود کے

ان اشعار سے واضح ہے کہ رفیق رازؔ نے حمد ونعت کے حوالے سے عاجزی اور انکساری کا جو عمل پیش کیا ہے وہ ایک طرح سے کائنات میں انسان کی فضیلت کی ضمن میں انسان کے اعمال ومقاصد کی جانب توجہ منعطف کراتا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں اپنی سماجی وجودیت اور دینی وجودیت دونوں کو معاشرے کے ایک ہی محور پر گردش کرنے کا عمل تسلیم کیا ہے۔ رفیق رازؔ اپنے تخلیقی رویے میں فکر اور ہیت کے درمیان کہیں دوری بنائے رکھتے ہیں اور کہیں اس دوری کو ختم کر کے ایک اکائی کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان کا فنی شعور اور لسانی بصیرت بھی اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل کا ایک ترقی یافتہ تصور کیا ہوتا ہے، کیا ہونا چاہئے اور کیا ہوسکتا ہے۔ چند اشعار

آنکھ میں پیہم ہوائے دید کا محشر بپا ہے
خاک اڑتی ہے برابر منظر بے منظری کی

لمس کے تپتے ہوئے صحرا میں رات
پیاس بھی تھی، بارش رحمت بھی تھی

☆

وسعتوں کا سلسلہ درپیش تھا
راہ میں اک منزلِ حیرت بھی تھی

☆

آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلوں نے کیا کام
منظر کو دھواں ہونے کی چاہت بھی نہیں تھی

☆

آگ کا دریا بھی ہے، عقل بھی ہے، عشق بھی
میں ہی تذبذب میں ہوں، میں ہی ہوں تیار بھی

رفیق رازؔ نے اپنی شاعری میں لطیف تر جذبات واحساسات کو بہت کم جگہ دی ہے۔ایسے موضوع کے بیان میں بھی کہیں کہیں حالات کی سختی تخلیقی ذہن پر غالب آ گئی ہے۔جیسا کہ مندرجہ بالا شعر نمبر۲،اور۴ سے ظاہر ہے۔ایک تیسری صورت بھی ان کے یہاں علامت کی تہہ میں پوشیدہ ہے۔(شعر نمبر۵) دراصل یہ رفیق رازؔ کے تخیل کی بیتاب لہروں کا کمال ہے۔شعور ولاشعور میں جمع تجربات ومشاہدات پوری قوت ارادی کے ساتھ ان کے وجدان کے پس پشت اظہار کی کیفیت سے گزر کر صفحہ قرطاس پر اپنی جگہ بناتے ہیں۔اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات نے ان کے شعری وجدان کو جو ایک نیا رجحان دیا ہے، وہ بھی ان کی شاعری میں ہو رہی مختلف تبدیلیوں اور تجربہ کاری کے راستے ہموار کرتا ہے۔یقیناً اپنے ماحول اور حالات کا اثر شاعر کے تخیل پر ہوتا ہے۔لیکن جب اس کے پس منظر میں ساری دنیا کے حالات کو آئینہ بنا دیا جائے

یعنی جب ذات میں کائنات کے ضم ہونے کا عمل شروع ہو جائے تو پھر شعری اظہار ذاتی یا اردگرد کے ماحول اور حالات تک محدود نہ رہ کر آفاقی تناظر اختیار کر لیتا ہے۔

ایک عجب آگ منظروں میں لگی تھی
شعلے نہ تھے ابر گوں دھواں بھی نہیں تھا

☆

اونچے پربت کا پتہ تم سے ہر اک پوچھے گا
گہری کھائی کی طرف ہاتھ اٹھائے جانا

☆

ہم خاک کف پائے نگاراں تھے بصد شوق
ان تیز ہواؤں کے حوالے نہ ہوئے تھے

☆

یہ گرجتا ہوا قلزم بے کراں کا سماں ہر طرف
لکھ نہ دے پیاس کی چلچلاتی ہوئی داستاں ہر طرف

☆

میں خود ماضی ہوں یا ماضی مرا ہے ساتھ میرے
لگا ہے داغ اک ایسا کہ مٹتا ہی نہیں ہے

ان اشعار میں آگ، منظر، شعلہ، دھواں، پربت، کھائی، تیز ہوا، گرجتا ہوا قلزم اور ماضی جیسے الفاظ جہاں ان کے اردگرد کے مخصوص ماحول اور حالات کی ترجمانی کرتے ہیں وہیں آفاقی سطح پر اپنی علاماتی اور استعاراتی جہات اختیار کر لیتے ہیں جن کا تعلق کسی بھی ملک اور کسی بھی قوم سے ہو سکتا ہے۔ یہ تجربے جدید ذہن کے ڈکشن، ہیئت، مواد، اسلوب اور تکنیک کی نوعیت کا جہاں پتہ دیتے ہیں، وہیں ان کے

تجربوں اور تبدیلیوں کا تخلیقی سطح پر دفاع بھی کرتے ہیں۔عنوان چشتی کے مطابق:

"ہر رجحان نے شاعری کے دائرے میں کسی نہ کسی قسم کی تبدیلی اور تجربے کو فروغ دیا ہے۔عشق کے روایتی تصور میں تبدیلی کا رجحان، غزل میں حقیقت پسندی کا رجحان، عشق کے ارضی و جسمانی تصور کا رجحان، اجتماعی اور سماجی شعور کا رجحان، وطن پرستی کا رجحان، سیاسی رجحان، اشتراکی رجحان، اصلاح کا رجحان، نئی دنیا کی تشکیل کا رجحان، روحانی رجحان، جنسی و جسمانی نیز مناظر فطرت کی عکاسی کا رجحان، فراریت کا رجحان، طنز و مزاح کا رجحان، پیروڈی کا رجحان اور تجرباتی رجحان وغیرہ ایسے رجحانات ہیں جو اردو شاعری کی شریانوں میں خون بن کر دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جنہوں نے شاعری کو دونوں سطحوں پر تبدیلی اور تجربوں سے روشناس کیا ہے"

اگر پیروڑی کے رجحان کو نظر انداز کر دیا جائے تو باقی تمام کا تعلق رفیق راز کی شاعری سے ہے۔

کچھ تو اس کے ہونے کی ہر طرف خبر پھیلے
اے ہوائے صحرائی خاک ہی اڑا اس کی

☆

آہنگ لاشریک لہٗ، ہر نفس میں ہے
جوبن پہ ایک موسم اسرار مجھ میں ہے

☆

اس قلندر میں بات کچھ ہے ضرور
راکھ ملتا ہے جسم خاکی پر

رفیق رازؔ اپنی شاعری کیلئے عہد جدید کے ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو مختلف ڈکشن، ہیت اور آہنگ کے اعتبار سے کچھ نیا اور انوکھا کرنے کی قوت

اپنی لسانی تشکیل میں رکھتے ہیں۔ اس کے لئے رفیق راز نے مغربی اور دیگر مشرقی زبانوں کے ادب کے براہ راست مطالعے اور تراجم کے سرمائے کے مطالعے سے بھی نئے امکانات اپنی شاعری میں پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے عربی ، فارسی اور اردو کی روایتی شاعری بالخصوص صوفیانہ شاعری سے بہت گہرا اثر لیا ہے۔ لیکن اپنے مشاہدے اور ادب میں لسانی اور تخلیقی سطح پر ہو رہی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے جس جرأت مندی سے انہوں نے شاعری کے مروجہ روایتی پیکروں میں تبدیلی کا سراغ لگایا ہے، اس نے آنے والی نسلوں کیلئے بھی نئی روشنی پیدا کی ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کو نئی جہت کی طرف اٹھائے گئے مثبت قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

پانی سراب فکر کی موجوں سے دستیاب
سایہ کئے ہوئے ہے مسافر پہ گرد راہ

☆

خوف خزاں تو رہتا ہے ہر موسم میں سرسبز مگر
ایک ہری آواز پہ اکثر زردی چھائی رہتی ہے

☆

یوں تو میں نے خواب کئی دیکھے ہیں، دکھائے کچھ اس نے
رات کے خواب نے لیکن دہشت روح میں پھیلا رکھی ہے

☆

روشنی میں ہے تر فقیر کی چپ
اک شعاع فلک نورد سی ہے

رفیق راز نے ردیف ، قافیہ کی داخلی اور صوتی تبدیلیوں پر بھی خاصی توجہ کی ہے جس کی مثال ان کے مجموعہ کلام "انہار" کی آخری ۲۳ غزلوں میں ردیف

"سیہ "اور "سیاہ" ہے اور ایک غزل کی "سیہ سیہ "۔ اس اعتبار سے انھوں نے مشکل قافیوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً جستجو، پہلو، زباں، دروازہ، دیدۂ حرمت، ابتری، تودۂ شاداب، شبنم، وحشت، نالے، طلب، اظہار، پیکر، نوا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان قافیوں کو ردیف "سیاہ" اور "سیہ "کے ساتھ نبھانا ہی بہت تخلیقی عرق ریزی چاہتا ہے۔ رفیق رازؔ نے انہیں جس طرح تخلیقی فن پارے کا حصہ بنایا ہے، وہ ان کی قادرالکلامی پر دال ہے۔ چند اشعار اس تعلق سے ملاحظہ ہوں:

دیوارو در پہ اب تو چمکتی ہے خامشی
اس گھر میں ہانپتی تھی کبھی گفتگو سیاہ

☆

اک جوئے برق وموجہ بوئے رواں سیاہ
میری سیاہ فکر میں ہے لامکاں سیاہ

☆

شہر شک' شام گماں' شعلہ ٔ نا امیدی
نفس مضموں بھی سیہ اور حوالے بھی سیہ

☆

وقفے وقفے سے اذانوں کا دھواں اٹھتا ہے
سانس لیتا ہے ابھی شہر کا مینار سیہ

☆

فصل یقینِ سبز پر ٹوٹ پڑی ہے بار ہا
سیلِ شرار کی طرح جوئے گماں سیہ سیہ

☆

جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے کہ رفیق رازؔ نے زبان کی تراش خراش کو مواد، ہیت اور تکنیک کے تجربوں سے منسلک کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جدت طبع سے وہ رنگ بھرے ہیں کہ فکر و خیال اور جذبہ واحساس علامتی، اساطیری اور کہیں کہیں دیو مالائی تمثیلوں کی شکل میں مشکل اور تلخ بیانات کو سنجیدہ پیرائے میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ رفیق رازؔ نے زبان اور تخلیق کے مروجہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہو بلکہ جہاں جہاں بھی اپنے خیالات کے اظہار کیلئے انہوں نے مروجہ الفاظ کی تنگ دامانی کو محسوس کیا وہاں ترمیم و تنسیخ کے نسخوں سے کام ضرور لیا ہے اور یقیناً یہ ان کے خیالات، محسوسات اور جذبات کی فطری آواز ہے جس نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

دیوار و در سے ٹپکے یونہی قطرہ قطرہ زہر
سوئے ہوؤں پہ موت کا سایہ پڑا رہے

☆

ایک پودا اگا ریگ زاروں میں جو اب بھی آواز دیتی ہیں اس پیاسے کو
ڈوبے ڈوبے کناروں کی مدہوشیاں ٹھہرے ٹھہرے سمندر کی گہرائیاں

☆

بولے تو اک سکوت کے شعلے نے ڈس لیا
لب سی لئے تو والی شہر صدا ہوئے

☆

عجیب لوگ تھے منزل کی بات کرتے تھے
چمکتی آنکھوں میں عکس غبار دشت لئے

☆

یہ آسماں ہے مرے سر پہ اور زمیں نیچے
میں رینگتا ہوں ازل سے یہ تاج وتخت لئے

رفیق راز نے اپنے اشعار میں زبان کا جو انفرادی اور ایک حد تک باغیانہ استعمال کیا ہے اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی ذہن اردو ادب کی تحریکوں اور رجحانوں سے خاصی حد تک واقفیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ان تحریکوں سے استفادہ کرتے ہوئے شاعری میں برتنے کی فنی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ان کے اشعار جہاں داخلی اور ذاتی حقائق کا اظہار کرتے ہیں' وہیں خارجی حقائق سے بھی چشم پوشی نہیں کرتے۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ داخلی واردات کتنی بھی ذاتی کیوں نہ ہوں، اس کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں خارجی حقائق سے ضرور ہوتا ہے ورنہ وہ محض تصوراتی نہج تک تو کارآمد ہوسکتی ہے لیکن جمالیاتی عناصر کے فقدان کے سبب اس کی سطح بہت کمزور ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ ذات اور کائنات کے موضوعات کو احاطۂ تخلیق میں لانے کیلئے بحور و اوزان کے مشکل، مشکل تر اور مشکل ترین انتخابات کے سبب آہنگ کے اعتبار سے انوکھی ہیت تشکیل خلیل الرحمٰن اعظمی کے ایک نظریئے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ حالانکہ ان کا یہ بیان بالخصوص نظم کے حوالے سے ہے وہ یہاں پوری نئی شاعری سے گفتگو کر رہے ہیں جس سے کافی حد تک اسے صنف غزل سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے اور آج کے عہد پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے لفظوں میں:

"یہ دور برصغیر ہندو پاک میں تہذیبی، سیاسی، اخلاقی اور سماجی اقدار کی پامالی کا دور ہے۔ نظریہ، عقیدہ، نصب العین، آدرش، خوش آئند مستقبل کا خواب، جماعتی وابستگی اور اجتماعی تحریکوں پر یقین کا طلسم ایک ایک کرکے بکھرنے لگا۔ مینی فیسٹو، اعلان نامے، طے شدہ راستوں پر چلنے اور چل کر اپنی منزل مراد تک پہنچنے کے دعوے بے معنی اور بے سود نظر

آنے لگے۔ نیکی، بدی، جھوٹ، اور سچائی، محبت اور نفرت، خلوص اور عدم خلوص کے بنے بنائے پیمانے بے کار نظر آنے لگے...... نئی شاعری اب آزاد نظم کے مترادف نہیں سمجھی جاتی۔ نہ اس کی متعین اور سکہ بند ہیت ہے اور نہ اس کا بندھا ٹکا اسلوب، پابند، نیم پابند، معریٰ، آزاد ہر طرح کی اسالیب میں نئی جہتیں پیدا ہوتی ہیں اور نئی حسیت نے ان میں تازگی پیدا کی ہے۔ نئی علامتیں، الفاظ کے تلازمے، نئے امیج، نیا منظر نامہ اور نئی فضا کا ہر جگہ احساس ہوتا ہے۔"

اب رفیقؔ راز کے چند اشعار کو دیکھا جائے۔

مجھ سے ہوائے تند پریشان ہے بہت
صحرا شناس حرف جنوں کا غبار ہوں

☆

بس اک شبیہہ خواب تھی جب تک نگہ میں تھی
اتری ہماری روح میں درد و الم ہوئی

☆

نہ جانے اگلی منزل کیسی ہوگی
پریشاں حال ہے یہ راستہ بھی

☆

صحراؤں کے سفر پہ روانہ ہوا تھا میں
بکھرا پڑا ہوں ریت میں آثار کی طرح

☆

آہنگ پر وقار تو مجروح کر گیا
حرف دعا سے دولت تاثیر بھی نہ لے

اب یہ ممکن ہے کہ محشر ہی بپا ہو جائے
خواب میں آنے لگے خواب دکھانے والے

رفیق راز نے اپنی شاعری میں خارج سے داخل کی طرف رخ کرتے ہوئے فرد سے کائنات کے رشتے کی دریافت کے سلسلے میں شخص اور جذباتی سطحوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔شعری تخیل میں شرکت ذات کے حوالے سے انہوں نے داخلی کیفیتوں کو اپنے اردگرد کے ماحول اور لامحدود پھیلی ہوئی کائنات سے اس طرح منسلک کیا ہے کہ اسلوبیاتی اظہار اس عہد کے مروج لسانی رویئے سے بہت مختلف نظر آتا ہے یا اس کے آگے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ایک زوال پذیر تہذیب کی نمائندگی اور اس کے سائے میں اپنی شعری ذات وصفات کو لے کر چلنے کا عمل ذہنی پیچیدگی اور تخلیقی پیچیدگی کے درمیان سے بھی کسی نہ کسی مثبت راہ کا سراغ لگا لیتا ہے اور کامیابی سے اپنی منزل کی طرف رخ کرتا ہے:

تم کہ برفیلی گپھاؤں میں کہیں بھی نہ ملے
ہم کہ مٹھی میں لئے شمس وقمر آئے تھے

☆

روشن ہے اک لکیر سر آسماں ابھی
کتنی ہے سخت جاں یہ دعائے سحر زدہ

☆

ڈالی گئی تھیں کلفتیں اس میں ہزار ہا
دامن ہے تار تار جلالی فقیر کا

رفیق راز نے شاعری کی اخلاقی قدروں کو زمان ومکاں کے ادراک کے ساتھ ساتھ بعض لمحاتی کیفیتوں اور شاعرانہ فکر واحساس کے مختلف پہلوؤں کے آئینے

میں بھی پرکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے تشکیلی اوراثباتی پہلوؤں کا حصہ ادبی حسیت سے بہت استوار ہے۔ رفیق رازؔ اپنے عہد کی ہر بدلتی ہوئی حقیقت کو اس طور پیکر میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں کہ موجودہ عہد ہی نہیں بلکہ آنے والے عہد میں بھی ان کی شاعری مشعل راہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے:

میری وحشت کہہ رہی ہے بار بار
اس جگہ پہلے کبھی صحرا نہ تھا

☆

میرا چراغ مانگ رہا ہے دعائے صبح
ظلمت کدے میں گرتی ہوئی بجلیوں کے بیچ

☆

ہر شخص اپنے آپ سے مصروف ہے بہت
تنہا نہیں ہے کوئی بھی تنہائیوں کے بیچ

رفیق رازؔ نے زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور شعری روایت کی نئی تبدیلیوں کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس طرح اپنی شاعری کو سنوارا اور نکھارا ہے کہ ان کی شاعری موجودہ اور آنے والے عہد کیلئے نئے شعری افق کی جستجو کے زاویئے فراہم کرتی ہے۔ رفیق رازؔ نے اس جانب خود اپنے شعر میں یوں اشارہ کیا ہے۔

ہمارے خون کی خوشبو کہ جاگ اٹھے گی
معطر اس سے یہ اکیسویں صدی ہوگی

☆☆☆

☆......ریحانہ اختر

رفیق رازؔ...... متحرک فکر کے شاعر

رفیق رازؔ جموں وکشمیر کے نمایاں شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ادھر کئی برسوں سے ان کی شہرت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔انہوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے اردو کے اہم شعراء میں اپنا ایک ممتاز مقام حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کا کلام اردو کے مشہور ومعروف رسالے "شب خون" (الہ آباد) میں کثرت سے شائع ہوتا رہا ہے۔ میں نے "شب خون" کے مطالعے سے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ اس میں شامل کلام معیاری ہوتا تھا۔افسوس اس رسالے کے بند ہونے سے با ذوق قارئین اب معیاری تخلیقات کے مطالعہ سے محروم ہو گئے ۔ رفیق رازؔ کے کلام سے میری شناسائی "شب خون" کے توسط سے ہوئی۔ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ ان کے کلام میں چند ایسی امتیازی چیزیں موجود ہیں جو معاصر شعراء کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی ہیں۔

رفیق رازؔ کا پہلا اردو شعری مجموعہ "انہار" سال 2004ء میں منظرِ عام پر آیا۔اس مجموعے میں اگر چہ زیادہ کثرت ان غزلوں کی ہے جو "شب خون" یا دوسرے رسالوں کی زینت بن چکی تھیں تاہم ان غزلوں کے مکرر مطالعے سے قاری رفیق رازؔ کی شاعری کے بارے میں اپنی مستقل رائے قائم کرسکتا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری، رفیق رازؔ کی شعری خصوصیات کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"۱۹۸۰ء کے بعد ریاستی اور ملکی سطح پر ابھرنے والے نئے شعرا میں رفیق راؔز نے بہت جلد اپنی انفرادیت منوانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ان معدودے چند نئے شعراء میں نمایاں، امتیازی اور مستحکم حیثیت رکھتے ہیں جو تخلیق شعر میں دو بنیادی لوازم کو عزیز رکھتے ہیں۔ایک جو شعر میں کسی منصوبہ بندی سے اپنے کسی خیال یا نظریئے کو ڈھالنے کی بجائے لفظوں اور پیکروں کو اپنے بل بوتے پر ترکیبی صورت میں ڈھلنے اور نادرہ کار شعری تجربے میں منقلب ہونے پر اصرار کرتے ہیں، دوسرے جو روایت کے گہرے شعور کے ساتھ جدت کاری سے کام لیتے ہیں"۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس اعتبار سے اہم ہیں کیونکہ ان میں معروضیت نظر آتی ہے اور اگر ان نکات پر وضاحت کے ساتھ بات کی جائے تو رفیق راؔز کے کلام کی خصوصیات بہت حد تک متعین کی جاسکتی ہیں۔فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

"رفیق راؔز کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے۔بعض لوگوں نے تو غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے۔بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔رفیق راؔز اُن شعرا میں نمایاں ہیں جنہوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔رفیق راؔز کی عمر کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔گردوپیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاربہ رفیق راؔز کی غزل کا خاص موضوع ہے۔لیکن وہ گردوپیش کی زندگی کو سیاہ چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھتے نہیں اور نہ وہ اپنے محاربے کو جھنڈے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔انہیں اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعر

کے قالب میں ڈھالنے میں کوئی مشکل اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ شعر کے تقاضوں کو باقی تمام چیزوں پر مقدم جانتے ہیں۔ ان کے شعر کا آہنگ انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے بالکل عاری ہے۔ زبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ غیر رسمی اور تخلیقی ہے"۔

رفیق راز بنیادی طور پر فعال اور متحرک فکر کے شاعر ہیں۔ ان کی فکر کا سفر کسی خاص نکتے یا مقام پر آ کر نہیں ٹھہرتا بلکہ ذات اور کائینات کی لامحدود وسعتوں میں رواں ہے۔ رفیق رازؔ کو کسی خاص مقصد، تحریک اور رجحان سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے لہجے کو کسی مخصوص اسلوب کی توسیع یا تجدید کہا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انہیں روایت کا گہرا شعور اور ادراک حاصل ہے اور وہ جگہ جگہ اس سے اکتساب بھی کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ رفیق رازؔ نے اپنی شعری کائینات کے ساتھ ساتھ اپنے اظہار کے طریقوں کو خود خلق کیا ہے جس کی توسیع ممکن ہے، تتبع نہیں۔ میں مرحوم حکیم منظور کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہوں کہ رفیق رازؔ نے شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ایک نئے لب و لہجے کا اضافہ کیا۔ ایک جنوین (Genuine) شاعر کا یہی کارنامہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو نہ صرف الگ زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ اپنے اسلوب کے ذریعے سے قاری پر بھی ان اسرار و رموز کا انکشاف کرتا ہے جو اس کے تجربات کا حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں فکر اور اسلوب ایک نامیاتی اکائی بن جاتے ہیں۔ رفیق رازؔ نے اس عمل میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے جو ذیل کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے۔

رکتا ہوں ہر اک موڑ پہ آنکھوں میں لئے دھوپ
ڈرتا ہوں وہی نقش نمودار نہ ہوجائے

پتھر سے پھوٹتا ہے کہیں چشمہ شعاع
یہ کس فضول شوق میں ہم مبتلا ہوئے

شرار برق فنا تو مرے لئے تھا خبر ہے
مگر وہ شعلہ لب رنگ کن لبوں کیلئے تھا

برگِ آوارہ یدِ بیضا مجھے لگنے لگا
قہر ساماں موسموں کی ابتدا ہونے کو ہے

موج بے قابو کو تیروں کی حفاظت مل گئی
پھول جیسے لب کے حق میں تشنگی لکھی گئی

میں نے یہ اشعار کسی اہتمام کے بغیر نقل کئے کیونکہ رفیق رازؔ کے کلام سے شعروں کا انتخاب کہیں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ شعر ۱ میں "دھوپ" کی علامت اہم ہے۔ اس کے ساتھ "وہی نقش" نے ابہام اور اسرار کی ایک صورت پیدا کی ہے۔ شعر ۲ میں پتھر کے ساتھ چشمہ شعاع اور پھر "فضول شوق" میں مبتلا ہونا کئی باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پتھر کو اگر انسان کے دل کی علامت مانا جائے تو چشمہ شعاع انسانی جذبے اور احساس کا استعارہ بن جاتا ہے۔ دوسرے مصرع میں شاعر نے فضول شوق میں مبتلا "ہوئے" کہہ کر انسان کو راہِ راست پر لانے کے سب طریقوں اور حربوں کو بے سود عمل قرار دیا ہے۔ تیسرے شعر میں شرارِ برق کی مناسبت سے شعلہ لب رنگ کی ترکیب کا کوئی جواب نہیں۔ آخری دو شعروں میں تلمیح کا استعمال غضب کا ہے۔ برگِ آوارہ کا یدِ بیضا لگنا اور قہر ساماں موسموں کی ابتدا ہونا ایک عذاب دہ صورت حال کا علامیہ ہے۔ آخری شعر میں "موج ِ بے قابو"، "تیروں کی حفاظت"، "پھول جیسے لب" اور "تشنگی" ان الفاظ میں رعایت اور انسلاک کے ذریعے سے کربلا میں پیاس سے بلکتے ہوئے معصوموں کے کرب کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

رفیق راز نے جو الفاظ تشبیہات، استعارے اور علامتیں استعمال کی ہیں، وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے عمیق مشاہدے، گہرے مطالعے اور

وسیع شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ رفیق رازؔ نے اپنے خیالات کی ترسیل کیلئے جس لسانی دروبست سے کام لیا ہے وہ ان کے گہرے لسانی شعور سے تخلیق ہوا ہے۔ انھوں نے بعض اوقات ایسے قوافی اور ردیفیں استعمال کی ہیں جن میں خیال کو اصلی صورت میں پیش کرنا بظاہر مشکل محسوس ہوتا ہے مگر رفیق رازؔ یہاں بھی سرفراز نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

رہا ہے تیرے سوا دل میں اور کیا باقی
کہاں گئے وہ تمنا و خواب یا باقی

☆

سرخ سنگین ساعتوں میں اُتر
سرد صحرائے سبز گوں میں اُتر

☆

لت پت ہیں خاک وخوں میں اشجار یا اخی
بے سائیگی کا گرم ہے بازار یا اخی

☆

سرد آواز جا بجا شعلہ
کرب لفظ آب آشنا شعلہ

☆

حبسِ دم سہہ نہ سکی فکر شرر آلودہ
وہی بے داغ سی خوشبو ہے مگر آلودہ

☆

لرزتی شاخ، ہوا، اور پتیاں دو چار
کچھ ایسے قہر سے ہی ہم بھی ہیں میاں دو چار

☆

غضب ہوا اس سال ہوا صحرا تقسیم
اب تو یہاں ہوگی ہر سال گھٹا تقسیم

☆

بھیڑ بکریاں چوپان کُل من علیہا فان
خالی خالی سا میدان کل من علیہا دان

☆

گم سم ہوں میں بھی مہر بلب صوفیوں کے بیچ
ٹھہرا ہوا ہوں جیسے گھنے جنگلوں کے بیچ

آپ ان غزلوں کا مطالعہ کیجئے۔آپ ضرور محسوس کریں گے کہ اس قدر سخت قوافی اور ردیفوں کے باوجود رفیق رازؔ اپنے خیال کو ظاہر کرنے میں کسی بھی طرح سے قاصر یا معذور نہیں لگتے بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے " گرم چاقو مکھن میں رسان سے اترتا جاتا ہے"۔

رفیق رازؔ معاصر حالات پر نہ تبصرہ کرتے ہیں، نہ رائے دیتے ہیں اور نہ واویلا کرتے ہیں۔وہ اپنے دور کے اقدار کی شکست وریخت دیکھ کر بلبلا نہیں اٹھتے بلکہ زہر خندہ سے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ان کی شعری کائینات کی ایک ایسی اساطیر سے تعبیر ہے جہاں کردار زندہ ہیں اور زمانے کے دکھ درد بھوگ رہے ہیں۔

نامرادی کا دھواں پھر چھا گیا دیوار و در پر
موسمِ بے چارگی میں یاد آئی پھر کسی کی

☆

کچھ بھی نہیں ہے اب یہاں ناممکنات میں
اس شہرِ نامراد میں ایسا ہوا بھی ہے

☆

مکاں بھی راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے اور
ہوا بھی ناچ رہی تھی ترے اشاروں پر

☆

فصیل شہر کے اندر ہے پیاس کا دریا
فصیل شہر کے باہر سراب رکھا ہے

☆

ہمارے عہد میں پورا نہیں یہ ہونے کا
ہماری آنکھ میں کس نے یہ خواب رکھا ہے

رفیق راز کی فکر ایک ایسے آفتاب کی مانند ہے جس کے جلوے سے حیرت، استعجاب اور تحیر کے کئی عالم منور نظر آتے ہیں جن کے مظاہر کا مشاہدہ تب تک ممکن نہیں جب تک کہ ان الفاظ اور تراکیب کے علامتی اور استعاراتی مفہوم تک رسائی نہ ہو جو قدم قدم پر راہبری کرتے ہیں۔ رفیق راز کے خیالات میں ایک قسم کی تمکین کا احساس جگہ جگہ پر ہوتا ہے جو الفاظ سے ہم آہنگ ہو کر شعر کی معنوی جہتوں میں اضافہ کرتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ شاعری انجماد کی شکار ہو جاتی۔ اس اعتبار سے رفیق راز کا لسانی رویہ ایک ایسی شعری جمالیات تخلیق کرتا ہے جس میں خیال کی مناسبت

اور رعایت کے ساتھ الفاظ اور تراکیب میں ایک قسم کا تقدس اور گداز پایا جاتا ہے۔

مرا وجود کہ اب تابناک منظر ہے
شعاعِ نور نے مجھ پر نگاہ ڈالی ہے

☆

بدن پہ گنبدِ خضرا کا سبز سایہ ہے
جگر پہ روضہ اقدس کی نقش جالی ہے

☆

خوشبوئے خموشی کا دفینہ ہوا حاصل
لفظوں میں اترنے کی روایت بھی نہیں ہے

☆

خانۂ خلوت کا ہے رنگِ فضا اور ہی
شاملِ انوار ہے ظلمتِ بیمار بھی

☆

چپ چاپ ہے سنگِ استعارہ
بے تاب ہے فکرِ آبشاری

تابناک منظر، شعاعِ نور، گنبدِ خضرا، سبز سایہ، روضہ اقدس، پُرنور خوشبو، فقر، خوشبوئے خموشی کا دفینہ، خانۂ خلوت، شاملِ انوار، فکرِ آبشاری ایسے علائم ہیں جو رفیق رآز کو روحانی تجربوں اور مشاہدات سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان الفاظ اور تراکیب میں فکر کی مناسبت کے ساتھ جو پُرسوز آہنگ وجود میں آتا ہے وہ رفیق رآز کی سکوتِ فکر میں زیروبم پیدا کرتا ہے۔

☆☆☆

رفیق رازؔ: مشاہیر کے آئینے میں

●......شمس الرحمٰن فاروقی

رفیق رازؔ کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔ غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے۔ بعض لوگوں نے تو غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق رازؔ اُن شعرا میں نمایاں ہیں جنہوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ رفیق رازؔ کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔ گردوپیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاربہ رفیق رازؔ کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ لیکن وہ گردوپیش کی زندگی کو سیاہ چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھتے نہیں اور نہ وہ اپنے محاربے کو جھنڈے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ انہیں اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں کوئی مشکل اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ شعر کے تقاضوں کو باقی تمام چیزوں پر مقدم جانتے ہیں۔ ان کے شعر کا آہنگ انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے بالکل عاری ہے۔ زبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ غیر رسمی اور تخلیقی ہے۔

☆☆☆

●......کاوش بدری

آپ کے گہرے احساسات نے غزل کی چادر اوڑھ لی ہے۔آپ کی ہر غزل پتہ دے رہی ہے کہ آپ کشمیری ہیں مگر سب میں رہ کر سب سے الگ اور سب سے جدا۔آپ کے دیوان میں لیل ونہار کا سنجوگ ہے۔آپ کی نذر نا چیز کا یہ شعر ہے ؎

نظر آتی نہیں جب آنکھ سے نزدیک ہوتی ہے
اندھیروں سے زیادہ روشنی تاریک ہوتی ہے

آپ کے دیوان کے بے شمار شعر پسند آئے۔

☆☆☆

●......نامی انصاری

آپ کی غزلیں فکر اور اسلوب دونوں زاویوں سے سجی ہوئی لگتی ہیں جن میں اظہار کی پختگی بہت نمایاں ہے۔غزل کے جس لہجے کو شب خون نے بڑھاوا دیا ہے وہ آپ کی غزلوں سے بھی آشکار ہے۔لیکن اس کے علاوہ بھی کہیں کہیں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں لطف و اثر بھی ہے اور دل میں اتر جانے والی کیفیت بھی۔مثلاً ؎

پیاس بجھے گی میری کتنے سرابوں کے بعد
اور ہیں کتنے سفر میرے تیرے درمیاں

☆☆

فصیلِ شہر کے اندر ہے پیاس کا دریا
فصیلِ شہر کے باہر سراب رکھا ہے

آپ کی غزلوں میں تازگی اور تازہ کاری کی صفت بہت نمایاں ہے۔آپ کا

اسلوب بھی نیا معلوم ہوتا ہے اور اشعار میں بندش کی چستی بھی قابلِ تحسین ہے۔ ؎

ابھی تو آنکھ ہے مصروف جلوہ حیرت
ابھی زمین ہے تھوڑی سی زیر پا باقی

کیا خوب شعر ہے۔ بہت پسند آیا۔

انہار کی آخری 25 غزلوں کی ردیف سیہ/ سیاہ ہے۔ اس میں کیا راز ہے۔ یہ تو رفیق رازؔ ہی جانتے ہوں گے۔ تاہم اس سے شاعر کے خلاق ذہن کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوتا ہی ہے۔ کلام میں فکر کی بالیدگی بہت نمایاں ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

☆☆☆

● ......ظریف احمد ظریف

آپ کی شاعری میں سادگی، حسن و تاثیر اور فکری ہنرمندی کی جو جھلک ملتی ہے اس سے آپ کی امتیازی شان ظاہر ہوتی ہیں اور اسی سے آپ کی انفرادیت بھی قائم ہوتی ہے۔ آپ کے کشمیری کلام میں جو پختہ لسانی شعور اور استعارہ سازی کا منفرد سلیقہ ملتا ہے اس سے قاری روحانی اور وجدانی سرشاری کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔

☆☆☆

● ......عبدالاحد ساز

آپ کو رسائل میں عرصے سے پڑھا ہے اور آپ کے کلام کی اہمیت سے آگاہ بھی ہوں۔ بالاستیعاب پڑھنے کی کیفیت دوسری ہی ہوگی۔ سرسری ورق گردانی میں بھی کئی اشعار پر نظر ٹھہرتی گئی اور غور سے پڑھنے کا ادعا مضبوط تر ہوگیا۔ مثلاً یہ دو شعر ؎

مایوس نہ ہو غور کرو اور ذرا سا
موجود ہوں تصویرِ بیاباں میں ہوا سا

☆☆

لمس کے سیلاب کی رفتار بھی کچھ تیز ہے
جسم کی دیوارِ مرمر بھی ذرا بوسیدہ ہے

حامدی کاشمیری صاحب کا یہ جملہ آپ کی شاعری سے قربت کی اک سمت فراہم کرتا ہے کہ "یہ آواز مقامی تہذیبی نور و نغمہ سے برومند ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے"۔

☆☆☆

● ......پروفیسر ابوالکلام قاسمی

آپ سے براہِ راست ملاقات شاید ایک بار ہوئی ہے، وہ بھی سرسری۔ آپ کی شاعری سے تعارف دیرینہ ہے اور مسلسل آپ کی غزلوں سے رابطہ رہا ہے۔ مجھے آپ کی شاعری یوں بھی اچھی لگتی ہے اور پورا مجموعہ "انہار" پڑھنے کے بعد تو بھرپور تاثر اور مکمل سیاق و سباق سے واقف ہوا ہوں۔ بلاشبہ یہ مجموعہ ہمارے زمانے کی غزلیہ شاعری کے افق پر ایک نئی اور خوشگوار جہت کا اضافہ ہے۔ دیر سے سہی مگر ہر رنگ کی نمایندگی کرنے والا یہ مجموعہ خاصی مقبولیت حاصل کرے گا۔ آپ کی شاعری میں فن سے انصاف اور فکر سے گہری رغبت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کریں۔ امید ہے یہ مجموعہ آیندہ میرے کام آتا رہے گا۔

☆☆☆

●......مظفر ایرج

انکشاف ذات اس عمل کی شروعات ہے جو ایک تخلیق کار کو اس کے اطراف واکناف کی خبر دیتے ہوئے اُس کے تخیل کو مہمیز لگاتے ہوئے سفر کی مختلف سمتوں سے روشناس کرتا ہے۔ خیال، الفاظ، آہنگ، لہجہ، اسلوب اور احساس ایک نقطے میں سمٹ کر بھی رنگوں کی قوسِ قزح پورے ادبی منظر نامے پر پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کچھ اسی طرح کے ردِعمل سے آپ بھی گزر رہے ہیں اور رفتہ رفتہ اپنی مضبوط تخلیقی شخصیت کو اجاگر کرنے میں سرگرداں ہیں۔

آپ کو اس حقیقت کا وجدان ہے کہ ادب محض تفنن طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کرنے کا سلیقہ بن چکا ہے۔ علی الخصوص شاعری جو زمانے کی رکاب میں اپنے پاؤں جما کر ارض وسماوات کا سفر طے کرتی ہے۔ زندگی کی ان حقیقتوں، وارداتوں اور تجربوں کا احاطہ کرتی ہے جو ہمارے اندر اور باہر موجود ہیں ان سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بھی عطا کرتی ہے اور راستہ بھی۔ شاید ذات کے اظہار کے اسی عمل نے آپ پر واضح کیا ہے کہ غزل اکھڑے ہوئے لہجے اور ناہموار اسلوب کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن آپ کو اس بات کیلئے بھی تیار رہنا چاہئے کہ اظہار ذات کیلئے زمین وزماں اور زمان و مکان کے رشتوں پر بھی کمندیں ڈالنی ہوں گی تا کہ خیال تذبذب اور وسوسوں سے آزاد ہوجائے۔

☆☆☆

●......زاہدہ زیدی

''انہار'' پر مختصر طور پر اظہار خیال مشکل ہے اور تفصیل سے لکھنے کیلئے بہت وقت چاہیئے جو میرے پاس نہیں ہے۔ آپ کی غزلیں تو پچھلے دس بارہ سالوں سے نظر سے گزرتی رہی ہیں اور میں نے اپنے ایک مضمون "عصری غزل کا منظر نامہ" میں

آپ کے ایک دوشعر Quote بھی کئے تھے۔ یہ مضمون دس، بارہ سال پہلے لکھا گیا تھا۔ بہرطور آپ کا مجموعہ دیکھ کر خوشی ہوئی' جسے بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ حامدی کاشمیری صاحب اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے آپ کے کلام اور شعری صلاحیتوں پر جو اظہار رائے کیا ہے اس سے میں بڑی حد تک متفق ہوں۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ آپ کی شاعری میں کشمیر کے پس منظر کا ایک عکس بھی ہے۔ اس کے حسن و جمال اور شادابی کا بھی اور اس کے درد و کرب کا بھی۔ اگرچہ اس احساس پر آپ کی فن کاری حاوی ہے اور مجموعی طور پر آپ کا رویہ رجائی ہے جس میں زندگی سے لطف اندوزی کا جذبہ نمایاں ہے۔ آپ کے اکثر اشعار دل و دماغ کو چھو لیتے ہیں۔ بہرطور اس بات سے انکار نہیں کہ آپ نے غزل کے وسیع میدان کی سیاحت کی جدو جہد کی ہے اور اس میں اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ آپ کی شاعری میں مذہبی جذبہ بھی خاصا نمایاں ہے۔ حالیہ برسوں میں کچھ اچھے شاعروں نے اپنی تمام تر توجہ غزل پر بطور خاص مرکوز کی ہے جن میں مظفر حنفی، عنوان چشتی، شجاع خاور، عرفان صدیقی، امین اشرف اور اسعد بدایونی کے نام نمایاں ہیں اور انہیں لوگوں میں آپ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہاں میں نے صرف چند قابلِ ذکر شاعروں کا نام لیا ہے ورنہ یہ فہرست بہت لمبی ہے اور ان لوگوں کی انفرادی شناخت بھی مشکل ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنہوں نے (غزل کے ساتھ) نظم پر زیادہ توجہ دی ہے اور نہ صرف اسے عصری حسیت کا آئینہ بنانے کی کوشش کی ہے بلکہ جدید نظم اور خاص طور سے آزاد نظم کے خدوخال سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ سلسلہ اختر الایمان سے شروع ہو کر عبدالاحد ساز وغیرہ تک جاتا ہے اور میرا تعلق بھی اسی سلسلے سے ہے۔ اختر الایمان سے پہلے ن، م راشد' فیض اور سردار جعفری وغیرہ سے بھی نظم کیلئے اور وسیع امکانات کی نشاندہی کی تھی۔

تیسری طرف وہ لوگ ہیں جو نثری نظم ہی کو مستقبل کی شاعری اور اہم عصری شاعری منوانے پر مصر ہیں، اور میں کئی بار اس خیال کا اظہار کر چکی ہوں کہ نثری نظم سہل انگاری کی زائیدہ اور شعری صلاحیتوں سے محرومی کا استعارہ ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وقت کس رجحان کو اعتبار کی سند دیتا ہے یا پھر ان سب سے بالاتر کوئی زیادہ نمائندہ شعری اظہار وجود میں آتا ہے۔

☆☆☆

● ...... پرکاش فکری

آپ کو شب خون میں تواتر سے پڑھتا رہا ہوں اور آپ کے شعروں سے فنی حرارت اخذ کرتا رہا ہوں۔ مجھے آپ کا کلام بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں ڈھیروں ایسی خوبیاں ہیں جو آپ کی شاعری کو ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ فاروقی صاحب نے آپ کی شاعری کے متعلق جو باتیں کہی ہیں وہ باتیں سچی ہیں۔ میں بھی آپ کی شاعری کو اسی زاویئے سے دیکھتا رہا ہوں۔ مگر میرے پاس اظہار کی زبان نہیں۔

☆☆☆

● .... پرتپال سنگھ بیتاب

آپ کی شاعری کو میں قریب قریب شروع ہی سے پڑھ سُن رہا ہوں۔ آپ کشمیر میں منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ حالانکہ آپ کی شاعری میں معاصر حالات کا عکس دکھائی دیتا ہے لیکن اسلوب و بیان کے اعتبار سے آپ مکمل آزاد سوچ کے مالک ہیں۔ آپ طبیعت کے شاعر ہیں اس لئے آپ کے اشعار میں لگاوٹ بناوٹ کا کوئی عمل دخل نہیں ہے بلکہ آپ کی شاعری سچی شاعری دکھائی دیتی ہے۔ اردو کی ادبی دنیا میں آپ کی منفرد شناخت ہے۔ میں تو خود آپ کی شاعری کا ہمیشہ سے مداح رہا ہوں۔

☆☆☆

● ....کرشن کمار طور

اچھے شعر کہنے پر میری دلی مبارک باد۔ تمہاری غزلوں میں جو ایک حیرتی ،استعجاب زیریں لہر کی طرح سطح پر متمکن ہے وہ نہ صرف مثالی ہے بلکہ لفظی انسلاکات کی ایک ممکنہ سعی کے روپ میں بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ تم شعر کے مثالی اور روایتی پیمانوں کے شاعر نہیں ہو بلکہ اس سراب بے آب و گیاہ میں ٹھنڈے اور شیریں پانی کے چشمے خود تلاش کرتے ہو اور اپنے محسوسات کو اوروں سے مشترک کرتے ہو۔

☆☆☆

● ......ڈاکٹر رؤف خیر

آپ کی غزلیں زیادہ تر میں نے شب خون ہی میں پڑھیں۔ دیگر رسائل میں بھی پڑھیں مگر کم کم۔ جب کبھی آپ کی غزل دیکھی آپ کی دسترس فکر اور زبان و بیان کی قدرت کے مزے لیتا رہا۔ کچھ لوگ فکر و فن پر دسترس نہیں رکھتے اور کچھ زبان و بیان سے کھلواڑ کیا کرتے ہیں۔

سیاہ/ سیہ ردیف والی غزلیں آپ کی فکر روشن سے مملو ہیں۔ یہ غزلیں اور ایسے ہی بے شمار شعر کوئی اور کہہ ہی نہ سکتا تھا۔

حیرت میں ہیں ستارے سپہر کبود کے
ہیں منکشف جو آج فضائل درود کے

☆

روشن ہے کیسی آگ اندھیروں کے درمیان
اطراف میں چمک نہیں چشمِ حسود کے

غیر متداول بحروں میں بھی آپ ثابت قدمی سے پار اترتے ہیں۔

☆☆☆

● ......ڈاکٹر شمس بدایونی

''انہار'' ملتے ہی میں نے پہلی فرصت میں اس کا مطالعہ کیا مجھے محسوس ہوا کہ اشعار میں تغزل کی عسرت اور ندرت، الفاظ وتراکیب کی کثرت ہے جس کے نمود کیلئے آپ نے سعی کی اور معنویت کو پُر بداعت آہنگ دینے کیلئے بہت زیادہ فکر کی۔ غزل کی روایت، غزل کے مجلسی کلچر اور غزل کے قلب پر وار کرنے والے اسلوب سے گریز کا باعث شاید کشمیر کا جدید منظر نامہ یا خود آپ کا کشمیری اور کشمیری زبان کا شاعر ہونا ہوسکتا ہے۔ الفاظ وتراکیب کی بداعت' اسلوب بیان کی رمزیت، ادراک وحسیت، ایک خطہ ارض کی وراثت غیر منتقلہ حقائق نہیں ہیں۔ اردو غزلیات کا یہ فکری آہنگ خود آپ کی ذہنی ساخت کا نتیجہ ہوسکتا ہے یا بنیادی طور پر اردو غزل کی لالہ رنگی کے مقابلے میں آتش چنار کی تپش کے زیر اثر ہے۔ یہ دبستان دہلی یا لکھنو کی غزلیات نہیں ہیں۔ ان کا فکری آہنگ دیگر دبستانوں سے مختلف ہے اور شاید یہی آپ کی انفرادیت ہے جس کی پائیداری کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ اتنے خوبصورت اور دلکش مجموعہ کلام کی اشاعت پر میری جانب سے مبارکباد قبول کیجئے۔

☆☆☆

● ......غلام مرتضٰی راہی

غزل آج بھی اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کرنے کا نام ہے اور میرے خیال میں یہی رمزیت وایمائیت آپ کی غزل کا بنیادی وصف ہے۔ اچھی اور سچی شاعری کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ قاری سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا مطالبہ کرے۔ یہ خوبی مجھے ''انہار'' کے ہر ہر صفحہ پر مل رہی ہے۔ مجموعے میں شامل شمس الرحمٰن فاروقی' حامدی کاشمیری اور حکیم منظور صاحبان کے رشحاتِ قلم سے اردو ادب میں اس کی معنویت اور اہمیت مسلم ہوئی ہے۔

☆☆☆

انتخابِ کلامِ رفیق رازؔ

☆......رفیق رازؔ

اگر چٹان کی یہ چپ کلام ہے سائیں
تو پھر ہماری سماعت ہی خام ہے سائیں
بجا، کہ شہر میں ارزاں بہت ہیں خواب، مگر
یہاں تو نیند ہی ہم پر حرام ہے سائیں
سنا ہے وقت کی منزل ہے حشر کا میدان
اسی لئے تو بہت تیز گام ہے سائیں
ادھر یہ تپتی ہوئی ریت ہی غنیمت ہے
ادھر وہ سبزہء نورستہ دام ہے سائیں
مرے مکاں کے یہی دو نشاں نمایاں ہیں
زمیں ہے فرش فلک اس کا بام ہے سائیں
یہ عرصہ گاہ غزل اس قدر بھی تنگ نہیں
ہماری فکر ہی کچھ بے لگام ہے سائیں
تہی ہے زر سے مگر ہے خمار سے لبریز
فقیر کا یہی کشکول جام ہے سائیں
ہمیں وہ سلطنتِ حرف کے شہنشہ ہیں
رفیق رازؔ ہمارا ہی نام ہے سائیں

☆☆☆

ادھر وجود کی آواز سے وہ دشت پر افشاں
ادھر سکوت کے نشے میں مست ہے یہ بیاباں
کہاں سے آتے ہیں لعل و گہر خیال کے ہر روز
دبا ہوا تو نہیں میری خاک ہی میں بدخشاں
لٹا رہے ہیں خزانے غبار و خاک کے ہر سو
سخی بہت ہیں یہ آوارگانِ بے سر و ساماں
بس ایک خواب کا فتنہ اٹھا ہے روح کے اندر
بس ایک حشر بپا ہے درون شہر خموشاں
یہ بند و بست ہے بہر مسافران رہ فکر
ہوا ہے جامد و ساکت درخت سر بہ گریباں
مرے ہی زیر نگیں قریہء سکوت وسیہ ہے
مرے ہی تابع فرماں ہے آفتاب درخشاں
پڑی ہے ٹوٹ یسار و یمیں سے صرصر سفاک
اکھڑ رہے ہیں مرے خیمہ ہائے ابر گریزاں
سیاہ دشت میں چمکے تو کوئی دیدۂ ضیغم
نظر تو آئے ہمیں بھی کوئی شرارہء امکاں

☆☆☆

☆......رفیق راز

📖

بجھا تو جسم سے اپنے اٹھا دھواں سا میں
سمک سے تا بہ سما رفتہ رفتہ پھیلا میں
بھٹک رہا ہوں بیابان میں صدا سا میں
جو تیرے کان ہوں آنکھیں تو اک تماشا میں
فلک کے سر سے گزرتی ہے موجِ آب مری
بچھا ہوا ہوں زمیں پر سراب جیسا میں
ہمارے بیچ زمانے کا شور بہتا ہے
تو اس طرف کا کنارا ہے اس طرف کا میں
طویل رات نہ ہونے کی اور شام و سحر
یہ کس تکون کے اندر ہوا ہوں برپا میں
خنک اندھیرے میں دیوار روح کے اس پار
بدن کی شاخ پہ مصلوب ہوگیا تھا میں
سماعتوں کے بیاباں نہ کر سکا سیراب
حصارِ حرفِ ادق سے نکل نہ پایا میں
مقام یہ کہیں پڑتا ہے بین صوت و سکوت
یہ وہ جگہ ہے جہاں دور تک ہوں تنہا میں

☆☆☆

📖

گری ہے دھند کی دیوار دیکھئے کیا ہو
اب اس طرف سے نمودار دیکھئے کیا ہو
بدن کی آگ بجھے گی کہ اور بھڑکے گی
ہوا ہے تیز کچھ اس بار دیکھئے کیا ہو
ابھی تو بر سرِ پیکار موجِ آب سے ہوں
ابھی ہوں بیچ میں، اس پار دیکھئے کیا ہو
چراغ آنکھوں کے ہم نے جلا تو رکھے ہیں
طویل ہے یہ شبِ تار دیکھئے کیا ہو
میں اس کو چھوڑ کے خود کو تلاش کرتا ہوں
نہیں ہیں ٹھیک یہ آثار دیکھئے کیا ہو
وہ آفتاب اُگے گا یہیں سے سنتا ہوں
کھڑا ہوں میں بھی سرِ غار دیکھئے کیا ہو

☆☆☆

☆......رفیق رازؔ

باقی ابھی نشہ ہے ان آنکھوں میں خواب کا
ریتی پہ جیسے داغ چمکتا ہو آب کا

لے گا تمام دشت کا پہلے یہ جائزہ
فی الحال گشت پر ہے یہ ٹکڑا سحاب کا

ہم تشنہ لب ہیں واقفِ اسرار العطش
صحرا بھی ہم کو سایہ ہے دیوار آب کا

آ دیکھ آسمان یہاں ہے بچھا ہوا
آ دیکھ خاک پر یہ نشیمن عقاب کا

معنی ہوں پر قیام نہیں حرف میں مرا
باشندہ ہی نہیں ہوں میں ملکِ کتاب کا

کس نے یہ سطحِ آب پہ ڈالا پڑاؤ ہے
کس نے کیا ہے نصب یہ خیمہ حباب کا

☆☆☆

کارنامہ یہ کیا دیدۂ بیدار سے میں نے
فتح پائی ہے شب تار پہ انوار سے میں نے

لٹ کے دیکھا ہے نتیجہ بھی غریب الوطنی میں
کر کے دیکھا بھی کنارہ در و دیوار سے میں نے

یہ جو اشعار میں خوشبو سی دہکتی ہے غضب کی
لائی سوغات ہے یہ حرف کے اس پار سے میں نے

اک قلم تھا جو مرے دست تہی میں سو ابھی ہے
لوہا منوایا ہے اپنا اسی تلوار سے میں نے

دیکھ اے دشت کراں تا بہ کراں موج میں آ کر
اک اجالا بھی کیا گرمئی رفتار سے میں نے

☆☆☆

☆......رفیق رازؔ

📖

حشر ہونے کو بپا ہے تری سلطانی میں
نخلِ آواز اگ آئے ہیں فراوانی میں

خاک اڑتی ہے فضاؤں میں ہماری بھی یہاں
ہم بھی موجود ہیں اس قریہء طوفانی میں

جب سے بینائی میں شامل ہوا ہے فقر کا رنگ
ایک رونق سی نظر آتی ہے ویرانی میں

کس کے ساماں میں نہیں یادِ وطن ہوتی ہے
کون کرتا ہے سفر بے سروسامانی میں

ابرِ مایوسی کے چھائے ہوئے امید پہ ہیں
رقص کرتا ہے دھواں شعلہء امکانی میں

قطرہَ اشک ہے دوزخ کو بجھا سکتا ہے
ایسی طاقت ہے کہاں اور کسی پانی میں

میں نکل جاوں گا اس شہرِ تصور سے میاں
ایک اک شے ہے یہاں پردہء عریانی میں

☆☆☆

📖

ہم نے سنبھال کے اپنا بچپن رکھا ہے
البم میں یہ شعلہ روشن رکھا ہے

گوشہ نشیں ہیں، تارکِ دنیا تھوڑی ہیں
ہم نے دیواروں میں روزن رکھا ہے

بھوک میں ہم کشکول لئے پھرتے تو نہیں
پیٹ پہ لیکن باندھ کے برتن رکھا ہے

دیکھئے کیا گرتا ہے دستِ سخاوت سے
ہم نے تو پھیلا کر دامن رکھا ہے

ہو کر سرخ پگھل ہی جائے گا آخر
لمس کی آگ میں جسم کا آہن رکھا ہے

دشت بنانے والے نے فطرت میں مری
شکر ہے کچھ تو دیوانہ پن رکھا ہے

میں وہ فقیر کہ خالی جس کے ہاتھ نہیں
ایک میں پتھر، ایک میں درپن رکھا ہے

☆☆☆

☆......رفیق رازؔ

آج لگتا ہے کوئی دامِ پُر اسرار یہ دشت
سبزہ اوڑھے ہوئے ہے دیکھ تو اس بار یہ دشت
اب کہ سامان میں وحشت کوئی رکھتا بھی نہیں
اب کسی پر بھی نہیں کھولتا اسرار یہ دشت
آبلے پاؤں کے لبریز ہیں کس پانی سے
میرے قدموں میں بچھا جاتا ہے پُرخار یہ دشت
چونک اٹھے گا بھلا کیا یہ مری آہٹ سے
اپنی پہنائی کے نشے میں ہے سرشار یہ دشت
کچھ نیا اس پہ ہوا روز رقم کرتی ہے
ہم دوانوں کے لئے ہے میاں اخبار یہ دشت
دیکھ یہ میری تھکن اور عنایت رب کی
دیکھ یہ اٹھتی ہوئی ریت کی دیوار یہ دشت
اب پیادہ ہی کرے کوئی کرامت تو کرے
کر سکا پار نہ اب تک کوئی رہوار یہ دشت
جانے کس آس میں دامن کو پسارے ہوئے ہے
جانے کس نقش قدم کا ہے طلب گار یہ دشت

☆☆☆

جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
سب مرے قبضہء ادراک میں ہے
روبرو میرے یہ سفاک ہوا
با ادب بار گہہِ خاک میں ہے
کیا کروں تیرے بدن کی تعریف
شعلہ اک کاغذی پوشاک میں ہے
فتنہء دشت ختن تھا وہ غزال
خیر اب تو مرے فتراک میں ہے
لفظ عاری ہی سہی معنی سے
کاٹ تو لہجہ ء بیباک میں ہے
یاد زندہ ہے تری دل میں کہیں
اک شرارہ خس و خاشاک میں ہے
سوچ کی اپنی کمیں گہہ میں رفیقؔ
کوئی تو ہے جو مری تاک میں ہے

☆☆☆

☆......رفیق رازؔ

نکلے ہیں پڑھ کر میاں ہم درس گاہ بحر سے
یہ تڑپنا عشق میں سیکھا ہے ہم نے لہر سے
ہم حصارِ خامشی میں بے خود و سرمست ہیں
ہم کو کیا خطرہ بھلا شورِ سگانِ دہر سے
پہرہ پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے سخت کیا
اب صدائے آب تک آتی نہیں ہے نہر سے
کانپتی رہتی ہے میرے پاؤں کے نیچے زمیں
لرزہ براندام رہتی ہے فلک کے قہر سے
میں نہیں سقراط مجھ کو زہر سے مارا نہ جائے
جسم پڑ جاتا ہے نیلا کہتے ہیں سب زہر سے
کیا قلم کا بھی تعلق ہے وہی تخلیق سے
جو تعلق تیشۂ فرہاد کا تھا نہر سے

☆☆☆

موجود کوئی ہو کہ نہ ہو پر خدا تو ہے
اک گل یقیں کا موسمِ شک میں کھلا تو ہے
روشن ہوا کے سامنے شمعِ انا تو ہے
تاریکیوں میں ایک ذرا سی ضیا تو ہے
یہ خاکِ تر اڑی نہ ہماری اگر تو کیا
ہر پتہ احترامِ ہوا میں ہلا تو ہے
کب ٹوٹتی ہے دیکھئے بے حس زمیں کی نیند
ہم نے فلک کو سر پہ اٹھایا ہوا تو ہے
نکلی نہ جوئے نور ہی یہ اور بات ہے
شب کا پہاڑ پلکوں سے کاٹا گیا تو ہے

☆☆☆

☆......رفیق رازؔ

یہ جو ہیں نارِ عشق سے بے حد تپیدہ لوگ
دوزخ بجھانے والے ہیں یہ آب دیدہ لوگ
پھیلائیں گے یہ کیا ترے آگے دعا کے وقت
دامن دریدہ بھی ہیں یہ بازو بریدہ لوگ
دیوار و در زدہ ہیں یہ آوارگاں تمام
تنہائی کے مارے بھی ہیں خانہ گزیدہ لوگ
شہرِ سیاہ دھوپ سے مانوس ہی نہیں
دیکھو تو اپنے سائے سے بھی ہیں رمیدہ لوگ
دوہرے ہوئے ہیں بارِ توکل سے اتنے یہ
لگتے رکوع میں ہیں قدآور خمیدہ لوگ
ہوتی ہے ان پہ بارشِ رحمت تمام رات
رہتے ہیں ان مکانوں میں آفت رسیدہ لوگ
لوٹا تو الو بول رہے تھے ہر ایک سمت
غائب ہوئے تھے صورتِ رنگ پریدہ لوگ

☆☆☆

نہیں یہ آنکھ ہی واقف ہے دید کے گُر سے
اسی لئے تو ہے محروم یہ تحیر سے
اس آفتاب کا اسرار اک کرن سے کھلے
عدن کا حال ہو معلوم دانہء دُر سے
نہیں ہے جو کہیں موجود دو جہانوں میں
میں دیکھتا ہوں اسے دیدۂ تصور سے
بچھے گا صورتِ قالین اس زمیں پہ کبھی
زمیں کو دیکھ نہ یوں اے فلک تکبر سے
یہ آنے والے زمانے کا راگ ہے نہ الاپ
خلل نہ ڈال تو سرگم میں آٹھویں سُر سے
نہیں ہے پر کٹی چڑیا رفیق رازؔ یہ روح
بدن کے پنجرے سے اڑ جائے گی کبھی پھر سے

☆☆☆

☆......رفیق راز

خموش اب کے نہیں ہے ہوائے خاموشی
سنا رہی ہے مجھے نغمہ ہائے خاموشی
بتانِ حرف سے خالی کیا ہے دل میں نے
ہے مثلِ کعبہ ہی اب یہ سرائے خاموشی
سمجھ میں آتی ہے تصویر کی زبان مجھے
ہیں چشم و گوش مرے آشنائے خاموشی
دعا کا مرتبہ کچھ کم بھی تو نہیں لیکن
بلند تر ہے مقامِ نوائے خاموشی
یہ وہ ضیا ہے منور ہیں جس سے دو عالم
ہے آفتاب سے بڑھ کر ضیائے خاموشی
ہلا کے رکھتی ہے عرشِ عظیم کو لیکن
سنائی دیتی نہیں ہے صدائے خاموشی
لٹا کے آیا ہے گنجینۂ حروف و صدا
شہہِ حروف و سخن تھا گدائے خاموشی
یہ راز مجھ پہ کھلا کوہسار میں آ کر
کہ ہر چٹان ہے محوِ دعائے خاموشی

☆☆☆

اس دل میں سرکشی کا تو تب بھی خیال تھا
جب سجدے سے بھی سر کو اٹھانا محال تھا
کاغذ پہ جو بھی حرف تھا دیمک کا رزق تھا
صد شکر ہے میں حرف نہیں تھا، خیال تھا
زہریلی تھی ہوا ہی تو مرنا تھا کیا کمال
اس شہر میں تو سانس ہی لینا کمال تھا
میں مدتوں سے خود سے رہا تھا کٹا ہوا
لیکن فلک سے رابطہ میرا بحال تھا
پانی پہ چل کے چھوڑ گیا پاؤں کے نشاں
اک شخص عام سا تھا مگر باکمال تھا
مجھ کو طلوع ہونے کا تب حکم مل گیا
دنیا میں جب عروج پہ وقتِ زوال تھا
اس کی زباں خموشی تھی لہجہ تھا عطر بیز
اس شہرِ شور میں وہی شیریں مقال تھا
درباری خالی تخت کے آگے تھے سب کھڑے
اور تخت پر لکھا ہوا ،قحط الرجال، تھا

☆☆☆

☆......رفیق راز

آنکھ ہے اور ستارہ باری ہے
خواب ہے اور نہ خواب کاری ہے
پستیوں کا نشہ ہی کیا کم تھا
اب زمیں پر فلک بھی طاری ہے
شہر حرف و سخن میں شور انگیز
صرف میری سکوت کاری ہے
مجھ پہ اور میرے دو چراغوں پر
بے سحر رات سخت بھاری ہے
ایک جنگل ہے یہ جہاں جس میں
صید ہے وہ کبھی شکاری ہے
وہ جو میں نے ابھی لڑی ہی نہیں
میں نے کب کی وہ جنگ ہاری ہے
مہر تاباں نے غار دل میں مرے
آج کی رات بھی گزاری ہے

☆☆☆

خوشبو کیسی گھوم رہی ہے میرے ساتھ یہ جنگل میں
شاید کوئی لاش جلائی گئی ہے چوب صندل میں
باہر آنے کا رستہ ملتا ہی نہیں ڈھونڈا ہے بہت
چلتے چلتے پاوں ہوئے شل امکانوں کے جنگل میں
دل میں جتنے غم تھے اتنے اشک نہیں تھے آنکھوں میں
دشت کی جتنی پیاس تھی اتنا پانی نہیں تھا بادل میں
اس کی آنکھیں تھیں یا تھے انوار کے وہ فوارے دو
نور سحر کا ایک عجب اسرار تھا اس کے کاجل میں
ان میں خزانے اور طرح کے ہیں جو سب کو ملتے نہیں
معنی کی اک بوند نہیں ہے میرے حروفِ مہمل میں

☆☆☆

☆......رفیق راز

آنکھ مری جانتی ہے مرتبہء شب
واقفِ اسرار ہے یہ سوختہء شب
میں ہوں چراغ سیاہ پوش اک ایسا
جس نے کیا سر ہے ایک معرکہء شب
جان کو آتی ہے اب یہ گہری خموشی
شام سے ہی بند بھی ہے ناطقہء شب
وجد میں آئے ہوئے تھے برگ شجر سب
لب پہ تھا موجِ ہوا کے زمزمہء شب
بحر سیہ میں اتر کے بند نہ کر آنکھ
روشنیء لا میں دیکھ معجزہء شب
صرف چراغوں ہی سے یہ حل نہیں ہوگا
اتنا بھی آساں نہیں ہے مسلہء شب
صبح کو تھا سامنے پہاڑ سا جو دن
کاٹ لیا کرتے کرتے تذکرۂ شب

☆☆☆

ان گنت اوراق پر بکھرے ہوئے ہیں
ہم قلم کی نوک سے ٹپکے ہوئے ہیں
سب کے سب کردار میری داستاں کے
اب تو مالک اپنی مرضی کے ہوئے ہیں
وسعت ادراک میں آزاد ہیں اب
حرف کے زندان سے چھوٹے ہوئے ہیں
پتھروں کی کیا ضرورت ہے کہ ہم تو
پک چکے ہیں شاخ پر لٹکے ہوئے ہیں
آندھیاں بھی ہیں انہی کی دسترس میں
خاک کی مسند پہ جو بیٹھے ہوئے ہیں
سب مظاہر ہی ترے مثل مناظر
میری ہی بینائی کو اوڑھے ہوئے ہیں
خاک ہیں اور نغمہ صرصر کو سن کر
دشت میں ہم وجد میں آئے ہوئے ہیں

☆☆☆

☆......رفیق راز

پھر ہجرتوں کی چلنے لگی ہیں ہوائیں چل
اس شہر سے نکل کے کہیں دور جائیں چل

اس راہ میں سنا ہے کہ پڑتی ہے کہکشاں
اٹھ وہ نظارہ دیکھنے کو ہم بھی جائیں چل

کیا اِس خرابے میں ہے جو اُس شہر میں نہیں
کرتا ہے اب تو گھر بھی ترا سائیں سائیں چل

تیرے بھی پاؤں میں ہے کھڑاؤں مری طرح
ان شہپروں سے خوف زدہ ہیں خلائیں چل

یہ شہر ہوگیا ہے شرابور شور میں
چل اب فلک کو دشت میں سر پر اٹھائیں چل

اس بوجھ سے تو دوہری ہوئی جاتی ہے کمر
دریا میں نیکیوں کو کہیں پھینک آئیں چل

اس کی تو کوئی قدر نہیں شہر شور میں
چل دشت میں سکوت کی دولت لٹائیں چل

☆☆☆

ڈوبتے سورج کو واپس لاؤں یہ ممکن نہیں
اک دیا ہے طاق پر اس میں بھی کوئی جن نہیں

بین قرطاس و قلم میرا ٹھکانہ ہے کہیں
میں وہ معنی ہوں جو شہر حرف کا ساکن نہیں

کب بگڑ بیٹھے گی صرصر کی ہوا، کس کو پتا
نقش پا کا دشت میں ہوتا کوئی ضامن نہیں

شمع گھر میں اب بھی جلتی ہے مگر ہر شب کہاں
کام تو کچھ اب بھی ملتا ہے مگر ہر دن نہیں

میں نے اس کی تہہ میں دیکھے ہیں بھنور رقصاں کئی
کیسے کہہ دوں میں کہ یہ دریا سیہ باطن نہیں

☆☆☆

☆......رفیق راز

مٹ جاؤں کیا میں نقشِ کفِ پا تو ہوں نہیں
صحرائے بے کنار ہوں، خیمہ تو ہوں نہیں

آئے کہاں سے آنکھ میں امید کی چمک
تجھ جیسا خواب دیکھنے والا تو ہوں نہیں

مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں سفر میں اگر تو کیا
آخر بشر ہوں میں کوئی دریا تو ہوں نہیں

ڈر ڈر کے یوں زمین پہ رکھتا ہوں کیوں قدم
افلاک سے ابھی ابھی اترا تو ہوں نہیں

مجھ میں اترنے والا ابھرتا نہیں ہے کیوں
گہرا ضرور ہوں مگر اتنا تو ہوں نہیں

ان وسعتوں میں تو ہے کہاں گم صدا تو دے
میں سیرِ کائنات کو نکلا تو ہوں نہیں

☆☆☆

گاؤں تو سیراب تھا دریا کے پانی سے بہت
پُل کو لیکن خطرہ تھا اس کی روانی سے بہت

رنگ دھرتی کے میاں سفاک تو کچھ کم نہ تھے
ہم مگر ڈرتے تھے رنگِ آسمانی سے بہت

تھی ہوا بھی نغمہ زن لیکن ہوئے سرشار ہم
دشت میں چٹان کی جادو بیانی سے بہت

جس کہانی کے وہ خود کردار ہوتے ہی نہیں
حظ اٹھاتے لوگ ہیں ایسی کہانی سے بہت

دیکھ تو اوراق پر یہ خشک جنگل حرف کے
کس طرح تازہ ہوئے جوئے معانی سے بہت

خانہء رنج و الم میں روز آتے ہیں کئی
ہو رہے رخصت بھی ہیں دنیائے فانی سے بہت

☆☆☆

☆......رفیق راز

قبر کو کوستے ہو کیوں اس کا فشار دیکھ کر
دل تو کشادہ کرتا ہے دشت سوار دیکھ کر

ایک جگہ تو دم بخود بادِ سموم بھی ہوئی
ریت پہ میرے پاؤں کے نقش ونگار دیکھ کر

جم گئی آنکھ میں نگاہ تھم سی گئی یہ کائنات
تیر کماں میں رہ گیا رقصِ شکار دیکھ کر

خلق خدا ہوئی تھی جمع شہر کے اک کنارے پر
دور فضاؤں میں کہیں کوہِ غبار دیکھ کر

تارے فلک کے چھپ گئے خطہء خاک پر مرے
اتنے چراغ دیکھ کر اتنے مزار دیکھ کر

قہر فلک کی زد میں تو آئیں گے سب رفیق راز
گرتی ہے برق بھی کبھی قرب وجوار دیکھ کر

☆☆☆

صورتِ برگ کبھی رقص کرایا ہے مجھے
صورتِ رنگ کبھی گل سے اڑایا ہے مجھے

ہاتھ میں جس کے ہے منہ زور ہواؤں کی باگ
خاک کے تخت پہ اس نے ہی بٹھایا ہے مجھے

جو کسی آنکھ سے رکھتا ہے علاقہ ہی نہیں
ایک شب اس نے وہ منظر بھی دکھایا ہے مجھے

اپنے رخ پر میں نمودار ابھی تک نہ ہوا
کس سیہ خانہء باطن میں چھپایا ہے مجھے

تو نے آنکھوں سے مری نیند چرا کر جاناں
میرے ہم زاد سے ہر رات لڑایا ہے مجھے

مدتوں بعد ہوا طاق میں روشن یہ چراغ
مدتوں بعد خیال آپ کا آیا ہے مجھے

☆☆☆

☆......رفیق راز

دہکتی روشنی کیسی بدن کی کان میں ہے
یہ آفتاب سی کیا چیز مرتبان میں ہے
نعوت روز پرندوں کی میں بھی سنتا ہوں
درخت ایک بڑا سا مرے بھی لان میں ہے
ابھی نہ گرنا اے دیوارِ خستہ، دھیان رہے
فقیر سائے میں بیٹھا، تری امان میں ہے
مطالعہ نہیں کرتا کوئی ہے اب جس کا
ہمارا ذکر اسی ایک داستان میں ہے
تمہارے رتبہء عالی کی یہ نہیں توہین
یہ میری چپ ہی قصیدہ تمہاری شان میں ہے
زمین زیرِ نگیں ہے ترے یہ سچ ہے مگر
میں جس زمیں پہ کھڑا ہوں، وہ آسمان میں ہے
نہ جانے رات گئے کیوں مجھے یہ لگتا ہے
مرے علاوہ اک آسیب بھی مکان میں ہے

☆☆☆

مثل آواز میں آوارہ بیابان میں ہوں
ضوفشاں دیکھ تو کس خطہء ویران میں ہوں
حرفِ پیچیدہ میں پوشیدہ ہوں معنی کی طرح
اک چمکتا ہوا ہیرا ہوں مگر کان میں ہوں
مجھ کو رکھا گیا ہے منتظرِ ضربِ عصا
میں تڑپتا ہوا چشمہ کسی چٹان میں ہوں
جس کی زنجیروں کی وسعت کی کوئی حد ہی نہیں
میں وہ آزاد اس آفاق کے زندان میں ہوں
جب بھی بے جان سی چٹان کوئی دیکھتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے کہ یہ میں ہی ترے دھیان میں ہوں
ہاتھ پتوار سے ہیں اور بدن کشتی سا
ایسا لگتا ہے کسی نوح کے طوفان میں ہوں
وہ دھواں ہوں کہ بگاڑے گی مرا کیا یہ ہوا
میں کہ پوشیدہ ابھی شعلہء امکان میں ہوں

☆☆☆

خصوصی مطالعہ

☆......پروفیسر ناصر عباس نیرّ

نئے نقاد کے نام سات خطوط

1

نئے نقاد کے نام پہلا خط

عزیز مکرم!

میں تم سے عمر میں بڑا ضرور ہوں، میرا علم بھی تم سے زیادہ ہو، یہ ہرگز ضروری نہیں۔علم کا ماخذ دو چیزیں ہیں۔کتاب سے کلام اور خود سے کلام۔اسے تم دو طرح کا تفکر بھی کہہ سکتے ہو۔دوسروں کے ساتھ مل کر تفکر کرنا اور تنہائی میں تفکر کرنا۔کچھ بیس سال کی عمر میں پچاس برس کی عمر والوں سے زیادہ یہ دونوں طرح کا تفکر کر لیتے ہیں اور کچھ ساٹھ ستر اسی سال کے ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں جنھوں نے اپنی عمر عزیز کو اور کاموں میں مشغول رکھا ہوتا اور شہرت کمائی ہوتی ہے، سیکڑوں کتابیں بھی پڑھی ہوتی ہیں لیکن کتاب کی ہمراہی اور اپنی ہمراہی میں گہرے تفکر کی زحمت نہیں اٹھائی ہوتی۔ اس لیے عمروں سے کسی کے علم اور بصیرت کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔

یہ خط میں تمھارے علم میں کوئی نئی بات لانے کے لیے نہیں، تمھاری دل جوئی کے لیے لکھ رہا ہوں۔شاعروں، افسانہ نگاروں کی دل جوئی کرنے والے بہت ہیں، نقادوں کے لیے تحسین کے دو حرف بھی کوئی مشکل سے کہتا ہے۔اوروں سے کیا

گلا۔خود ہمارے ثقہ نقاد تنقید کی مذمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ان کی زبان یہ کہتے نہیں تھکتی کہ تنقید دوسرے درجے کی سرگرمی ہے اور تنقید تخلیق کے مقابلے میں کم تر ہے۔ میں محسوس کرسکتا ہوں کہ یہ باتیں نئے نقادوں کے لیے بہت دل شکن ہیں۔ کون پسند کرے گا کہ دوسرے درجے کی سرگرمی کے لیے اپنی بہترین قوتیں صرف کرے، جب کہ اس کے پاس وقت، وسائل اور توانائی محدود ہو۔لیکن تم ان باتوں سے گھبرانے کی بجائے،ان باتوں کے اسباب پر سوچو اور لکھو۔نقاد بننے کا فیصلہ کر کے تم نے کچھ ذمہ داریاں اپنے لیے لازم کر لی ہیں: سوچنا،سوال اٹھانا،متن سے کلام کرنا اور پھر جرأت سے لکھنا لیکن شائستگی اور دلیل کا دامن ایک پل کے لیے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔تم ان نقادوں کی طرف پرشوق نگاہوں سے مت دیکھنا جن کے پاس دلیل ہے،لیکن شائستگی نہیں۔ جو نقاد کسی سابق ادیب یا ہم عصر کی ذلت میں خوشی اور فخر محسوس کرے،خواہ اس کے بیان میں کتنی ہی کاٹ ہو،اسے دور سے سلام کرنا۔

تم سوچو گے تو تمھیں سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ کوئی سرگرمی اوّل یا دوسرے درجے کی نہیں ہوتی، یہ ہم ہیں جو اسے پہلا، دوسرا یا اسفل درجہ دیتے ہیں۔شاعری اپنی اصل میں افضل ہے نہ اسفل،اسے شاعر افضل یا اسفل بناتا ہے۔یہی حال فکشن،تنقید اور تحقیق کا بھی ہے۔تم دیکھو کہ ایک ہی دہائی میں کتنے شاعر و افسانہ نویس فراموشی کی قبر میں اتر چکے ہوتے ہیں،گو وہ ہمیں سوشل میڈیا اور ادبی جلسوں میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔اور کتنے ہی نقاد، جن کی ہڈیاں بھی گل چکی ہیں، وہ ہماری گفتگوؤں اور تحریروں میں سانس لے رہے ہیں۔صرف وہی تحریریں زندہ رہتی ہیں جن میں نئے زمانے سے ہم کلام ہونے کی صلاحیت ہو اور جو ہمیں نئے زمانے کی تاریکیوں کو سمجھنے یا روشن کرنے میں مدد دے سکیں۔اس سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ شاعری ہے، فکشن ہے یا تنقید۔

انسانوں میں اپنی ناکامیوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے کی عادت، شاید ارتقا کے کسی مرحلے پر پیدا ہو گئی تھی۔ اب تک چلی آتی ہے۔ تنقید کی ملامت وہی نقاد کرتے ہیں جو اپنی تنقید کو زمانے کے سیل کے آگے پسپا ہوتے دیکھتے ہیں۔ تم خود اس کا تجربہ کرو گے کہ زمانے کے سیل کے سامنے کوئی شے نہیں ٹھہر سکتی۔ صرف نقاد کو نہیں، سب لکھنے والوں کو یہ حقیقت قبول کرنے کی اخلاقی جرأت پیدا کرنی چاہیے کہ ان پر وحی نہیں اترتی کہ جسے زمانہ مٹا نہ سکے۔ ہمارا لکھا ہوا، کچھ، آدھا یا سارے کا سارا لوح جہاں پہ حرف مکرر کی صورت ہوسکتا ہے اور جسے نئے زمانے کی ایک لہر مٹا سکتی ہے۔ کوئی چاہے تو اس سچائی کے اعتراف سے، ایک نئی آگاہی تک پہنچ سکتا ہے۔ آدمی کی مانند اس کی تحریروں کی بھی عمر ہوتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ سو اوپر چند سال لیکن بعض تحریریں زمانوں کی عمر پاتی ہیں۔

آج کل اردو ادب میں سب تیروں کا رخ تنقید کی طرف ہے۔ جب سے سوشل میڈیا آیا ہے اور پرانے اور نئے ادیبوں اور یونیورسٹیوں کے ایم فل و پی ایچ ڈی کے سکالر اس ڈیجیٹل دنیا کا حصہ بنے ہیں، سب کی زبانیں تیر، خنجر، تلوار بن گئی ہیں۔ جب اسلحے کی بہتات ہو تو خواہ مخواہ جنگ کرنے کو جی بھی چاہتا ہے۔ تم نے ایک بات شدت سے محسوس کی ہوگی، نئی ٹیکنالوجی لوگوں کو نیا نہیں بناتی۔ یہ اسلحہ پہلے سے ان کے اندر موجود تھا۔ اس کی نمائش اور اسے کام میں لانے کا موقع اب ملا ہے۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی دیوار کو محاذ بنائے تنقید کے خلاف جنگ کو ایک مقدس فرض سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ کبھی یہ تمھارا نام لیتے ہیں، کبھی نہیں۔

تم نوجوان ہو، تمھارا خون کھول اٹھتا ہے۔ لیکن تم ضبط سے کام لو۔ تیر لگے تو تکلیف ہوتی ہے۔ خنجر کہیں پیوست ہو تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑتا ہے۔ اس کے باوجود تم اس جنگ کا حصہ بننے سے انکار کرو۔ جنگوں نے آج تک انسانوں کو کچھ نہیں دیا،

سوائے موت، تباہی، ذلت اور رسوائی کے۔ انسانی تہذیب جن چیزوں پر فخر کر سکتی ہے، وہ سب یا تو انسان کی تنہائی کی پیداوار ہیں یا دوسرے سے مکالمے کی۔ تم اپنی تنہائی میں امن سے جینا سیکھو اور دوسروں سے مکالمے کو اپنا وطیرہ بناؤ۔ جب کسی اپنے یا پرائے کا خنجر پہلو میں پیوست ہو تو کربلا کے معصومین کو یاد کرلیا کرو یا مہاتما بدھ کی دہشت گردسے ملاقات کا تصور کرلیا کرو۔ یہ سوچا کرو کہ جو تمھیں تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنی پیدا کردہ بدروحوں کے ہاتھوں زخمی بھی ہوتے ہیں۔ ان کے زخمی دلوں کے لیے دست دعا اٹھا دیا کرو۔

تم سوالوں کے جواب ضرور دیا کرو۔ دشنام اور ملامت کا نہیں۔ لیکن کسی سوال کا جواب دینے سے پہلے ضرور غور کیا کرو کہ تمھیں کس سوال کا جواب دینا ہے اور کس کا نہیں۔ تمھیں تنقید کے سوالوں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ ویسے بھی سوال کو پہچاننے کی صلاحیت ایک نقاد میں سب سے بڑھ کر ہونی چاہیے۔ سوال کی زبان پر غور کرو گے تو جلد پہچان جاؤ گے کہ کہاں سوال ہے اور کہاں محض کسی نفرت، دشمنی، تعصب کو سوال کے پردے میں چھپایا گیا ہے۔ تم رفتہ رفتہ پہچان جاؤ گے کہ لوگوں کے پاس سوال کم سے کم ہیں اور منفی جذبات کا انبار ہے۔ سوال تو نعمت ہے۔ کاش نعمت اتنی ارزاں ہوتی! کیا تم دیکھتے نہیں کہ سوالوں کے نام پر چند ہی باتوں کی تکرار ہو رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے لوگوں نے سوچنا چھوڑ کر چیخنا شروع کر دیا ہے۔

تم یہ بھی دیکھو گے جنھیں کچھ لکھنا آتا ہے، انھیں اپنی نفرت و دشمنی کو سوال کے پردے میں چھپانے کا فن بھی زیادہ آتا ہے، لہٰذا ادیبوں کے سوالوں کے سلسلے میں زیادہ ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔ سوال کو کیسے پہچانیں، یہ سوال اٹھاتے رہا کریں۔ خطابت، سب سے زیادہ دھوکہ دیتی ہے۔ جس شخص کے یہاں اسم صفات کا جتنا بے محابا استعمال ہوگا اور یک قلم چیزوں کو تلپٹ کر دینے کا رویہ ہوگا، وہ سوال سے

اتنا ہی دور ہوگا۔ عہد وسطیٰ کے بودھی مفکروں نے سوال کی چار قسمیں بتائی تھیں اور سوال پوچھنے والے کی نسبت سے بتائی تھیں۔ میں انھیں لکھے دیتا ہوں۔ شاید ان سے کچھ مدد مل سکے۔

''وہ آدمی بحث کے لیے موزوں نہیں جسے کہا جائے کہ وہ اپنا سوال قطعیت کے ساتھ واضح کرے، جسے قطعیت سے واضح کیا جانا ضروری ہو اور وہ واضح نہ کر سکے؛ اس سوال کو تجزیاتی طور پر واضح نہ کر سکے جسے تجزیاتی طور پر واضح کیا جانا ضروری ہو؛ کسی سوال کو مخالف سوال کی روشنی میں واضح نہ کر سکیں جس کا مخالف سوال کی روشنی میں واضح کیا جانا ضروری ہو اور کسی سوال کو ردّ نہ کر سکے جسے ردّ کیا جانا ضروری ہو''۔

تم یہ جانتے ہو گے کہ یہ بودھی مفکر (دگناگ، ناگارجن خاص طور پر) ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے کہا تھا کہ زبان کا باہر کی چیزوں سے نہیں، ذہنی تصورات سے تعلق ہے، جسے بعد میں سوشیور نے ہو بہو پیش کیا۔ خیر، اس پر ہم پھر کسی وقت بات کریں گے، یہاں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمھیں صرف ان سوالوں پر لکھنا چاہیے جو سوال ہوں۔ جن میں قطعیت، وضاحت اور مخالف سوالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت ہو اور جن کی تہ میں جاننے کا تجسس ہو۔ تم نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ لوگ بے معنی سوال بھی اٹھاتے ہیں۔ ان دنوں اردو تنقید کے حوالے سے بے معنی سوال بھی گردش میں ہیں۔ ایسے سوالوں کا سامنا کرتے ہوئے منیر نیازی کو یاد کر لیا کرو۔

کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے جواب کیا دیتے

تمھیں کہا جاتا ہے کہ مغرب کے نقادوں کے حوالے کیوں دیتے ہو، ان کے بارے میں لمبے چوڑے مضامین کیوں لکھتے ہو۔ مغرب کے نظریات کیسے ہمارے ادب کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ ہم نے اپنا ایلیٹ، اپنا دریدا، اپنا ایڈ روڈ

سعید کیوں نہیں پیدا کیا؟ تم سمجھو کہ یہ باتیں کب سے کہی جارہی ہیں؟ حالی کے زمانے سے۔لیکن اب کچھ ان میں زیادہ ہی شدت آگئی ہے۔تم اس شدت کے اسباب پر غور کرو؛ نائن الیون کے بعد کے حالات پر غور کرو اور اپنے معاشرے میں شدت پسندانہ رجحانات پر سوچو تو شاید اس شدت کا سبب کچھ معلوم ہو سکے۔لیکن لکھو وہی جو تم ٹھیک سمجھتے ہو۔ٹھیک سمجھنے پر وقت صرف کرو، لیکن جب سمجھ لو تو پھر اعتماد و جرآت سے وہ سب کہو جسے تمھارا روشن دماغ تم پر عیاں کرے۔تمھارا خضر اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی تمھارا روشن دماغ ہے۔اس کی حفاظت ہر قیمت پر کرو۔

تم نقاد ہو، تمھارے پاس بس تنقیدی آگہی ہونی چاہیے۔تم مغرب، مشرق، افریقا، لاطینی امریکا کے کسی ادیب یا نقاد کے بارے میں لکھو، مت ڈرو، بس یہ لازم کر لو کہ تمھاری آگہی تنقیدی ہونی چاہیے۔تنقیدی آگہی، کسی بھی نظریے کو چار اطراف سے سمجھنے سے آتی ہے۔ جب تم کسی نظریے کے بنیادی مفروضے کا اچھی طرح تجزیہ کر لو گے تو تمھیں اس کے باقی اطراف کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ یہ جاننا مشکل نہیں ہوگا کہ وہ نظریہ کس متن کے بارے میں کس بصیرت کو سامنے لا سکتا ہے۔تمھارا کام ادبی متن سے متعلق بصیرتوں کی تلاش ہے اور تنقیدی نظریات انھی بصیرتوں کو مدلل انداز میں سامنے لانے میں مدد دیتے ہیں۔ لوگ ذوق اور فہم ادب کے مسائل چھیڑ کر تمھاری توجہ کو منتشر کرتے ہیں۔تم دوسروں سے بہتر جانتے ہو کہ متن کو باریک بینی سے پڑھنے والے ہی صاحب ذوق ہوتے ہیں۔کون ہے جو قبیح چیزوں کے ساتھ ایک پل سے زیادہ وقت گزار سکے؟

اس بات کو کبھی فراموش نہ کرو کہ ہمیشہ سے علم سرحدوں سے ماورا رہا ہے۔ یونانیوں نے ہندوستان سے کتنا کچھ لیا؟ مسلمانوں نے یونانیوں سے کیا کیا اخذ نہیں کیا؟ ارسطو کے فلسفے ہی کے نہیں، ارسطو کی بوطیقا کے مسلمانوں کی تنقید پر بہت اثرات

ہیں۔تم نے بورخیس کا ابن رشد کا تفحص پڑھا ہوگا۔اس میں اس ذہنی عمل کو دیکھا ہوگا جو بوطیقا کو عربی میں منتقل کرنے سے اس کے اندر رونما ہوا۔ پھر یورپ نے مسلمانوں سے کیا کیا حاصل نہیں کیا؟ یہ سب سامنے کی باتیں ہیں۔ یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ ہم نے اپنا ایلیٹ، دریدا اور سعید کیوں پیدا نہیں کیا۔خود کو اپنی نظر سے اور اپنی تاریخ کو اپنے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔تاریخ اپنی ضرورت کے مطابق لوگ،نظریوں کو جنم دیتی اور سامنے لاتی ہے۔تم بس اپنے اس کام پر دھیان دو، جو تم اس محدود وقت، وسائل اور توانائی کے ساتھ کر سکتے ہو۔

اصل مسئلہ ہمارا نو آبادیاتی تجربہ ہے۔ اس نے چیزوں کو، تاریخ کو اور ہماری سائیکی کو گدلا کر دیا ہے۔ یہ ایک آسیب کی مانند ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ہم ایک نئ صورتِ حال سے دوچار ہوئے۔ہمیں نئے علم اور استعمار سے بہ یک وقت سابقہ پڑا۔تم نقاد ہو یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ استعمار کی مذمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو، خواہ وہ یورپی ہو یا مشرقی، بیرونی ہو یا مقامی،لیکن علم کہیں کا ہو،اسے نسل، مذہب اور فرقے کی نظر سے نہ دیکھو۔اسے اپنی گم شدہ میراث سمجھو۔

خدا تمھارا حامی و ناصر ہو۔

تمھارا خیر خواہ

پروفیسر ناصر عباس نیرّ

☆☆☆

2

نئے نقاد کے نام دوسرا خط

عزیزم!

مجھے تمھاری تشویش سمجھ میں آتی ہے۔ ذرا غور کرو گے تو تمھیں تشویش کے اسباب بھی سمجھ آ جائیں گے۔ اپنی ہر حالت کو، اس حالت سے باہر نکل کر دیکھو گے تو تمھیں کئی مشکل سوالوں کے جواب ملنے لگیں گے۔ تشویش کو کچھ دیر معطل کر واور پھر اس پر غور کرو۔ (یہ مشکل کام ہے مگر تمھاری بساط سے باہر نہیں ہے) تم پر کھلے گا کہ چیزیں بجائے خود مشکل نہیں ہیں، وہ مشکل لگتی ہیں اور اس لیے لگتی ہیں کہ ہر چیز کے گرد آرا اور تاثرات کے اتنے دبیز جالے بنے ہوئے ہیں کہ عام سی چیز بھی پراسرار، پیچیدہ اور کبھی کبھی تو عفریت نظر آنے لگتی ہے۔ صرف ایک ہنر سیکھ لو۔ ہر شے کو اس کے بارے میں ظاہر کیے گئے تاثر سے الگ کر کے دیکھنے کا ہنر۔

میں تاثر کے خلاف نہیں، تاثر کی جارحیت کے سلسلے میں تحفظات رکھتا ہوں۔ اگر تاثر یہ کہہ کر پیش کیا جائے کہ یہ کسی چیز کے بارے میں ایک شخص کا، ایک خاص موقع اور سیاق میں پیش کیا گیا تبصرہ ہے، جو کسی دوسرے وقت مختلف بھی ہوسکتا ہے (اور اس میں ایک نوع کا عارضی پن ہے)، کیوں کہ کوئی آدمی ایک لمحے میں سب باتیں، پوری وضاحت اور گہرائی کے ساتھ سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ نیز یہ بات بھی اصولی طور پر تسلیم کی جائے کہ کسی دوسرے شخص کو بھی اسی طرح تاثر ظاہر کرنے کا پورا حق حاصل ہے تو اس سے تاثر کی جارحیت قائم نہیں ہوتی، لیکن جب کوئی شخص کسی شے کے بارے میں اپنے تاثر کو ایسے پیش کرے، جیسے اس پر کوئی ابدی سچائی اتری ہو تو

تمھیں فوراً چوکنا ہو جانا چاہیے۔ اپنی حدوں کے سلسلے میں فریب کے شکار افراد ہی تاثر اور سچائی کا فرق مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے جس ''مابعد سچائی'' (پوسٹ ٹروتھ) کا غلغلہ بلند ہے، اس کا ایک اہم پہلو یہی ہے کہ تاثر اور رائے کو سچائی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ پھر جن کے پاس طاقت ہے، وہ تاثر یا اپنی آرزو کے ذریعے گھڑی گئی سچائی کو ایک جیتی جاگتی حقیقت میں بدل سکتے ہیں۔ ذرا وقت نکال کر ڑولیاں بگینی کی چھوٹی سی کتاب پڑھو۔ مصنف نے اس میں آٹھ قسم کی سچائیوں کو بیان کیا ہے: ابدی، مقتدر، سری، استدلالی، تجربی، تخلیقی، اضافی اور طاقت ور سچائیاں۔ اس میں تمھیں جا بجا تاثر اور طاقت کے ذریعے سچائی وضع کرنے کے متعلق حقائق ملیں گے۔

یاد رکھو، طاقت صرف کرسی، بندوق، دھن کی نہیں، گروہ کی بھی ہے۔ جب تم طاقت کے منبع کو پہچان لو گے تو اس کے خوف سے باہر آنے میں تمھیں دقت نہیں ہوگی۔ تم یہ بھی دیکھو گے کہ جنھیں تم طاقت ور سمجھتے ہو، وہ خود بھی خوفزدہ ہوتے ہیں۔ کرسی، بندوق، دھن والے اور گروہ اسی لیے تنقید سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

تمھاری تشویش کا سبب وہ سوالات اور اعتراضات ہیں جو تم روز تنقید کے سلسلے میں سنتے اور پڑھتے ہو۔ سوال اور اعتراض میں فرق کرنا سیکھو۔ لیکن اس سے پہلے یہ جان لو کہ کوئی شے سوال اور اعتراض کا نشانہ کب اور کیوں بنتی ہے؟ جب کوئی شے اہم اور طاقت ور محسوس کی جانے لگے اور لوگ اس کے سلسلے میں متجسس اور سہمے ہوئے بہ یک وقت ہوں۔ اسے سمجھنے اور اسے زیر کرنے کی خواہش، ایک ہی وقت میں کی جانے لگے۔ سمجھنے کی خواہش سوال کو اور زیر کرنے کی تمنا اعتراض کو جنم دیتی ہے۔

سوال وہ ہے جو کسی فکر، خیال یا نظریے کو زیادہ گہرائی میں سمجھنے میں مدد دے اور بحث کو آگے بڑھائے یا کوئی یکسر نیا رخ دے۔ سوال اٹھانے والے کو اپنا ہمدرد ہی نہیں اپنا ہم سفر خیال کرو۔ اپنے ہمدردوں اور ہم سفروں کو پہچاننے میں غلطی نہ کرنا۔

اور جہاں کسی استفہامی جملے کے ساتھ کوئی پریشان کن جذبہ نتھی ہو، یعنی اس کا پیرایہ طنز، تضحیک، تمسخر کا ہو، یا مطلق تردید کا ہو، اسے اعتراض کے خانے میں رکھو۔ جب تم دونوں میں فرق کرنا سیکھ جاؤ گے تو یہ دیکھ کر حیران ہو گے کہ سوالات کم سے کم اور اعتراضات بیش از بیش ہیں۔ (اسی لیے تمھیں اپنے ہمدرد اور ہم سفر کم نظر آتے ہیں اور جو دو چار قدم تمھارے ساتھ چلتے ہیں، وہ جلد ہی کسی غبار میں گم ہو جاتے ہیں)۔ اس کہ وجہ سادہ ہے۔ سوچنا مشکل اور محسوس کرنا آسان ہے۔ لوگ اپنی قدیمی جبلتوں کو آج بھی اپنی استفہام پسند کھوپڑی پر ترجیح دیتے ہیں؛ انھیں دماغ سے زیادہ ریڑھ کی ہڈی پر بھروسا کرنا زیادہ فطری محسوس ہوتا ہے۔ وہ گالی، نفرت، تعصب، حسد، بغض، عناد جیسے جذبوں کو، جنھیں قدیم زمانے میں حقیقی دشمن سے مقابلے کے لیے آدمی نے پیدا کیا تھا، انھیں اپنے وجود کے سچے اظہار کے طور پر قبول کرتے نظر آتے ہیں (یہ الگ بات کہ ان کے نام انھوں نے بدل دیے ہیں)، جب کہ دلیل، شائستگی، غور و فکر، ٹھہراؤ اور استقامت کو اپنے اوپر مسلط کیا گیا محسوس کرتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ کچھ لوگ شائستگی اور دلیل کا جامہ پہن لیتے ہیں مگر جلد ہی وہ پھٹ جاتا ہے، یا وہ خود ہی، کسی بے خودی کے لمحے میں، اسے اتار پھینکتے ہیں۔ ایسا صرف اردو تنقید میں نہیں ہو رہا، باقی سب شعبوں میں بھی ذرا سے تناسب کے فرق سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن میں کہوں گا تم سوال اور اعتراض میں فرق کرنا ضرور سیکھو، غور دونوں پر کرو۔ کئی دفعہ اعتراض کے شور میں کسی سوال کا آہنگ مل سکتا ہے، جیسے کوئی خراب شاعر، کسی وقت اچھا شعر بھی کہہ سکتا ہے یا کسی بے سرے گویے سے اتفاقاً کوئی اچھا سر بھی لگ سکتا ہے۔ تم سوالوں کی تلاش کرو، خود اپنے اندر اور دوسروں کے یہاں۔ خود پر بھروسا ضرور کرو، مگر اس فریب میں مت آنا کہ کسی موضوع پر دن رات کام کرنے والے ہی سب سوالوں تک پہنچنے کے اہل ہوتے ہیں۔ آدمی میں قریب ترین چیزوں کو نظر انداز

کرنے کا قوی میلان ہوتا ہے۔کبھی نہ بھولو کہ یہاں کوئی شخص، تنہا سب کچھ کرنے کا اہل نہیں۔کوئی ایسا دعویٰ کرے تو اسے دیوانے کی بڑ سمجھو۔دیوانے کی بڑ کو فکشن نگار اور تحلیل نفسی کے ماہر کے لیے چھوڑ دو۔

تمھیں اسی دنیا میں، انھی لوگوں کے درمیان رہنا ہے اور انھی سے مخاطب ہونا ہے اور انھی کو سننا ہے۔کئی حساس اور نازک طبع لوگ، ابنائے زمانہ سے مایوس ہو کر اپنے لیے خانقاہیں تلاش کر لیتے ہیں، لیکن ان پر جلد ہی کھلتا ہے کہ جس دنیا سے منھ موڑ کر وہ یہاں آئے تھے، وہ ان کا پیچھا کرتے وہاں بھی پہنچ چکی ہے۔اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا کہ پیچھا کرتے ہوئے آنے والی دنیا منتقم مزاج ہوتی ہے۔آدمی کا انتقام برداشت کیا جا سکتا ہے، دنیا کا نہیں۔دنیا سے منھ مت موڑو، اس کو سمجھنے اور ہو سکے تو اس کا رخ بدلنے کی اپنی سی سعی کرتے رہو۔اس نکتے کو سمجھنے کے لیے میرا جی کی نظم ''اجنتا کے غار'' کسی وقت پڑھنا۔

سوالوں کو پہچاننا بھی کافی نہیں۔سوالوں میں فرق کرنا بھی لازم ہے۔کچھ سوال تمھیں بھٹکا سکتے ہیں؛ تمھیں غیر ضروری بحثوں میں الجھا سکتے ہیں۔تم جانتے ہو، جس طرح پھیپھڑوں کو تازہ ہوا چاہیے اسی طرح ذہن کو بھی ''تازہ دم'' رہنے کے لیے کوئی نیا خیال، انوکھا نکتہ، فرضیہ، یہاں تک کہ پہیلی یا کوئی پزل چاہیے۔تم نے دیکھا ہوگا، انسانی ذہن کی اس خصوصیت کا فائدہ طاقت وروں نے بہت اٹھایا ہے۔جب اصل مسئلے سے توجہ ہٹانی ہو تو لوگوں کو سوچنے اور بحث کے لیے کوئی فرضیہ، پہیلی، کوئی سیکنڈل دے دیا جاتا ہے۔یہی وہ وقت ہوتا ہے، جب نقاد کو سامنے آکر ضروری اور غیر ضروری سوال میں فرق بتانا چاہیے۔(اپنے فہم اور امتیاز کی صلاحیتوں کو زنگ سے بچاؤ)۔کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، اس پر اتفاق مشکل ہے مگر جو لوگ کسی قدر میں یقین رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ایک لکھنے والے کے

لیے انسانیت سے بڑی قدر کیا ہوسکتی ہے!

تم یہ بھی دیکھو گے کہ کچھ سوالات میں ذہن کو متجسس بنانے، سوچنے کے عمل کو پر لطف بنانے کی صلاحیت اور کسی نئی دریافت کی توقع مضمر ہوتی ہے مگر لازم نہیں کہ ان کا تعلق تنقید سے ہو۔ ان سوالوں کو الگ کرلو۔ کسی جگہ محفوظ کرلو۔ ہوسکتا ہے، کسی وقت تمھارے کام آئیں۔ سوالوں کو خزانہ سمجھو، خزانہ۔ تم ان سوالوں کو ضرور اہمیت دو جو تمھیں اپنے زمانے میں تنقید کے منصب کو سمجھنے میں مدد دیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب خود تمھارے پاس اپنے سوالات ہوں۔ درست اور برمحل سوالات ہی کسی بحث کو مفید اور نافع بناتے ہیں۔ ایک اور بات بھی یاد رکھو، جس شخص کے ذہن میں سوال واضح ہوں، اسے بحث کی سب جہتوں اور اس کے وسیلے سے دنیا، ادب اور سماج کو سمجھنے کے سارے عمل پر بھی اختیار ہوتا ہے۔ اپنے اختیار کو پہچانو اور اس کی حفاظت کرو۔

غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ تم اس وقت، اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے خاتمے پر تنقید کا کیا کردار دیکھتے ہو؟ تم دیکھو گے کہ یہ سوال تمھیں اب تک کی یا کم از کم پچھلی صدی کی تنقید کے کردار کے جائزے کی تحریک دے گا۔ اور یہ سمجھنے میں مدد دے گا کہ ادب کو قاری، متن، مصنف کے زاویوں سے سمجھنے میں کیا کیا مدد ملی، تنقید نے جہاں ادب کو لائحہ عمل دیا وہاں کیسا ادب تخلیق ہوا اور جہاں ادیب کی مکمل آزادی کا علم تھاما، اس کا اثر ادب پر کیسا پڑا۔ جہاں تنقید نے خود ادب سے اصول اخذ کیے، اور جہاں دوسرے علوم سے مدد لی، اس سے کیا کیا ہمارے سامنے آیا۔ جہاں تنقید نے ادب کو تہذیب و روایت کا مظہر جانا اور جہاں انسانی ہستی کا اظہار، اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ قوم پرستی نے ادب کو کیا دیا، شناختوں کی سیاست کا ادب پر اثر کیا پڑا؟ ادب کو محض ہیئت یا محض موضوع سمجھنے سے کیا کچھ واقع ہوا؟ ان میں سے اب، تنقید نے کس کو جاری رکھنا ہے، کس سے بچنا ہے اور کہاں نئے زاویوں کی تلاش کرنی ہے۔ تم اس

سوال کا مجھے جواب دو گے تو ہم مزید گفتگو کریں گے۔

آخری بات۔تم محسوس کرو گے کہ صرف ایک سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے تمھیں کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑے گی۔اس سے تمھیں اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ آخر لوگ خاک چھاننے سے زیادہ دوسروں کی خاک اڑانے میں دل چسپی کیوں لیتے ہیں؟

مجھے ایک بزرگ نقاد نے دعا دی تھی کہ ''خدا تمھیں زخم چشم سے بچائے''۔ آج میں یہ دعا تمھیں دیتا ہوں۔

دعا گو

ناصر عباس نیّر

☆☆☆

3

نئے نقاد کے نام تیسرا خط

میرے عزیز!

تم نے گزشتہ خط کے پس نوشت کے تحت لکھا ہے کہ میں تخلیق کاروں کے تعلق سے اپنے کچھ تجربات میں تمھیں شریک کروں۔ "اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے"۔تم نے ہلکا سا اندازہ لگالیا ہوگا کہ یہ تجربات کیسے رہے ہوں گے۔مثالی اورسبق آموزقسم کے۔

میں پہلے ان تخلیق کاروں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ،جن سے میرے مثالی تعلقات رہے ہیں۔ میں نے کسی خوف،ترغیب اور اندیشے کے بغیر ان کی تخلیقات پر لکھا ہے۔ان پر ہر طرح کے سوالات قائم کیے۔انھوں نے مجھے فراخ دلی سے یہ اجازت دی کہ میں ان کی تحریروں کو ہر ہر زاویے سے کھوجوں اور پھر بھی مجھے اپنے سوالوں کے جواب نہ ملیں تو میں ان کی نارسائی یا کسی کجی کا برملا ذکر کروں۔ یوں سمجھیں ، انھوں نے اپنے گھر ، دل اور دماغ کے سب دروازے میرے لیے کھلے رکھے۔کوئی حجاب ،کوئی تکلف روا نہیں رکھا۔اپنی تعریف پر ہواؤں میں اڑے نہ تنقید پر آپے سے باہر ہوئے۔کسی بات کا برا مانا نہ کسی سوال پر سیخ پا ہوئے۔میں نے ان میں بلا کے تحمل کے ساتھ ساتھ ، ایک بنیادی بصیرت کا مشاہدہ کیا۔ یہ کہ جب ہم اپنی تحریروں کو اشاعت کے بعد زمانے کے سپرد کرتے ہیں تو ہم ان پر اپنا ہر طرح کا اختیار کھودیتے ہیں۔ ہماری سب کتابیں یا تحریریں چھپنے کے بعد،ہم پر ایک آخری الوداعی

نظر ڈال کر اس دنیا کے کارزار میں چلی جاتی ہیں جہاں ان جیسی کئی دوسری کتابیں پہلے سے موجود ہوتی ہیں۔ میں ان مصنفوں کا ذکر نہیں کر رہا جو اپنی کتابوں کو بازار کی چیز کے طور پر، بازار میں بھیجتے ہیں اور اکثر خود بھی بازار میں، چوراہوں پر، فٹ پاتھوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ انھیں کتاب کے قاری کی نہیں، گاہک کی تلاش ہوتی ہے۔ ان کی بلا سے کہ گاہک کیسا ہے، انھیں کسی سے بھی دام اور کسی بھی طرح شہرت چاہیے اور ان کے پبلشر کو محض دام، وہ بھی ڈھیر سارے۔ میں تو ان تخلیق کاروں کی بات کر رہا ہوں جو کتابیں اس لیے لکھتے ہیں کہ وہ اپنی روح پر ایک پیدائشی زخم لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کتاب لکھنے سے زخم مندمل نہیں ہوگا، خود وہ بھی نہیں چاہتے کہ زخم ٹھیک ہوجائے اور وہ بھی دنیا کے بازار میں، بازار کو درکار چیزیں فراہم کرنے لگیں اور خوش رہیں۔ وہ تو ہر کتاب سے اس زخم کو گہرا اور مزید ہرا کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی شخص تخلیق کار ہو اور اپنی ہستی کے پاتال تک اداس نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ مزاح نگار بھی اپنے اندر گہرا المیہ احساس لیے ہوتے ہیں۔ بہ قول غالبؔ:

عشرت پارہ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا

ایسے تخلیق کار دنیا کے بازار نہیں، کارزار میں کتابیں روانہ کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کتابوں کو بلاشبہ اپنے تحفظ اور بقا کے سنگین مسائل درپیش ہوتے ہیں مگر ہم مصنف اس ضمن میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ مصنف ایسے دیوتا ہوتے ہیں جو کتاب کی تخلیق کے بعد، اس سے الگ ہوجاتے ہیں؛ اس کی فکر سے آزاد ہوجاتے ہیں کہ انھوں نے کتاب کی تقدیر، کتاب کی تخلیق کے دوران ہی میں طے کر دی ہوتی ہے۔ یا وہ ایسے باپ ہیں جو اپنے بچوں کو باہر کی دنیا میں اس وقت بھیجتے ہیں، جب انھیں یقین ہوجاتا ہے بچے جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر اتنے پختہ ہیں کہ وہ اکیلے

ہر قسم کی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کر سکتے ہیں اور اگر پھر بھی بچے ناکام ہو جائیں تو وہ اسے بچوں کی تقدیر سمجھ کر صبر شکر کر لیتے ہیں۔ دنیا میں کوئی باپ ایسا ہے کہ جس کا ہر بچہ جینئس ہو؟

اگر بقا واقعی ایک جنگ ہے تو کتابوں کو یہ اکیلے لڑنا پڑتی ہے۔ ہر کتاب کے پاس اس جنگ کے لیے ہتھیار ہونے چاہییں۔ ان کا اہتمام بلا شبہ مصنف کرتا ہے، مگر اسی دوران میں جب وہ کتاب لکھ رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر مصنف کو کتاب کی اشاعت میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنے لختِ جگر کو کس ان جانی دنیا میں اس وقت تک جدوجہد کے لیے بھیج رہا ہے، جب خود مصنف کی ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی اور اس کا نشان بس ایک قبہ گور ہوگا، اور وہ بھی کئی مصنفوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ ہر مصنف چاہتا ہے کہ اس کی کتاب کی عمر اس کی اپنی عمر سے کئی گنا زیادہ ہو۔ یہ تو طے ہے کہ کتاب مکمل ہونے کے بعد، مصنف اپنی کتاب کو ایک معمولی سی قرولی بھی نہیں دے سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اسی کتاب کو نئے سرے سے زرہ بکتر پہنا کر جنگ کے محاذ پر بھیج سکتا ہے۔ جو مصنف اپنی کتابوں کو بعد میں ان کے دفاع کے لیے کوئی ہتھیار دینے کی کوشش کرتے ہیں، وہ کتاب کو اسی طرح اپنی شکست کا اعتراف کروانے پر مجبور کرتے ہیں، جس طرح کسی بڑے ملک کی فوج کا کمانڈر سرِ عام، دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالے اور اپنے ملک کی تاریخ کو سدا کے لیے سرنگوں کر دے۔ ہم عام طور پر مصنفین کو دنیا کی عقل مند ترین مخلوق سمجھتے ہیں۔ جب مصنفوں سے ہمارا واقعی سابقہ پڑتا ہے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم کتنے خوش فہم تھے۔ اکثر مصنف اتنی سی بات نہیں سمجھتے کہ اگر انھیں اپنی کتاب کی جنگ کے دوران میں اس کی مدد کرنی ہے تو ایک اور کتاب لکھیں۔ جنگ میں سپاہی کی ٹانگ، بازو یا حوصلہ ٹوٹ جائے تو اس کی جگہ نیا سپاہی بھیجتے ہیں، زخمی سپاہی کے صحیح سلامت ہونے کا واویلا، مصنفوں کو شرمندہ

کرنے کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ اکثر مصنف یہ بھی نہیں سمجھتے کہ وہ اپنی کتاب کو جنگ کا کوئی ہتھیار نہیں دے سکتے، صرف جنگ کی زبان دے سکتے ہیں، وہ بھی کتاب کے منھ میں نہیں، اپنے یا اپنے کسی جاننے والے کے منھ میں۔ جنگ کی زبان، بقا کی جنگ کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے۔ میرے ان سب مصنفین سے مثالی تعلقات رہے ہیں جو یہ بصیرت رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کوئی مصنف، کتاب کے ساتھ ہر جگہ ہو سکتا ہے کہ نہ سدا کے لیے۔ وہ جانتے تھے کہ کتاب کو دنیا کے کارزار میں بھیجنے کے بعد، مصنف کو خاموش ہو جانا چاہیے۔ جو کچھ کہے، کتاب کہے۔ اگر کوئی مصنف یہ سمجھتا ہے کہ کتاب خود کچھ نہیں کہتی، انھیں کتاب کی ہستی اور قاری کی صلاحیت، دونوں پر شک ہوتا ہے۔ اتفاق ہے کہ یہ سب مصنفین مرحوم تھے۔

کیا اپنے معاصر مصنفین سے تعلقات سے ذکر کی اب بھی ضرورت ہے؟

اخلاص کار

ناصر عباس نیرّ

9 اگست 2021ء

☆☆☆

4

نئے نقاد کے نام چوتھا خط

برادرعزیز!

تم نے کئی نقادوں کی تحریروں میں یا ان کی زبانی یہ جملہ پڑھا ہوگا کہ نقاد کا کام اچھے ادب کی تشویق پیدا کرنا ہے۔قارئین کو اچھی اوراعلیٰ کتابوں کے مطالعے کی ترغیب دینا ہی تنقید ہے۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں ، یہ حقائق سے زیادہ آرا اور تاثرات کی دنیا ہے۔لوگوں کے آرا قائم کرنے اوراپنے تاثرات میں دوسروں کو شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔آدمی ، دنیا اوراس میں موجود اشیا و مظاہر کے بارے میں رائے قائم کرکے ، دراصل اپنی ازلی تنہائی اور بے بسی کا مداوا کرتا ہے۔وہ اپنی رائے کے ذریعے ، اشیا کی ماہیت و مقصد سے متعلق اپنا مؤقف پیش کرتا ہے اور پھر یہی مؤقف ، دنیا کو اس کی موجودہ شکل یا بدلی ہوئی شکل میں قبول کرنے کی بنیاد بنتا ہے(اسی لیے مقتدر قوتوں کا ہدف ، دنیا کو بدلنے کے بجائے ، دنیا سے متعلق آرا کو تبدیل کرنا ہوتا ہے)۔بغیر کسی مؤقف کے دنیا میں جینے والا آدمی ، اس سیارے کی سب سے تنہا مخلوق ہے، لیکن سب سے دل چسپ بھی۔آہ! دنیا میں دل چسپ آدمیوں کا قحط ہے۔تم دیکھو گے کہ یکسر غلط ، بے بنیاد مؤقف بھی آدمی کی تنہائی مٹا سکتا ہے(اوراس کی بنیاد پر ایک پوری جماعت وجود میں آسکتی ہے)۔اسی لیے لوگ اپنی تنہائی مٹانے کے لیے بے بنیاد باتیں قبول کرنے اوراس سے بڑھ کر ، عجیب و غریب کام کرنے میں ہچکچاہٹ

محسوس نہیں کرتے۔

تم کبھی سوشل میڈیا پر چھوٹے چھوٹے گروہوں کا جائزہ لو تو تم پر کھلے کہ وہ سب گروہ دراصل ہم خیال لوگوں کے ہیں۔ اسی طرح تم کسی شخص کی آرا سے، یہ باآسانی جان سکتے ہو کہ وہ کس قسم کی دنیا اپنے اور دوسروں کے لیے پسند کرتا ہے، لیکن تم یہ بھی دیکھو گے کہ کسی رائے کو بار بار دہرانے والے چالاک لوگ ہوتے ہیں، وہ چیزوں کی اصل سے ہماری توجہ ہٹانے کی شعوری یا لاشعوری کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ جب یہ گروہ کی صورت اختیار کرتے ہیں تو طاقت بھی حاصل کر لیتے ہیں اور یہ طاقت، جو اپنی اصل میں گروہی ہے، انھیں اپنی رائے کے تنقیدی جائزے سے اکثر محروم رکھتی ہے۔ گروہ اپنی طرف پلٹنے، یعنی اپنی اصل کو سمجھنے کے بجائے، دوسروں پر جھپٹنے کا قائل ہوتا ہے۔

رائے کی جگہ تاثر رکھنے والے لوگ ابتدا میں معصوم، مگر آخر آخر میں متعصب ہو جاتے ہیں۔ تاثر اور رائے، دونوں ہمیں صرف ایک بات کی خبر دیتے ہیں کہ لوگ چیزوں کو کس طور دیکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ چیزیں اپنی اصل میں کیا ہیں، اس کا علم تمھیں آرا اور تاثرات سے نہیں ملے گا۔ جو لوگ صرف رائے اور تاثر پر بھروسا کرتے ہیں، وہ بھول ہی جاتے ہیں کہ دنیا میں حقائق بھی وجود رکھتے ہیں۔ وہ ایک بڑے آبی بلبلے میں مقید زندگی بسر کرتے ہیں، یہ تسلیم کیے بغیر کہ یہ آبی بلبلہ کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ نقاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ادب کی حقیقت اور اس سے متعلق آرا اور تاثرات میں فرق کرنا سیکھے۔ تمھیں اپنے اردگرد اور کتابوں میں آرا اور تاثرات کا انبار ملے گا جو تمھیں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ لوگوں نے ادب کو دیکھنے، جانچنے اور بیان کرنے کے کیا کیا اسالیب اختیار کیے ہیں۔ گویا رائے اور تاثر ہمیں، لوگوں کے ادراک سے متعلق خبر دیتے ہیں، چیزوں کی اصل سے متعلق نہیں۔ چیزوں کی اصل تک کوئی کوئی پہنچتا ہے،

مگر یہ وہی شخص ہوتا ہے جو سب سے پہلے چیزوں سے متعلق آرا اور خود چیزوں میں فرق کرنا سیکھتا ہے۔لہٰذا جب تم یہ پڑھتے ہو کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: مقدس وید اور دیوان غالب" تو مسحور ہو جاتے ہیں اور یہ جملہ تمھاری یادداشت کا مستقل حصہ بن جاتا ہے(آدمی عقلی باتیں یادرکھنے میں کاہل مگر جذباتی باتیں یاد رکھنے میں ماہر ہے)اور تم غالبؔ کی شاعری کا تجزیہ نہیں کرتے ،اس کی عظمت کا قصیدہ لکھتے ہو۔تم الہامی کتاب کے بشری عقل سے تجزیے کی جرأت شاید ہی کرو۔کسی مصنف کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دینے کا نتیجہ،اس کی پرستش کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔یاد رکھو، خطابت ،تاثر کا لازمی عنصر ہے۔ خطابت، منطق کو چار پتھر دور رکھتی ہے۔خطابت اور تاثر کا آمیزہ ، افیون سے کم نہیں اور یہ جا بجا مفت دستیاب ہے۔ رائے میں بلاشبہ کچھ نہ کچھ منطق ہوتی ہے،اور رائے رکھنے والا، مسحور کرنے سے زیادہ ،قائل کرنے کی سعی کرتا ہے۔رائے (اگر وہ میکانکی تکرار سے خود کو محفوظ رکھ سکے) انسانی شرف کے احترام کا بہ ہر حال خیال رکھتی ہے۔اپنی خطابت سے دوسروں کے ذہنوں پر آسیب کی مانند چھا جانے والے،انسانی شرف (یعنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت) کو بری طرح پامال کرتے ہیں۔لیکن تمھیں آرا اور تاثرات دونوں کے سلسلے میں چوکنا رہنے کی ضرورت ہوگی۔تمھیں یہ پورا حق ہے، بلکہ لازم ہے کہ تم میرے خیالات کو بھی قبول کرنے سے پہلے چھانو پھٹکو۔تو اس ساری گفتگو کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ خط کے آغاز میں درج کی جانیوالی رائے کا جائزہ لو اور پھر اسے قبول کرو۔

اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا واقعی "نقاد کا کام اچھے ادب کی تشویق پیدا کرنا ہے"؟ کیا نقاد کا یہ بنیادی کام ہے یا اس کے کام کے حاصلات میں سے ایک ہے؟ یہ دونوں مختلف باتیں ہیں۔ بنیادی کام اور اس کے حاصلات میں فرق روا رکھنا چاہیے۔بہت سے حاصلات میں سے ایک حاصل کو کسی چیز کی ماہیت کے لیے حکم کیسے

بنایا جاسکتا ہے؟ بنیادی کام، وہ کام ہے، جہاں سے کوئی چیز اپنے ہونے کا جواز حاصل کرتی ہے؛ جس کے بغیر اس چیز کا موجود ہونا اور اپنے ہونے کے معنی متعین کرنا محال ہے۔تنقید کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ کسی تحریر کے فن پارے کے طور پر قائم ہونے کے اصولوں کا محاکمہ کرے اوران اصولوں کے بارے میں کسی ابہام کا شکار نہ ہو؛ صاف لفظوں میں،تنقید ادب کے سرچشمے تک پہنچے؛فن پارے کے معانی اوران معانی کی تشکیل کے پیچیدہ عمل کا تجزیہ کرے۔کوئی فن پارہ،فن پاروں کی بھیڑ میں کیسے اور کتنی جگہ بناتا ہے، اس پر غیر مبہم رائے دے۔وہ دنیا سے کسی نئی ،مگرفن پارے کے لیے ناگزیرزبان میں بات کرتا ہے یا مانگے تانگے کی زبان میں، اسے واضح کرے۔وہ انسانوں کی تنہائی میں،ان کی روحوں سے سرگوشی کی صلاحیت رکھتا ہے کہ نہیں؛ وہ جن چیزوں کا انکار کرتے ہیں،یا جن سے فرار اختیار کرتے ہیں،اوراپنے انکار وفرار کے سو طرح کے جواز گھڑتے ہیں،ان کے روبرو انھیں لاتا ہے کہ نہیں۔مت بھولو کہ صرف وہی ادب ،دنیا کے بدلنے میں حصہ لے سکتا ہے،جو ہماری تنہائی میں ،ہم سے کلام کرسکتا ہے۔اس بنیادی کام کے احسن طریقے سے انجام دینے کے حاصلات کئی ہیں۔لوگ ،تنقید کے نتیجے میں کچھ تحریروں کی طرف متوجہ ہوں، یہ محض ایک حاصل ہے،اوراس کی اہمیت سے نکار نہیں۔

لوگوں کو اچھی کتابیں ضرور پڑھنی چاہییں اور خراب کتابوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔خراب کتابیں،خراب کھانے کی مانند ہیں۔آدمی کو بیمار بنادیتی ہیں۔لیکن سوال تو یہ ہے کہ اچھی اور خراب کتابوں کا فیصلہ کیسے ہوتا ہے؟ کسی اصول کے تحت یا اتھارٹی کے تحت؟ کیا محض کسی مشہور ومقتدر شخص کے کہہ دینے سے کوئی کتاب اچھی یا اس کے برعکس بن جاتی ہے؟ شہرت میں اتھارٹی بننے کے وافر جراثیم ہیں۔اس سے اشتہاری کمپنیاں فائدہ اٹھاتی ہیں۔تنقید،عقلی تجزیے کے سوا کسی

کو اتھارٹی نہیں مانتی، اس لیے اچھی بری کتاب کا فیصلہ اس تجزیے اور دلیل سے ہوتا ہے، جس کے بارے میں نقاد کا ذہن قطعی واضح ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جہاں تنقید اپنا کام نہ کر رہی ہو، وہاں عقل و منطق و تجزیے کی جگہ شخص، اس کا منصب، مرتبہ یا محض عمر اتھارٹی سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اگر تمھیں تنقید کی دنیا میں زندگی بسر کرنی ہے تو یاد رکھو کہ عمر، منصب، مرتبہ، شہرت، ان میں سے کوئی چیز دلیل کی جگہ نہیں لے سکتی۔

تنقید کے متعدد حاصلات میں سے ایک حاصل کو اس کا بنیادی کام بنا دینے کا نتیجہ کیا ہے؟ ایک ہی نتیجہ ہے: تنقید، آڑھت بن جاتی ہے۔ نقاد کی نشست پر کسی ایجنٹ کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ آڑھتی یا ایجنٹ کیا کرتا ہے؟ وہ چیزوں کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے (حالاں کہ وہ اکثر نہیں ہوتیں، اور اگر اتفاقاً ہوں تو ان کے خوش نما ہونے کا سبب کبھی نہیں بتاتا۔ بتا ہی نہیں سکتا) تا کہ لوگ ان کی طرف پرشوق محویت کے ساتھ متوجہ ہوں، انھیں پسند کریں، خریدیں اور اسے اس کا حصہ ملے۔ ایجنٹ کی ضرورت تاجروں کو ہوتی ہے۔ میں مانتا ہوں، ادب کی کتابیں، تجارت نہ بنیں تو ادب کو بقا کے لالے پڑ جائیں۔ اس لیے ادب ہی نہیں، سب طرح کی کتابوں کو آڑھتی بھی چاہییں۔ آڑھتی کے لیے علم و ذوق کی نہیں، منڈی کے معاصر رجحانات پر عبور کی ضرورت ہے۔ کچھ تنقید لکھنے والے شوق سے آڑھتی بنیں، مگر تم دونوں کے فرق کو نہ بھولو۔

اسی معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ تم غور کرو، جو "نقاد" یہ رائے رکھتے ہیں، وہ منڈی کے بروکر ہونے کے علاوہ، ایک بنیادی حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ وہ صرف انھی کتابوں کی تشویق کی سعی کرتے ہیں جو ان کے ہم خیالوں اور دوستوں کی ہوتی ہیں یا ان لکھنے والوں کی جو ان کے تصورِ دنیا کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اپنی آرا کے پردے میں یہ بات چھپاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کچھ نقادوں کی تحریروں میں شروع

سے آخر تک چند ہی ادیبوں ،شاعروں کے ناموں کی تکرار ہوتی ہے؟ انھیں پڑھیں تو لگتا ہے کہ اردو ادب بس چار شاعروں اور دو فکشن نگاروں کے سوا اپنے دامن میں کچھ نہیں رکھتا۔ نقادتو وہ ہے جو ان کتابوں پر بھی لکھے جو اس کے خیال یا تصور دنیا سے یکسر ٹکراتی ہوں مگر بہ طور ادب پارہ اہمیت کی حامل ہوں۔ نرگسیت اور تنقید، ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں۔ نقاد کی وفاداری ،ادب سے ہے، شخص سے نہیں۔ شخصی وفاداریاں، تجارت اور سیاست میں ہوتی ہیں۔

اسی مسئلے کا ایک زیادہ گہرا پہلو بھی ہے۔ تم ان نقادوں کے طرز عمل کا بہ غور مطالعہ کرو جو اپنے پسندیدہ ادیبوں کے لیے موقع بہ موقع تحسینی کلمات لکھتے ہیں۔ تم پر کھلے کہ وہ اس عمل سے درحقیقت خود اپنی نفسی دنیا کو ایک بحران سے بچا رہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہی تصورِ دنیا کے ساتھ تنہا جینے سے خود کو بحران میں پاتے ہیں۔ وہ جس مذہبی ، سیکولر، کلاسیکی ، جدید، مابعد جدید، ترقی پسند کسی بھی تصورِ دنیا کے حامل ہوتے ہیں، اس کے سلسلے میں انھیں مسلسل تائید چاہیے ہوتی ہے۔ عام زندگی سے لے کر، تاریخ، ادب، سیاست میں "بت سازی"، دراصل اپنے لیے کوئی تائید چاہنے کے سوا کیا ہے؟ ہم صرف اسی سے تائید چاہتے ہیں جو ہم سے "بڑا" ہو۔ نقاد "بت سازی" کے عمل میں شریک ہونے کے بجائے، اس عمل کا تجزیہ کرتا ہے۔

نقاد کے کام سے متعلق کچھ باتیں پہلے کہہ چکا ہوں۔ کچھ وہی اور کچھ دوسری کہنا چاہتا ہوں۔ نقاد، ادب کی شعریات سے لے کر اس کے موضوع، ہیئت، اسلوب، تکنیک وغیرہ کا تجزیہ اور محاکمہ کرتا ہے۔ شعریات وہ سرچشمہ ہے، جہاں سے ادب بہ طور ادب نمو کرتا ہے، اور خود کو غیر ادب سے جدا کرتا ہے۔ ایک لکیر ایسی ہوتی ہے، جہاں کے ایک طرف ادب ہے، دوسری طرف نا ادب ہے۔ کچھ لوگ اسے روند کر ایک نئی لکیر بھی کھینچ دیتے ہیں (ایسوں کو زیادہ توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے)، لیکن

لکیر کے ہونے سے انکار نہیں۔ سب ادبی کتابیں اسی سرچشمے سے نمو کرتی ہیں۔ یہ سب ادبی تحریروں میں اسی طرح رواں ہوتا ہے، جس طرح چشمے کے پانی میں ابلنے اور پھر ندی کی صورت بہنے کی صفت۔ لوگ سہل پسند ہیں۔ اسی لیے وہ صرف پانی کو دیکھتے ہیں، اس کے شور یا خاموشی کو سنتے ہیں، اور اس میں ڈوب جانے کا خیال انھیں آتا ہے (یہ پانی خامشی سے بہ رہا ہے/ اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں: احمد مشتاق)، یہ پانی کیسے بہہ رہا ہے، کہاں سے اپنے بہاؤ کی صلاحیت حاصل کر رہا ہے، اپنے اندر سے یا کہیں باہر سے یا بہ یک وقت دونوں سے، اس پر دھیان نہیں دیتے۔ وہ حسن و ترغیب حسن کے لیے تو حساس ہوتے ہیں، لیکن یہ سب کیسے ممکن ہوتا ہے اور اس کے مضمرات کیا ہوتے ہیں، اس سے غافل ہوتے ہیں۔ نقاد دونوں کے سلسلے میں یکساں حساس ہوتا ہے۔ فن پارے میں کئی ترغیبات ہوتی ہیں، کچھ تو کوہ ندا کی مانند ہوتی ہیں، بس آدمی کھنچا چلا جاتا ہے۔ سپردگی آسان ہے کہ آدمی خود کو دوسرے کی ذمہ بنا دیتا ہے۔ تنقید سپردگی میں ہوشیاری کو لازم قرار دیتی ہے۔"

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے"۔

تو بھائی بات یہ ہے کہ لوگ خود کو فن پارے کے بارے میں دو چار تحسینی جملے لکھتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کے معنی تھوڑی بہت تشریح کر دیتے ہیں یا پھر (کہانی کا) خلاصہ کر دیتے ہیں، ساتھ دو جملے بہ طور رائے ٹانک دیتے ہیں، وہ فن پارے کی اصل، اس کے معانی کے سرچشمے تک نہیں پہنچتے۔ شعریات کو تم ادب اور دوسری کتابوں کے ان تھک مطالعے کے بعد ہی گرفت میں لے سکو گے۔ ادب کے سوا کتابیں بھی انسان فہمی کا کام کرتی ہیں، ان سے نقاد کو ضرور بہرہ مند ہونا چاہیے (اس پر گفتگو ہم ایک اور خط میں کر چکے ہیں)۔ دو ایک کتابیں پڑھنے کے بعد، کسی کتاب پر مقتدر انداز میں رائے دینے والوں پر بس مسکرا دیا کرو، ان کی جسارت پر۔ (نقاد کو مسکرانا بھی

چاہیے)۔ ہر مصنف، شعریات یا سرچشمے کو باانداز دیگر بروے کار لاتا ہے، اسے سمجھے بغیر تنقید ادھوری ہے۔ پھر موضوع، اسلوب، تکنیک وغیرہ کے تجزیے کی باری آتی ہے۔ اب نقاد کے تجزیے کے نتیجے میں لوگ کسی مصنف یا کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو بہت اچھی بات ہے۔ اگر نقاد اس خیال سے کسی کتاب پر لکھے کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے تو یہ خیال اس کے طریقہ نقد پر بری طرح اثر انداز ہوگا۔ وہ خود سے یا زیر نقد کتاب سے بے ایمانی کا مرتکب ہوگا۔ وہ کسی کتاب کو دو ٹکے کی ثابت کرنے یا اسے آسمان پر چڑھانے کے خیال سے نہیں لکھ سکتا۔ وہ اپنے طریق کار کی پوری دیانت داری سے پابندی کرتے ہوئے، کتابوں کا تجزیہ کرتا ہے۔ نتیجہ کچھ نکلے۔ کوئی کتاب یا متن، اعلیٰ ثابت ہو یا اسفل، لوگ اسے پسند کریں یا اس سے دور ہوں۔ نقاد کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نقاد، ادب کے قارئین سے کوئی ربط ضبط نہیں رکھتا۔ ایک نقاد اور قاری میں بس یہ فرق ہے کہ نقاد فن پارے کو باریک بینی سے دیکھتا ہے، اور اس کے پاس دیکھنے اور جانچنے کا باضابطہ طریق کار ہوتا ہے اور پھر اپنے مطالعے کو مدلل انداز میں بیان کرنے کا اسلوب رکھتا ہے۔ یوں سمجھو، قاری بس سیر کرتا ہے، نقاد سفر نامہ بھی لکھتا ہے۔ چیزیں بیان میں آ کر ہی پوری طرح واضح ہوتی ہیں۔ لہٰذا قارئین کی سرسری نظر سے جو چیزیں غیر واضح رہ جاتی ہیں، نقاد انھیں کھول کر بیان کرتا ہے۔ اکثر قارئین اسی لیے حیران ہوتے ہیں کہ نقاد کو اسی ادب پارے کے وہ پہلو کیسے نظر آ گئے، جن کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس میں کوئی گہرا راز نہیں۔ ایک قاری متن اور خود اپنے خیالات پر ارتکاز کرنا سیکھ لے اور اس ارتکاز سے وابستہ ذمہ داریوں (جو مسلسل ادا کرنا ہوتی ہیں، دو ایک دنوں کی بات نہیں) کو پورا کرنے پر کمر باندھ لے، اپنی ذہنی کاہلی اور سرسری پن سے نجات پالے تو وہ نقاد ہے۔ گویا، نقاد ادب کی دنیا میں سہل پسندی کی تلافی کرتا

ہے۔سہل پسند قارئین کی (فکری ، جمالیاتی) مدد کرتا ہے۔(تم جانتے ہو، میں رہ نمائی جیسے الفاظ سے گریز کرتا ہوں)۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ، سب ادبی کتابیں مل کرایک اپنی دنیا (تم اسے روایت کہہ لو، جس کا علم تمھیں لازماً ہونا چاہیے)تعمیر کر رہی ہوتی ہیں،اس دنیا میں کسی کتاب کی جگہ کیا ہوگی ،اس پر رائے دیتا ہے۔یہی وہ مقام ہے، جہاں نقاد آزمائش سے گزرتا ہے۔ یہ آزمائش اس کے ذوق،فہم ،بصیرت ہی کی نہیں،اعصاب کی بھی ہے!

ناصرعباس نیرّ
23اگست 2021ء

☆☆☆

5

نئے نقاد کے نام پانچواں خط

'برادرم!

یوں تو لکھنے والوں کی مشکلات کئی ہیں۔ایک بڑی مشکل کا سامنا انھیں اس وقت ہوتا ہے، جب وہ سچائی سے دوچار ہوتے ہیں۔ایک مصنف، سچائی سے دوچار کیسے ہوتا ہے، اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔عام حالت میں اور لکھنے کے دوران میں سچائی سے دوچار ہونے کے تجربات یکسر مختلف ہیں۔عام حالت میں ہم سچائی سمیت کئی چیزوں کو سرسری لیتے ہیں؛غفلت، کاہلی، بے توجہی اور کئی بار غیر ذمہ داری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔چیزوں اور لوگوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔عام حالت، غالب کے لفظوں میں غفلت کی آسائش کی حامل ہے۔مگر لکھتے ہوئے ،ہم اپنی اس عام حالت کا اعادہ نہیں کر سکتے۔لکھنا، مکمل ذمہ داری کا عمل تو ہے ہی ہے، کچھ ان سربستہ رازوں اور سچائیوں کے سیل کی صورت ابل پڑنے کا لمحہ بھی ہے، جن کی طرف پہلے کبھی نگاہ نہیں گئی ہوتی ؛ یا ایک اندھے غار میں ان انوکھی آوازوں کی سمفنی سننے کا واقعہ ہے، جنھیں عام زندگی کے شور میں کبھی سنا نہیں گیا ہوتا اور جن سے دل دہل سکتا مگر روح توانا ہوسکتی ہے؛ یا ایک ایسی پیاس ہے جو ایک گھونٹ میں سمندر کو پی جائے مگر پھر بھی نہ بجھے۔یہ سب لکھنے والے کا دھیان کسی اور جانب، یعنی غفلت سے عبارت عام انسانی حالت، کی جانب نہیں ہونے دیتے۔غالب انسان کی ان دونوں حالتوں کے عارف تھے۔ایک جگہ کہا ہے: "چار سو دہر میں بازار غفلت گرم ہے"۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

وہم غفلت مگر احرام فسردن باندھے
ورنہ ہر سنگ کے باطن میں شرر پنہاں ہے

اس سے تم یہ بھی اندازہ لگا سکتے ہو کہ لوگ کتابوں پر کتابیں شایع کر کے بھی، ایک سطر نہیں لکھتے۔

ہم جس زمانے میں جی رہے ہیں، اسے مابعد سچائی کا زمانہ کہا جا رہا ہے۔ سچائی کا زمانہ وہ تھا، جب اکثریت کا سچائی پر اتفاق ہوا کرتا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سچائی، ہمارے ماننے نہ ماننے سے الگ وجود رکھتی ہے۔ کوئی بات سچ ہے تو سچ ہے۔ پھر دنیا کے ذہین، چالاک اور جاہ پسند لوگوں (ان تینوں کا اجتماع خاصا انسانیت کے لیے اکثر مہلک ثابت ہوا ہے) نے یہ سمجھ لیا کہ لوگ سچائی کا ادراک کیسے کرتے ہیں۔ انھوں نے سچ بات، سچ بات کہنے والے اور اس کو سچ تسلیم کرنے کے عمل کے مابین تعلق دریافت کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "اکیلا سچ" کہیں نہیں؛ یہ ایک پیچیدہ مرکب ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اس کے کس جز کو زیادہ اہمیت دیتے ہو۔ ان جاہ پسندوں نے یہ خیال کیا کہ "سچ تسلیم کرنے" کے جز کو زیادہ اہمیت دینے کے نتائج ان کے حق میں غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔ یہ دھماکہ خیز سچ تھا۔ انھوں نے سچ باتوں یا حقائق کو ایک طرف کیا اور سچ تسلیم کرنے کے طریقوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یہی چالاک اور جاہ پسند لوگ، ان سب اعلیٰ ترین انکشافات کو بھی اپنے حق میں پھیرنے میں ملکہ رکھتے ہیں، جن کے لیے نیک طبع مخلص لوگ عمریں صرف کرتے ہیں۔ تو میرے بھائی مابعد سچائی میں سچائی مسئلہ نہیں، کوئی چیز کیسے سچ کے طور پر پیش کی جاتی ہے اور کیسے سچ سمجھی جاتی ہے اور اس سے مادی، سیاسی، معاشی مفاد کی کون کون سی فصل کاٹی جا سکتی ہے، وہ مسئلہ ہے۔ اب یہی ذہین، چالاک اور جاہ پسند لوگ، جو ہم سب کی دنیا (سماجی

وذہنی) پر اختیار کی سعی میں رہتے ہیں، وہ غیر حقیقی چیزوں کو سچ بنا کر پیش کرتے ہیں، بلکہ یوں سمجھو کہ سچ گھڑتے ہیں۔ وہ انسانی ذہن کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں ، جو بالکل روزمرہ تجربات میں اپنا اظہار کرتی ہے۔تم نے کئی بار رات کی تاریکی میں کسی رسی کو سانپ، کسی سائے کو انجانا شخص یا انجانی مخلوق سمجھا ہوگا۔تمھارا دل ڈر سے بھر گیا ہوگا۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ عام ......اور سب سے بڑا ڈر اپنی موت کا ہے...... انسانی ذہن، چیزوں کی حقیقت کا مکمل اور بے خطا علم حاصل کیے بغیر، ان پر حقیقی ردّ عمل دینے میں طاق ہے۔انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہر بات کی مین میخ نکالنے والا عام انسانی ذہن، سچائیوں کے سلسلے میں کم ہی سنجیدہ ہے۔ اس کمزوری کا فائدہ سیاست دان، سرمایہ دار، مذہبی وسماجی راہنما سب اٹھاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ لوگ چیزیں کی سچائی سمجھے بغیر، ان کے لیے اپنی جان دینے اور دوسروں کی جان لینے پر تیار رہتے ہیں۔

مابعد سچائی کے اس زمانے میں، ایک مصنف کی مشکلات بڑھ گئی ہیں۔کوئی تنقید لکھے کہ افسانہ یا شعر لکھے، اسے اس صف میں کھڑا نہیں ہونا چاہیے، جس میں وہ سب سیاست دان، سرمایہ دار، مذہبی وسماجی راہنما کھڑے ہیں جو سچائیوں کو منکشف کرنے کے بجائے، ان کی تشکیل کے عمل میں شریک ہیں؛ جو سچائی کے نام پر ایک ایسی آب دار، مثالی دنیا سامنے لاتے ہیں جس میں اس کے تضادات کو چھپانے کا باقاعدہ اہتمام کیا گیا ہوتا ہے۔ جو شخص ،لوگوں کے دلوں میں، سچائی تک خود پہنچنے کی تڑپ پیدا کرنے کے بجائے، انھیں اپنی کہی یا لکھی ہوئی باتوں کو، کسی استفسار کے بغیر، سچائی تسلیم کرنے پر مائل یا مجبور کرتا ہے، اس کا یقین مت کرو۔تم بہت سے مصنفوں کو ایسے لوگوں کی صف میں کھڑا پاؤ گے۔ وجہ بہت سادہ ہے۔ وہ سچائی کی جگہ طاقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ان میں سے اکثر دونوں کے فرق اور دونوں کے اثر اور دونوں کے ثمرات اور خطرات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اسی لیے وہ طاقت کا ساتھ دیتے ہیں۔

وہ سچائیوں کے گھڑنے اور انھیں اپنے اثر آفریں قلم سے پھیلانے میں اہل جاہ کا ساتھ دیتے ہیں اور دعویٰ حق کا کرتے ہیں۔ ایسی سچائیوں کا واحد مقصد اپنی (مخلوق خدا کی نہیں) طاقت، دولت، اختیار اور اثر میں لامحدود اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن کچھ مصنف محض اس لیے جاہ پسندوں کا ساتھ دیتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں عاجزی ہوتی ہے۔ وہ خود سے، کسی بھی مفہوم میں بڑی، کسی بھی شے کے سامنے جھکنے میں عافیت اور تحفظ محسوس کرتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کی سادہ لوحی، معصومیت اور ایک ازلی بزدلی ہوتی ہے۔ ایسے مصنف خود سے بڑوں کا ساتھ دینے کے لیے کسی بھی حد تک، اپنی طبیعت کی ساری بے غرضی کے ساتھ، جاسکتے ہیں۔ یاد رکھو، علم کے بغیر اخلاص وایثار بے کار ہے۔ اس لیے تمھیں جاہ پسندوں اور ان کا ساتھ دینے والے مصنفوں سے چوکنا رہنے ہی کی ضرورت نہیں، بلکہ ان کے محاسبے کی جرأت بھی کرنی چاہیے۔ لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے، جب تم پہلے خود سچائی کو سمجھ لو۔ گھڑی گئی اور واقعی سچائی میں فرق کرلو۔

سچائی کیا ہے؟ تم اس سوال پر دنیا کے بے غرض عالموں کو بھی منقسم پاؤ گے۔ اگر تم ان مسائل کی فہرست بناؤ جو انسانی ذہن کو ابتدا سے اب تک الجھاتے آئے ہیں تو سچائی کے مسئلے کو سرفہرست پاؤ گے۔ سچائی وجود رکھتی ہے۔ اس پر تم بہت کم اختلاف پاؤ گے۔ مگر یہ اپنی اصل میں کیا ہے اور اس تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟ اس پر شاید ہی کسی کو متفق پاؤ۔ تم اس سوال پر ضرور غور کرو کہ اس اختلاف کا سبب، سچائی ہے یا ہم؟ کیا سچائی سب پر اپنا الگ الگ رخ روشن کرتی ہے، یعنی اپنی اصل میں جامد نہیں ہے یا یہ ہم ہیں جو اسے ٹکڑوں، رنگوں، پیرایوں میں بانٹ دیتے ہیں؟ یہ بھی سوچو کہ سچائی کو رنگوں اور پیرایوں میں بانٹنے میں کتنا دخل ہماری بشری مجبوریوں کا ہے اور کتنا دخل انسانی فطرت کے اسفل پہلوؤں کا ہے؟ بشری مجبوریوں اور بشر کے اسفل پہلوؤں کے

فرق کو فراموش نہ کرو۔ مثلاً دیکھو کہ ہم جن "سچائیوں" سے دوچار ہوتے ہیں، وہ ہم تک "خالص" شکل میں نہیں پہنچتیں؛ ان پر ایک طرف ہماری ترجیحات، اقدار، عقائد، ہماری قومی، تہذیبی حسیت، ہماری "کنڈیشننگ" اور ہمارے مجموعی تصورِ دنیا کا اثر ہوتا ہے اور دوسری طرف ہمارے تعصّبات، ذاتی پسند ناپسند، چیزوں کو مسخ کرنے کی ہماری جبلت کا اثر ہوتا ہے۔ پہلی صورت کو بشری مجبوری کہو۔ اس لیے کہ ہم سچائی کے ادراک میں یکسر خالی الذہن نہیں ہوتے۔ (ہو سکتے ہیں یا نہیں، اس سے دل چسپی ہو تو بودھی تصور شونیتا کو سمجھو)۔ دوسری صورت کو بشر کے اسفل میلانات کی روشنی میں سمجھو۔ جہاں سچائیوں کو دانستہ مسخ کیا جاتا ہے اور انھیں تراشا جاتا ہے، وہاں پس منظر میں طاقت کی آرزو کارفرما ہوتی ہے۔ یوں تو طاقت اپنے اظہار کے سو پیرائے رکھتی ہے مگر اپنا سب سے مؤثر اظہار وہاں کرتی ہے، جہاں انسان زیادہ کمزور اور اسی سبب سے زیادہ آرزومند ہوتا ہے۔ طاقت، عام انسانوں کو ایک مثالی دنیا کا خواب دکھاتی ہے۔ آدمی کی حقیقی کریہہ، تاریک، آسیب زدہ دنیا کے مقابل، ایک روشن، پرآسائش، آراستہ دنیا کا خواب۔ آزردہ روحیں، جلد شکار ہوجایا کرتی ہیں۔ وہ اس پر جلد یقین لے آتی ہیں کہ کسی دوسرے کی دکھائی گئی روشنی میں اپنی تاریکی کو مٹایا جاسکتا ہے۔ وہ نجات دہندہ میں طاقت کی آرزو کو پہچاننے کے سلسلے میں سخت غبی پن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ تم یہ بھی مشاہدہ کروگے کہ مثالی دنیا کا خواب دکھانے والوں کو سب سے زیادہ ضرورت اچھے خطیبوں اور مقبول عام مصنفوں کی رہی ہے، دنیا کو واقعی بدلنے والوں کی نہیں۔ اس سب کو انسانی فطرت کے اسفل پہلوؤں کی ذیل میں رکھو۔

کسی بھی سچائی سے تمھارا سابقہ پڑے تو تین اور چیزیں بھی پیش نظر رکھو۔ ذہن، وقت اور زبان۔ سچائی کو پانا جس قدر مشکل اور اہم ہے، اتنا ہی اہم اس کا بیان ہے اور اتنا ہی اہم یہ ہے کہ اسے کب اور کہاں پیش کیا جارہا ہے۔ اوپر جن

ترجیحات، اقدار، حسیت اور دیگر چیزوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے سوا خود انسانی ذہن کی ایک عمومی خصوصیت بھی سچائی پر اثر انداز ہوتی ہے۔تم نے دیکھا ہوگا کہ انسانی ذہن کئی بار کسی بخیل اور بھکاری کی مانند ہوتا ہے۔ وہ اپنی جمع پونجی کو خود خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے اور دوسروں سے مانگی تانگی چیزوں سے کام چلانے کی کوشش کرتا ہے۔انسانی ذہن اپنی توانائی مستقبل کے کسی خدشے کے سبب بچانا چاہتا ہے، یہ خیال کیے بغیر کہ اس نے مستقبل کو دیکھا نہیں؛ دیکھا حال کو ہے۔ذہن نے حال سے گریز اور کل پر چیزوں کے ٹالنے کے کئی طریقے اپنا لیے ہیں۔مشکل باتوں، مشکل سوالوں ، جو دراصل چیزوں سے متعلق بنیادی سوال ہوتے ہیں، ان سے بچنے والے سب لوگ ، ذہن کی اسی بخیلی اور بھک منگی خصوصیت کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت جب سچائی کے ضمن میں حاوی ہوتی ہے تو پھر وہی ہوتا ہے جو اب---مابعد سچائی کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔اکثر نے دوسروں کی وضع کی ہوئی سچائیوں کے پلے کارڈ اٹھا رکھے ہیں۔ دھوپ میں خود جلتے ہیں اور اس کا ثمر، یخ کمروں میں بیٹھے جاہ پسند اٹھاتے ہیں۔تو سب سے پہلے، اپنے ذہن کو اپنے وسائل کے ضمن میں بخیل اور بھکاری بننے سے بچاؤ۔اور دوسروں کے ذہن کی انھی خصوصیات کو پہچانو۔تم تک سچائیاں کیسے پہنچتی ہیں، ان کی زبان کا تجزیہ کرو۔ایک زمانہ تھا، سچائی کی الوہی زبان پر کوئی شک نہیں کرتا تھا۔ پھر سچائی کی غالب زبان مادی اور سماجی ہوگئی۔اب سچائی الگورِدم کے ذریعے اپنا اظہار کر رہی ہے۔سچائی کے سلسلے میں زبان کی ان سب صورتوں کا تجزیہ کرو۔

ہماری زبان اور قلم سے ادا ہونے والے لفظ، ہمارے سب سے بڑے گواہ ہیں۔ سلطانی گواہ۔ ہمارے سچ اور جھوٹ دونوں کے۔اسی لیے ادب کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا گواہ سمجھا جاتا ہے۔ایک دل چسپ بات سنو۔زبان کو سچائی سے، بہ طور سچائی کوئی سروکار نہیں (یہ سروکار ہمیں ہے)۔وہ سچ گھڑنے والوں اور اس سچ پر سوال

اٹھانے والوں، دونوں کا یکساں ساتھ دیتی ہے۔ایک بالکل جھوٹا مگر " قادرالکلام" شخص، اپنے سچے ہونے کا یقین دلا سکتا ہے۔(ہوشیاری دل نادان بہت کرتا ہے/ رنج کم سہتا ہے اعلان بہت کرتا ہے: عرفان صدیقی)اور ایک سچا شخص ، اپنی زبان کی لکنت کے سبب، جھوٹا سمجھا جا سکتا ہے۔اسی لیے عارف شاعر زبان پر خاموشی کو ترجیح دیتے چلے آئے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں:

در خموشی ،لفظ و معنی قابل تفریق نیست
حرف بے رنگ از کشادلب دو پہلو می شود

(خاموشی میں لفظ اور معنی کی تفریق نہیں،لیکن سادہ حرف بھی منھ سے نکل کر دو پہلو ہو جاتا ہے)

لیکن ہم جیسے لوگوں کی سب سے بڑی طاقت زبان ہے۔تم بھی زبان کی اس عجیب وغریب صلاحیت کو سمجھو۔یوں سمجھو، یہ تمھاری --اور ہم سب کمزوروں کی سب سے بڑی طاقت ہے۔اگر کوئی مسند نشین صریحاً جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کر سکتا ہے تو ہم جیسے بوریہ نشین اس گھڑے ہوئے سچ کا ایک ایک ریشہ الگ کر سکتے ہیں اور اس کو بے دست و پا کر سکتے ہیں۔ زبان پر کسی کا اجارہ ممکن نہیں۔یہ معمولی بات نہیں ہے۔محکومی، جبر اور استحصال کی کئی بھاری زنجیریں زبان کی مدد سے کٹی ہیں۔لیکن ایک اہم بات نہ بھولو۔مسند نشین، سچائیاں گھڑ کے ہمیں اپنی سچائیوں سے دور بھی لے جاتے ہیں۔ جب ہم ان کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہیں تو دراصل انھی کی وضع کی گئی قلمرو میں اپنی بہترین قوتوں کو صَرف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔اس طور طاقت ور اپنے خلاف مزاحمت کو بھی اپنے حق میں کرنے کا راستہ نکال لیتے ہیں۔اگر تمھیں اپنی تحریروں سے ایک نئی دنیا واقعی پیدا کرنی ہے تو جاہ پسندں اور مسند نشینوں سے حقیقی فاصلہ اور ان کی وضع کی گئی دنیا کو سمجھنے، تجزیہ کرنے کے باوصف، اس سے ذہنی فاصلہ قائم رکھنے کا مشکل کام کرنا ہوگا۔

سچائیاں جس سیاق میں پیش کی جاتی ہیں، ان کا جائزہ لو۔ ان میں کس کو مخاطب کیا گیا ہوتا ہے، اسے جاننے کی کوشش کرو۔ مخاطِب گھر کے بھیدی کی مانند کئی راز کھول سکتا ہے۔ خطیب اور مصنف، اپنی زبان و تحریر میں ایک خاص لحن پیدا کرتے ہیں۔ اس کو سمجھو۔ کبھی یہ انسانی لحن ہوتا ہے، کبھی اسے دیوتاؤں کا لحن بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس دوسری قسم کے لحن کے سلسلے میں تمھیں زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ اس میں طاقت اور تقدس کا ایسا اجتماع ہوتا ہے کہ سننے، پڑھنے والا، اپنے استفسار پسند ذہن ہی کو نہیں، اپنی پوری ہستی کو اس کے سپرد کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔

کسی بات میں عجلت سے کبھی کام نہ لو۔ عجلت، غفلت کو جگاتی ہے۔ سچائی کے طور پر پیش کی گئی باتوں میں وقت کو لازماً ڈھونڈو۔ یہ سوال اٹھاؤ کہ اسے ابدی سچ کے طور پر پیش کیا گیا ہے یا ایک تاریخی اور اضافی سچ کے طور پر۔ تم دیکھو گے کہ اکثر مقبول عام مصنف، اپنی باتوں کو ابدی سچ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ ابدی سچ کی اپنی جستجو کو کئی بار ابدی سچ تک رسائی حاصل کر لینے کے دعوے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ سچائی اور اس کے دعوے کے فرق سے تو کسی لمحے غافل نہ ہو۔ کئی بار یہ دعویٰ تم سنو گے کہ کچھ سچائیاں عام آدمی ......یعنی میری اور آپ ......کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے انھیں چپ چاپ قبول کر لینا چاہیے۔ یہ دعویٰ کرنیوالے سے اتنا تو پوچھا جاسکتا ہے کہ بھائی، جو سچائی مجھ مورکھ کی عقل اور فہم سے بالا ہے، وہ میرے کس کام کی؟ کیا یہ آدمی کی حق تلفی نہیں ہے کہ اس تک سچائی، اس کی اپنی زبان میں اور اس کی فہم کے مطابق نہ پہنچے؟ چینی کہتے ہیں کہ چیزوں کو بیان کرنے کے چونسٹھ طریقے ہیں۔ ہم جیسے عام آدمی یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک طریقہ تو ہماری سطح ،توفیق، بساط کے مطابق ہوگا۔

تم اس سوال سے ضرور دوچار ہو گے کہ سچائی اپنی اصل میں پتھر کی مانند ہے یا

آگ کی مثل؟ ایک نقاد کے طور پر تمھیں ادب کے مطالعے میں، اس سوال سے دوچار ہوئے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ ہم یہاں سچائی کے مابعدالطبیعیاتی رخ کو ایک طرف کرتے ہیں اور صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ادب کی سچائی، جامد ہے یا متحرک؟ ادب کی سچائی پر تفصیلی گفتگو ہم اگلے خط میں کریں گے یہاں ادب کی سچائی سے مراد فقط اس کی ہیئت اور موضوع لو۔ کیا نظم، غزل، ناول، افسانے کی ہیئتیں جامد ہیں یا تغیر پذیر؟ اسی طرح کیا ادب، جن تصورات، تجربات، موضوعات کو پیش کرتا ہے، وہ جامد ہیں یا متحرک؟ اسی طرح کسی بھی صنف کی زبان اور اسالیب سدا یکساں رہتے ہیں یا بدلتے رہتے ہیں؟ آخری سوال یہ کہ کیا ادب کی جمالیات، پتھر کی مثل ہے یا آگ کی مانند؟ تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ سچائی کا یہ سفر کس قدر کٹھن ہے۔ لیکن ایک اور کٹھن مرحلہ باقی ہے، فن کی سچائیوں کا، جس پر اگلے خط میں بات کریں گے۔

ناصر عباس نیّر

23 ستمبر 2021ء

☆☆☆

6

نئے نقاد کے نام چھٹا خط

برادرعزیزی!

صحیح کہا۔ بزرگ نقاد کے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ تخلیق پراسرار، بھید بھری، کیفیات و معانی سے لبالب ہے کہ تنقید جیسی عقلی و منطقی چیز اس کا ٹھیک ٹھیک ادراک کرنے سے بھی قاصر ہے۔ انھوں نے فن پارے کوٹھیک پہچانا، مگرفن پارے کوسمجھنے اور بیان کرنے کے عمل کے فہم میں ٹھوکر کھائی۔ آدمی کو اپنی بزرگی ہی کو نہیں، اس حقیقت کو بھی مان لینا چاہیے کہ وہ بھی ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ لمبی عمر، کثیر تجربات اور ڈھیروں ڈھیر مطالعہ، چیزوں سے متعلق دانائی کی ضمانت نہیں ہیں۔ ہم سب کو جاننا چاہیے کہ چیزوں کی اصل کو اس سے غرض نہیں کہ ان تک رسائی حاصل کرنے والا کون ہے۔ کس عمر، صنف، مسلک یا قوم سے تعلق رکھتا ہے، یہاں تک کہ اس سے بھی غرض نہیں کہ وہ نیک ہے یا بد، دولت مند ہے یا بھک منگا۔ چیزوں کی اصل ہم تک یہ پیغام بار بار پہنچاتی ہے کہ وہ ایک ایسا "مقام" ہے جہاں باہر کی دنیا میں جاری ہر قسم کی تفریق اور کش مکش کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یادرکھو، تفریق ہی کشمکش اور سب خوں ریز جنگوں کا سبب ہے۔

سب بڑے فن پارے ایک عجب اسرار کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ بات کم ہی متنازع ہے۔ اب ذرا غور کرو کہ یہ کیسے پتا چلا کہ فن پارہ اسرار کا حامل ہوتا ہے؟ ظاہر ہے، اسے ایک شخص نے محسوس کیا ہے اور بیان کیا ہے۔ لیکن یہ شخص کون ہے اور اس کے پاس کیا خصوصی صلاحیت ہے؟ کیا سب لوگ جو فن پاروں کو دیکھتے ہیں، ان کے

سب بھید، جمال، اسرار کی تھاہ پا لیتے ہیں اور پھر ان کے بارے میں اپنے احساسات اور خیالات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں؟ ظاہر ہے، سب ایسا نہیں کرتے، نہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہومر کی اوڈیسی ہو کہ شیکسپیئر کے ڈرامے ہوں، رومی ہو یا غالب، کالیداس ہو کہ دستوفسکی ہو مارسل پراؤست کہ بورخیس؛ کافکا ہو قرۃ العین حیدر، نجیب محفوظ یا اتالو کالوینو یا حوزے سارامگو۔ کیا ان سے متعلق ہر کوئی "اسرار" محسوس کر لیتا ہے اور اسے بیان کی استطاعت بھی رکھتا ہے؟ تم یقیناً کہو گے کہ نہیں۔ تم نے اپنے ہی اردگرد ایسے کئی لوگ دیکھے ہوں گے جو ان میں سے اکثر کو مشکل پسند کہہ کر بات ختم کر دیں گے۔ وہ صرف ان کتابوں کی پسند کرتے ہیں جنھیں چیونگم کی مانند کچھ دیر چبایا اور پھر اُگلا اور پھینکا جا سکے۔ کوئی مستقل، دیرپا یادداشت، نہ تعلق۔ (اسپلپ فکشن کہتے ہیں) انھیں ادب کے بدن کا لمس، حرارت اور اس کی ہستی کی بصیرت نہیں چاہیے، جو ایک مستقل رشتے کی بنیاد ہیں۔ آپ کسی ادیب کی ایک کتاب پڑھتے ہیں، اس کی حسی و ذہنی دنیا سے لگاؤ محسوس کرتے ہیں تو پھر اس کی سب کتابیں پڑھنے کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ تم نوجوان ہو، ذرا بتاؤ لمس کی یادداشت قوی ہوتی ہے یا ذائقے کی؟ کتابوں کو چیونگم سمجھنا چاہیے یا ایک جیتا جاگتا وجود؟

اچھے فن پاروں میں کیسے متضاد و متفرق چیزیں یکجا ہوتی ہیں، اسے کم لوگ ہی سمجھتے ہیں اور اس سے کم لوگ متضاد چیزوں کو سہارنے کی اخلاقی وہ ذہنی جرأت رکھتے ہیں۔ فن پاروں کو سراہنے کے لیے معمول کے کئی رویوں کو وقتی طور پر معطل کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو ہم نے ہر وقت ہاتھ میں میزان پکڑی ہوئی ہے اور جس میں دوسروں کی اخلاق و کردار سے لے کر، ان کی حب الوطنی اور نیکی و بدی سے متعلق فیصلے صادر کر رہے ہوتے ہیں، اسے فن پاروں سے دوچار ہوتے ہی، ایک طرف دھر دینا چاہیے۔ ہماری اپنی ہستی میں، دوسروں کی دنیا میں مسلسل مداخلت کی عادت کے

سوابھی کئی دل چسپ چیزیں ہوسکتی ہیں۔فن ،ہمیں اپنی ہی ہستی کی سب سے دل چسپ چیز کے روبرو لاتا ہے۔جب تم فن پاروں سے دوچار ہونے کوشعار کرلو گے تو تمھیں میری یہ بات زیادہ صراحت سے سمجھ آئے گی۔سب فن پارے فرضی ہیں مگر وہ سب سے زیادہ ہماری--داخلی وخارجی---حقیقی دنیا کے سلسلے میں حساس ہیں۔تو میرے عزیز قصہ یہ ہے کہ سب لوگ فن پارے کے اسرار تو دور کی بات ہیں،ان کے بنیادی معنی (sensebasic) تک کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔یہ کہنا کہ فن پارے کو سمجھا نہیں جاسکتا،فن پارے کو اس کردار سے محروم کرنے کے مترادف ہے جو وہ ہماری حسی وذہنی وتخیلی دنیا سے لے کر سماجی دنیا میں ادا کرسکتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ فن پاروں کو سراہنے اور ان کے معانی تک رسائی کے لیے کوئی خاص رسمی اہلیت ہونی چاہیے جو ہمیں ادارے سکھا سکتے ہیں۔ایسا کرنا فن پاروں کی روح سے سخت ناانصافی ہوگی۔یہ فن پارے ہی ہیں جو دنیا کے سب لوگوں کو سب طرح کی تفریقات سے اوپر اٹھا کر ایک "انسانی جگہ" پر لے آتے ہیں۔اہلیت اور نااہلیت بھی ایک بڑی تفریق ہے جو بہ ہر حال فطری نہیں ہے۔میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فن پارے کے بنیادی معنی تک پہنچنا،یکسر خالی ذہن سے ممکن نہیں ہے۔اگرچہ کوئی شخص خالی الذہن ہوتا بھی نہیں،(اس زمانے میں تو یوں بھی ہم نے اپنے ذہن کو شکم بنالیا ہے ،جسے ہم کسی وقفے کے بغیر،اس کی بھوک پیاس دیکھے بغیر،الم غلم چیزیں کھلاتے پلاتے رہتے ہیں) لیکن فن پاروں کے سلسلے میں اگر تم چند بنیادی باتیں نہیں جانتے تو ان کے حسن، معنی ،اسرار یا بھید جو بھی کہیں،ان کا معمولی سا ادراک بھی نہیں کرسکتے۔اگر تم دھرپد، خیال ،ٹپہ، ترانہ سے متعلق سرے سے کچھ نہیں جانتے تو کلاسیکی موسیقی تمھارے لیے بیزار کن تکرار سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔لیکن اگر تم جانتے ہو کہ بول کیا ہے،سر کیا ہے، لے کیا ہے،ان کی بندش کیا ہے،استھائی اور انترے میں

کیا فرق ہوتا ہے تو آپ خیال کی گائیکی کی داد اس طرح دیں گے، جیسے کوئی نیا عظیم الشان جزیرہ دریافت کرلیا ہو۔اسی طرح اگر طلسم کو غیر حقیقی اور سراسر فریب سمجھتے ہو تو داستانی طلسم کا کمال تم سے او جھل رہے گا۔داستان کو ناول کی طرز پر نہیں پڑھا جا سکتا۔ اسی طرح اگر تم ناول کو جدید انسان کی سب دیوتا نما طاقتوں کے خلاف جسارت آمیز جدوجہد سے ہٹ کر پڑھو گے تو ایک سادہ پلاٹ والی کہانی اور بڑے ناول میں فرق کو نہیں پہچان سکو گے۔مشاعرے کے مقبول شاعر اور سادہ پلاٹ والی کہانیاں لکھنے والے، دونوں چالاکی سے کام لیتے ہیں: اپنے سامعین وقارئین کو مسرت کے نام پر تفریح مہیا کرنے کی چالاکی۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ لوگ ادب سے تفریح کا باقاعدہ مطالبہ بھی کرتے ہیں۔کیا دنیا میں مسخروں کی کمی ہوگئی ہے؟

اس مقام پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن پاروں کو سراہنے اور ان کی معنوی دنیا میں اترنے کے لیے کچھ نہ کچھ "علم" چاہیے۔کیا مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ "علم" کس صلاحیت سے حاصل ہوتا ہے؟ تم کہو گے کہ میں نے ذوق کا لفظ کیوں استعمال نہیں کیا۔میرے بھائی، ذوق فن پاروں کے مسلسل دیکھنے، سننے، پڑھنے، ان کے ساتھ شب و روز بسر کرنے اور ان کے بارے میں گفتگوئیں سننے ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اس کا ایک اشراقیائی پہلو بھی ہے (جس پر پھر کبھی بات کریں گے)۔یاد رکھو، ذوق، کبھی فہم سے الگ نہیں ہوتا۔ہم جس چیز کو سرے سے سمجھ ہی نہیں سکتے، اس کا ذوق ہم میں پیدا نہیں ہوسکتا۔جو آدمی کلاسیکی موسیقی کو سمجھ نہیں سکتا، وہ اس کا ذوق کیسے پیدا کرسکتا ہے؟ ایک یکسر معمایا مکمل طور پر پراسرار چیز ہمیں خوفزدہ، مرعوب کرسکتی ہے ،یا ورطہ حیرت میں ڈال سکتی ہے،اپنی نا قابل فہم ہیبت سے ہمیں اپنا مطیع بنا سکتی ہے،لیکن اپنے لیے پسندیدگی کے حقیقی جذبات، ہمارے دلوں میں پیدا نہیں کرسکتی۔ہم معموں کے سلسلے میں ہمیشہ مشکوک رہتے ہیں۔یاد رکھو، خوف اور ذوق یکجا

نہیں ہو سکتے۔ کچھ ادیبوں کی عظمت کو ایک ایسے اسلوب میں بیان کیا جاتا ہے جو ہم پر ہیبت طاری کرتا ہے، ان کی عظمت کے باوجود ہم ان کو سراہا نہیں سکتے۔ جو چیزیں انسانی فہم کے دائرے میں آتی ہیں، ہم انھی کا ذوق رکھ سکتے ہیں۔ تاہم یہ لازم نہیں کہ جس شخص میں اعلیٰ ذوق ہو، اس میں فہم کا درجہ بھی اتنا ہی بلند ہو۔ یا جن میں فہم کی سطح بلند ہو، ان کا ذوق بھی اسی درجے کا ہو۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی شخص میں تخیل اور تعقل ایک ہی مرتبے کے ہوں، لازم نہیں۔ جہاں یہ دونوں ایک مرتبے کے ہوتے ہیں، وہاں فن کی تخلیق ہو کہ اس کی تفہیم معجزاتی سطح کو پہنچ جاتی ہے۔ تو بھائی بنیادی بات یہ ہے کہ تسلیم کر لیا جائے کہ ایک شخص میں تخیل، آتش فشاں کی مانند ہو سکتا ہے اور تعقل کی محض چنگاری ہو سکتی ہے۔ ایک شے کے سلسلے کسی شخص کی نارسائی، کسی صنف یا ڈسپلن کی نارسائی کیسے ہوگئی؟

میرا مئوقف صرف اتنا ہے کہ فن پارے کے اسرار کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے، جس کے پاس فن سے متعلق علم ہو اور مزید علم حاصل کرنے کی جرأت وصلاحیت اور ولولہ ہو۔ جو شخص اسرار کے روبرو آ کر، اس کی جمالیاتی ہیبت کو محسوس کرنے کے بعد ،اس کی تفہیم میں خود کو عاجز پائے، اسے خاموش ہو جانا چاہیے؛ اسرار سے متعلق کوئی رائے نہیں دینی چاہیے۔ ہر نوع کی تفہیم ایک عقلی سرگرمی ہے اور انسانی عقل کوئی کم جرأت مند نہیں ہے۔ ایک عقلی سرگرمی، تخیلی سرگرمی سے مختلف ضرور ہے، مگر دونوں میں سے کوئی کسی سے کم تر ہے نہ ایک کے مقابلے میں دوسری غیر ضروری۔ سب سے بڑھ کر فن پاروں نے اپنے اندر داخل ہونے کے جو راستے مہیا کر رکھے ہیں، ان کا فہم وعقل سے کوئی تضاد نہیں ہے۔ کون سا فن پارہ ہے جو اپنے سراہے جانے کی تمنا نہیں رکھتا؟ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اگر فن پارے خود گفتگو کر سکتے تو وہ اپنے سراہے اور سمجھے جانے اور اپنے بہترین جوہر سے متعلق گفتگو کیے جانے ہی کی آرزو کرتے، اور

دنیا سے متعلق اپنے سب خیالات کی تمہید، اسی گفتگو کو بناتے۔ ایک اور بات بتاؤ۔ کیا کسی شعر کے معانی کو کھولتے ہوئے تمھیں شعر کی طرف سے مزاحمت کا تجربہ ہوا ہے؟ کیا شعر اپنے غنا ولمس وحرارت سے لے کر اپنے معنی و مدعا کو پرفشاں کرنے کے لیے بے تاب محسوس نہیں ہوتا؟ کون سا فن پارہ ہے جو اپنی حدوں کو ذہنوں، دلوں، دنیاؤں اور زمانوں میں پھیلانے کی تمنا نہیں رکھتا؟ نیز کیا وجہ ہے کہ بڑے تخلیق کاروں پر گفتگوؤں اور کتابوں کا سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لیتا؟ یہ گفتگوئیں اور کتابیں، کیا فہم و دلائل سے تہی ہوتی ہیں؟ تخیل اور تعقل کے لیے یہ تمثیل سرے سے غلط ہے کہ وہ ان دو تلواروں کی مانند ہیں، جو ایک نیام میں نہیں سما سکتیں۔ ذرا سوچو، آج میر، غالب، اقبال اور ان کے بعد منٹو، راشد، مجید امجد، میراجی، فیض، انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، منیر نیازی، ظفر اقبال، خالدہ حسین، نیر مسعود، افتخار عارف، اسد محمد خاں پر تنقیدی گفتگو بند ہو جائے تو کیا ہو؟ کسی فنکار کی موت، دراصل اس کے فن سے متعلق دنیا کا خاموش ہو جانا ہے۔ صاف لفظوں میں جب تک فن پاروں کے اسرار کو نئے نئے انداز سے کھولے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے، وہ فن پارے زندہ رہتے ہیں۔ انھیں اگر انسانی رسائی سے باہر قرار دے کر ان کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی جائے تو سمجھیے، آپ نے ان کا مزار بنا دیا۔ ادیبوں کے مزار اچھے لگتے ہوں گے، ادب کے نہیں۔

ناصر عباس نیرّ

30 ستمبر 2021ء

☆☆☆

7

نئے نقاد کے نام ساتواں خط

برادرعزیز!

’’کچھ فن پارے واقعی گہرے ہوتے ہیں۔ان کی تھاہ میری،آپ یا کسی اور کی رسائی سے دور ہوسکتی ہے"۔تم نے گزشتہ خط کے اس جملے کی وضاحت کے لیے کہا ہے۔ یہ وضاحت میں ایک بار پھر کردوں کہ نقاد اور تنقید کی دسترس ایک ہی چیز نہیں ہیں۔اگر غالب، دستوفسکی ،جیمس جوائس،کافکا، بورخیس،قرۃ العین حیدر،اکتاویو پاز، نیر مسعود یا کسی دوسرے عظیم تخلیق کار کے فن پاروں کا کوئی پہلو میرے تجزیاتی بیان میں نہیں آسکتا تو اس کی بنیاد پر میں یہ رائے دینے میں حق بجانب نہیں کہ تنقید،فن پارے کے اسرار تک رسائی سے قاصر ہے۔ بہ طور شخص میری حد کا،تنقید کی صنف کی حدود کے مساوی ہونا لازم نہیں۔ مجھے اپنی نارسائی کو،تنقید کی نارسائی پر محمول کرنے کا کوئی حق نہیں۔اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ کسی فن پارے کا کوئی حصہ جو میری گرفت سے باہر رہا ہے،کسی اور کی دسترس میں فی الفور آجائے۔انسانوں نے جو فنون تخلیق کیے ہیں،وہ انسانوں کے ذوق وفہم سے کب تک باہر رہ سکتے ہیں؟

تو بھائی قصہ یہ ہے کہ صرف فن پارے نہیں، دنیا میں ہزاروں چیزیں ہیں، جن کی اصل تک رسائی مجھے محال لگی ہے۔کچھ چیزوں کی اصل کو میں اس لیے بھی نہیں جان سکا کہ میں نے ان کے مقابلے میں اپنے فہم کو محدود پایا ہے۔کبھی اس لیے نہیں سمجھ سکا کہ مجھ پر بے دماغی کا غلبہ رہا ہے۔کبھی ہر شے کے سلسلے میں ایک وحشت مجھ پر

طاری رہی ہے؛ سب چیزوں سے، یہاں تک کہ جن کے لیے لوگ اپنی جانوں کی پروا تک نہیں کرتے، ان سے کنارہ گیر ہونے کی بے قابو خواہش مجھ پر غالب رہی ہے۔ اور کبھی میرا جی چاہا ہے کہ بس خاموشی سے اس سارے تماشے کو دیکھا جائے۔ دیکھا شوق اور توجہ سے جائے مگر اپنے خیال کو اس تماشے کی اصل میں مداخلت سے باز رکھا جائے۔ مجھے کئی بار لگا ہے کہ یہ دنیا جس طور بنی ہے، اسے اس طور قائم رکھنے کے لیے لازم ہے کہ اس میں انسانی خیال و منشا کی مداخلت کم سے کم ہو۔ کائنات کے فطری نظم میں جو برہمی نظر آتی ہے، اس کا سبب انسانی خیال کی مداخلت ہی ہے۔

میں جب بھی کس فن پارے کو---فن پاروں کے نام پر کاٹھ کباڑ کو نہیں--- دیکھتا، پڑھتا ہوں، وہ مجھے ایک عظیم قول محال لگتا ہے۔اور اس نے کئی بار مجھے اپنی بساط کے محدود ہونے کا احساس دلایا ہے۔ کچھ چیزیں جب ہمیں اپنی بساط کے محدود ہونے کا احساس دلاتی ہیں تو ہم پر کمتری کا احساس بھی طاری کرتی ہیں،فن کا قول محال ایسا نہیں کرتا۔فن کے روبرو آنا گویا اپنے ہی فراموش کردہ ،تاریک ،وحشی حصوں کے روبرو آنا ہے۔کوئی اپنے ہی روبرو آکر کمتری کے احساس سے دوچار ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا کبھی ہوتا ہے تو اس کا سبب، وہ تحریر ہوتی ہے جسے فن کے طور پر پیش کیا گیا ہوتا ہے۔ مجھے فن ایک ایسی سطر محسوس ہوتا ہے، جس میں وقت، معنی، کیفیات کی ایک نہیں کئی لہریں ہیں۔فن میں ایک پل جو دکھائی دیتا ہے، وہ اگلے پل اوجھل ہوجاتا ہے۔ایک لمحے کا معنی، دوسرے لمحے میں کسی اور صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔فن میں ایک لہر قرمزی رنگ کی ہے تو دوسری کیسری ہے۔کوئی نارنجی ہے تو کوئی زعفرانی۔کبھی ایک ہی رنگ سے کتنے ہی رنگ اور رنگوں کے کتنے سائے ہیں اور کبھی ایک سیاہ اور دوسرا سفید ہے اور کبھی ان کے رنگوں سے بننے والا کوئی نیا رنگ۔اور حیرت یہ ہے کہ جب تم انھیں غور سے دیکھو تو کبھی ایک دوسرے کی نفی کرتے اور کبھی ایک

دوسرے کی تکمیل کرتے نظر آتے ہیں۔اور یہی کچھ قول محال یا پیراڈاکس میں ہوتا ہے۔

ہم جس دنیا میں رہتے ہیں، وہ سیاہ وسفید کی دنیا ہے۔ایک چیز صریحاً غلط ہے اور دوسری بالکل درست ہے ،مگر فن میں سیاہ وسفید کے معنی ومقام بدل جاتے ہیں۔فن میں جبریل وابلیس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں اور یہ معنی فن خود ہی طے کرتا ہے۔ عالمِ حیرت میں ، دیکھی بھالی چیزیں، اجنبی انوکھی دکھائی دیتی ہیں۔فن ہماری فہم عامہ کو چاروں شانے چت کرتا ہے۔ ایسے میں فن رنگوں کی راس لیلا ہے۔رنگوں کا،لہروں کا،تمثالوں کا انوکھا تماشا ہے۔ایک جشن ہے یا باختن کے لفظوں میں ایک کارنیوال ہے۔تم جانتے ہو،جشن میں کیا ہوتا ہے؟تم کسی عام سے جشن کا تصور کرو۔تم نے وہاں رقص،شاعری،موسیقی،کھیل،رنگوں کا نظارہ کیا ہوگا۔ہر جشن میں تمھیں جانے پہچانے لوگ ،وہ کچھ کہتے ،کرتے ، سنتے ،دیکھتے نظر آئیں گے جن کا تم عام زندگی میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ہر جشن میں اس سب کی شکست کی جاتی اور اسی میں باہمی رضامندی سے خوشی کشید کی جاتی ہے، جسے ہم عام حالات میں بہت عزیز رکھتے ہیں۔جس منطق کے تحت ہم سوتے جاگتے ،دوسروں سے لڑتے،خوش ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں یا ایک دوسرے کی خاطر جان تک دیتے ہیں،اپنے اور دوسرں کے کاموں کا محاکمہ کرتے ہیں،فن اور جشن میں اس منطق اور اس کی آل اولاد کی شکست کی جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ فن اور جشن میں وہ سب کچھ روا ہو جاتا ہے جو عام حالات میں ناروا ہوتا ہے۔فن اور جشن اپنا جواز،اپنے معانی،اپنی اخلاقیات،اپنے ہونے کے دوران ہی میں اخذ کرتے ہیں۔تم دیکھو کہ دنیا پر جو چیزیں حکمرانی کرتی ہیں:فہم عامہ،افادیت پسند منطق،طاقت وروں کی وضع کردہ اخلاقیات،سیاست---فن اور جشن انھی کو روندد یتے ہیں۔اسی لیے یاد رکھو کہ فن ،دنیا اور اس کے عام فہم اصولوں یا سامنے کی روزمرہ حقیقتوں کی نقل نہیں ہے۔فن میں

،فن کی راس لیلا کو تلاش کرو، اور دیکھو کہ اس کی مدد سے فن کیا کیا معجزے برپا کرتا ہے۔اسے فن کا قول محال سمجھو۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فن ہماری اس دنیا کو مخاطب نہیں کرتا؛ فن کا مخاطب یہی ہماری، عارضی، مصائب سے بھری، ہم فنا پذیر انسانوں کی دنیا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ فن ہمیں باور کراتا ہے کہ ہماری دنیا صرف وہی نہیں جس تک رسائی کی اجازت، چند طاقتوروں نے دے رکھی ہے۔ یہ طاقت ور چاہتے ہیں کہ لکھنے والے اسی دنیا کو پیش کریں، کسی بھی انداز میں۔موافقت یا مزاحمت، اس سے انھیں فرق نہیں پڑتا۔ جب تم دوسروں کی پیدا کی ہوئی صورتِ حال کے خلاف مزاحمت کرتے ہو تو دراصل اس صورتِ حال کے پیدا کرنے والے کی طاقت کو تسلیم بھی کر رہے ہوتے ہو۔مزاحمت ضرور کرو، مگر اس سے آگے بھی بڑھو۔نئی، اپنی صورت حال پیدا کرو؛ یہ فن کا سب سے بڑا سبق ہے۔ دنیا میں ہمارا ہونا اپنی اصل میں ایک انتہائی پیچیدہ حالت ہے۔ایک آتش فشاں ہے، جس پر ہم ایک جنت تعمیر کرنے کی سعی میں ہیں۔فن اسی پیچیدہ ترین، اسی تضادات سے لبریز انسانی حالت کو اپنی راس لیلا میں پیش کرتا ہے۔دنیا کو سیاست دانوں اور مبلغوں کی نظر سے مت دیکھو۔ان کی نظر آدمی کے شکم اور زیرِ ناف دنیا سے آگے نہیں جاتی۔ان کی کھوپڑی میں یہ بات کبھی نہیں آسکتی کہ دنیا میں آدمی کا ہونا کوئی عام سی بات نہیں ہے۔دنیا میں ایک مکھی کا ہونا -- بلکہ ایک نظر نہ آنے والے وائرس کا ہونا بھی معمولی واقعہ نہیں۔کمزور، ڈھل جانے والے، فنا ہو نے جانے جسم کے ساتھ خواہشات کا انبار اور پھر کائنات اور انسانی ہستی کے عظیم ترین سوالات کے لیے مسلسل فکر مند رہنے والا دماغ۔یہ کوئی معمولی تضاد نہیں ہے۔

فن کے سوا، سب چیزیں ہمیں اس دنیا (کائنات نہیں، کائنات اپنی اصلی حالت میں عظیم الشان ہے) کو اسی شکل میں قابل قبول بنانے کا کام کرتی ہیں جس کا

نقشہ چند طاقت وروں نے کھینچا ہے۔اسی لیے وہ بغیر سوال کے قبولیت ، تقلید، خاکساری ،متابعت ،فرماں برداری ،انکسار جیسے جذبات کو اعلیٰ ترین انسانی جذبات بنا کر پیش کرتی ہیں اور ہمیں اس "روحانی سعی" میں دھکیلتی ہیں کہ ہم اپنے اعلیٰ ترین انسانی اوصاف کو ان طاقتوروں کی نذر کردیں۔وہ طاقت ور اس کی خبر تک نہیں رکھتے کہ ہم سب کے اندر ایک فطری وحشت ہے، جو کئی بار ہمیں اس پورے جہان سے برگشتہ کردیتی ہے۔ایسے میں اس ناقابل تصور کائنات کو ٹھکرا کر ایک ایک اپنا جہان بنانے کی اپنے طور پر تگ ودو کرتے ہیں اور تم اگر لوگوں کے دلوں میں جھانک سکو تو دیکھو گے کہ یہ تگ ودو ہر ایک کے اندر ہے؛اس تگ ودو کو ہمارے زمانے میں فکشن خاص طور پر پیش کررہا ہے۔آدمی کا اپنا بنایا ہوا جہان چھوٹا ،معمولی ، ناقص ہوسکتا ہے ،مگراس کی اہمیت اس میں ہے کہ اس کی تخلیق میں آدمی اپنی ہستی کے بہترین وسائل صرف کرتا ہے اور اگر اس کی قیمت بھی اسے ادا کرنی پڑے تو اس کے لیے تیار رہتا ہے۔سیاسی ،تعلیمی ،تادیبی مقتدرہ اس وحشت کو رام کرنے کی سعی کرتی ہیں اور اگر کوئی مزاحمت کرے تو اسے سزا دیتی ہیں ، ہر طرح کی سزا۔ یہ فن ہی ہے جو ہماری اس وحشت کو مخاطب کرتا ہے اور اس وحشت کی ایک عجب شبیہ (semblance) تخلیق کرتا ہے۔یہی قول محال ہے اور اس کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔اکثر نقاد یہیں لڑکھڑا جاتے ہیں اور وہ دنیا کی سیدھی سادی، غیر مبہم تصویر پیش کرنے والی تحریروں میں پناہ لیتے ہیں۔

ناصرعباس نیّر

12اکتوبر2021ء

(بشکریہ: ہم سب)

غزلیات

☆......ساگرسرفرازؔ

موجِ سراب، خواب، تماشا خیال رکھ
ظالم، فریب کار ہے دنیا خیال رکھ
ترتیب، تال میل سے بنتی ہے شاعری
لفظوں کے انتخاب کا تھوڑا خیال رکھ
اس کے فسوں سے کوئی بھی بچنے نہ پائے گا
بدلا ہے پھر سے وقت نے چہرہ خیال رکھ
تجھ کو نہ راس آئے گا یہ دھوپ کا نگر
دشمن بنے گا اپنا ہی سایا خیال رکھ
آنکھوں میں آگیا ہے جو دریا لئے ہوئے
دامن میں بھر کے لائے گا صحرا خیال رکھ
اس کی تو خاص بات یہی ہے کہ آخرش
ساگرؔ وہ شخص دیتا ہے دھوکا خیال رکھ

☆☆☆

خاک نشیں، اے میرے لوگو، آنکھیں کھولو
وقت کی قدر و قیمت سمجھو، آنکھیں کھولو
چھینٹوں سے دامن آلودہ ہو جائے گا
کیچڑ میں پتھر مت مارو، آنکھیں کھولو
لوگوں نے کیسا برتاؤ کیا ہے تم سے
رہنے دو یہ باتیں چھوڑو، آنکھیں کھولو
چاند نکل آئے گا رات کی تنہائی میں
سورج ڈوب رہا ہے دیکھو، آنکھیں کھولو
ہائے! مجھے یہ خاموشی پاگل کردے گی
میری خاطر کچھ تو بولو! آنکھیں کھولو
بند کرو ان اندھے لوگوں کو سمجھانا
ساگرؔ میری بات کو سمجھو، آنکھیں کھولو

☆☆☆

☆......ساگر سرفراز

وہ ایک شخص جو تھا میری ہر خوشی کا سبب
وہی بنا ہے بالآخر مری غمی کا سبب
بس ایک بات کا افسوس ہے مجھے اب تک
میں جان پایا نہیں تیری بے رخی کا سبب
چمک رہے ہیں ستارے دمک رہا ہے قمر
کوئی بتائے تو پھر کیا ہے تیرگی کا سبب
تمہارے شہر میں محشر بپا نہیں ہوگا؟
اگر بتاؤں گا میں اپنی خامشی کا سبب
کسی کی آنکھوں کا نشہ ہوا اثر انداز
کوئی شراب نہیں میری بے خودی کا سبب
میں حق پرستوں کی صف میں کھڑا ہوں ساگر جی
یہی ہے مجھ سے زمانے کی دشمنی کا سبب

☆☆☆

نہ دیوداس نہ مجنوں نہ کوئی رانجھا ہے
مری کہانی کا عنوان 'جون ایلیا' ہے
جسے یہ لوگ محبت کا نام دیتے ہیں
یہی وہ جن ہے جو بوتل میں بند رہتا ہے
جبھی تو آتا ہے ڈسنے کو شام ڈھلتے ہی
ترا خیال بھی زہریلے سانپ جیسا ہے
تمام عمر یہی ایک خواب دیکھا تھا
اسے بھی آپ نے تعبیر کر کے چھوڑا ہے
تمہیں نے ضبط سکھایا تھا یار ساگر کو
تمہیں نے ہاتھ چھڑا کر اسے رلایا ہے

☆☆☆

دھرو سر زیرِ پائے شوق
پکارو شوق، ہائے شوق
بنے وحشت کا تو مسکن
لگے تجھ کو دعائے شوق
بھٹکتا پھر بیاباں میں
یہی ہے التجائے شوق
دلیلِ حسنِ تاباں ہے
جبینِ خندہ ہائے شوق
شبِ ہجراں کا نظّارہ
ہوا ہے مبتلائے شوق
نگاہ و دید کی ٹھنڈک
غلافِ مدّعائے شوق
چھپا اک غار کے اندر
کوئی مشکل کشائے شوق

☆☆☆

☆......راشف عزمؔی

نیل گگن کے چاند ستارے تیرے نام
رنگ بھرے سرسبز نظارے تیرے نام
سرخی شفق کی، رنگ دھنک کا، بادِ صبا
بارش کی چھم چھم کے اشارے تیرے نام
موسمِ گل، کلیوں کا تبسّم، کوئل کی کُو
پھول، مہک، شبنم کے یہ دھارے تیرے نام
نقشِ جنوں، یادوں کے دِیئے ان آنکھوں میں
وقت کے سب بے زار سہارے تیرے نام
آتی رتوں کی خیر ترے حصے آئے
جاتی رتوں کے خواب کنوارے تیرے نام
شاعرِ راشفؔ، نطقِ قلم، حکمت، معنی
کتب و سخن، سب شعر ہمارے تیرے نام

☆☆☆

☆......راشف عزمیؔ

سُکوتِ جنوں میرے پہلو نشیں ہے
چَراغوں کا کوئی دَمِ آخریں ہے
میں اس خانہء شوق کا اک مکیں ہوں
جہاں آسماں ہے نہ کوئی زمیں ہے
کبھی یہ گماں ہے ہر اک شے میں تو ہے
کبھی وہم ایسا کہ تو ہے، نہیں ہے
کہیں خاک اڑتی ہے صحرائے جاں میں
کہیں کاروانِ بدن تہہ نشیں ہے
کہیں رات اپنی قبا کھولتی ہے
کہیں سایہء شام بھی سُرمگیں ہے
شبستاں سے بچہ پری لے اڑی ہے
کہ سارا قبیلہ ہی اندوہ بیں ہے
کہیں در بہ در ہے ہوا آج رقصاں
کہیں دشت راشفؔ کہ گھستا جبیں ہے

☆☆☆

سب ہیں آئینہ ساز پیشے سے
اک عقیدت ہے اس قبیلے سے
ایک خط اس کی جیب سے نکلا
لاش لٹکی ہوئی تھی پنکھے سے
گِرد اس کے طواف کرنے لگا
نکلا باہر جو پنچھی پنجرے سے
پانی مشکیزے میں بھرا اس نے
اترا اک شہسوار گھوڑے سے
ہم پتہ تجھ ملنگ کا راشفؔ
پوچھ بیٹھے گلی میں بچے سے

☆☆☆

☆......سید مرتضیٰ بسملؔ

بے زباں کی زباں سمجھتا ہے
میرا محبوب تو انوکھا ہے
اُس نظر کی تلاش ہے مجھ کو
جس نظر نے مجھے سنوارا ہے
زندگی رائگاں نہ کر دے گی
زندگی پر مجھے بھروسہ ہے
عمر بھر جس طرح میں تڑپا ہوں
کیا کوئی اور ایسے تڑپا ہے
ہجر کا وقت جب سے آن پڑا
ایک پل، ایک سال لگتا ہے
حادثہ پھر سے ہو گیا ہے کوئی
شہر میں پھر سے گھپ اندھیرا ہے
شام کے بعد روز جانے کیوں
مجھ سے میرا ضمیر لڑتا ہے
مرتضیٰ کہہ رہا تھا بسملؔ سے
تجھ کو اک دن ضرور مرنا ہے

☆☆☆

یہ بغل میں جو شخص بیٹھا ہے
یہ بھی میری طرح اکیلا ہے
کوئی تو اب بتا دو بہرِ خدا
"یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے"
ہجر کا غم منا رہا ہے کوئی
اور کوئی کچھ دنوں سے بھوکا ہے
تجھ کو میرے سوا اے تنہائی
کس نے جلوت میں عریاں دیکھا ہے
یہ جو خوشبو لگائی ہے میں نے
اُس کی پیشانی کا پسینہ ہے
دل کی الماری ہے کھلی اب تک
کون ہے! جس کے پاس تالا ہے
یعنی تیرا عزیز ہے بسملؔ
نام اس کا تو نے پکارا ہے

☆☆☆

☆......سید مرتضیٰ بسملؔ

بے رخی دیر تک نہیں رہتی
برہمی دیر تک نہیں رہتی
وصل کے بعد ہجر آتا ہے
دل کشی دیر تک نہیں رہتی
یار سورج غروب پھر ہوگا
روشنی دیر تک نہیں رہتی
عاشقی دیر تک تو رہتی ہے
زندگی دیر تک نہیں رہتی
بات یہ ہے کہ دل کے دریا میں
جل پری دیر تک نہیں رہتی
زخمِ دل رہتا ہے ہمیشہ ہرا
بے حسی دیر تک نہیں رہتی
دوستو! قطب شہ کے کمرے میں
مشتری دیر تک نہیں رہتی
تخت پل میں اُلٹتے ہیں بسملؔ
خسروی دیر تک نہیں رہتی

☆☆☆

چشمِ پُر نم سے پیتا ہے پانی
بول اے شخص کیسا ہے پانی
روز تیرے گناہوں کو بسملؔ
کس متانت سے دھوتا ہے پانی
میں کسی طور پی نہیں سکتا
مجھ کو تو زہر لگتا ہے پانی
یاد آتا ہے اس گھڑی وہ بہت
جب فلک سے برستا ہے پانی
کیوں نہ طوفان برپا ہو جائے
چشمِ جاناں سے بہتا ہے پانی
میں تو کرتا ہوں مے کی فرمائش
مجھ کو ساقی پلاتا ہے پانی
جب سے رودادِ کربلا پڑھ لی
زہر آلود لگتا ہے پانی
چشمۂ خضر سے دلِ بسملؔ
اور کس کو پلایا ہے پانی

☆☆☆

☆......عقیل فاروق

سب کی پردہ داری سے ڈر لگتا ہے
یارو رسمِ یاری سے ڈر لگتا ہے

کتنا مشکل ہے اب کچھ بھی سہہ لینا
کتنا اب دشواری سے ڈر لگتا ہے

جس نے سب رشتوں کو جانچا پرکھا ہو
اس کو رشتہ داری سے ڈر لگتا ہے

مجھ کو تو اب یوں ہی سوتے رہنے دو
مجھ کو اب بیداری سے ڈر لگتا ہے

اپنے اندر سونا سونا پھرتا ہوں
اپنی ہی غم خواری سے ڈر لگتا ہے

پہلے بھی دل ٹوٹا ہے میرا لیکن
اب کے دل آزاری سے ڈر لگتا ہے

☆☆☆

رونقیں سب چُرا گیا منظر
دل کی دنیا کو ڈھا گیا منظر

اِس چمن کے حسین پھولوں کو
اپنے اندر سما گیا منظر

میری آنکھوں سے ماورا ہو کے
پھر زمانے پہ چھا گیا منظر

کیسے کیسے نظر کے اندھے ہیں
کیسے کیسوں کو کھا گیا منظر

زخم کتنے ہی ہم نے کھائے ہیں
زخم کتنے چھپا گیا منظر

☆☆☆

☆......عقیل فاروق

تمہارے بعد کیا ہوا، میں جی گیا، مرا نہیں
تمہارے بعد تو مگر کسی سے دل لگا نہیں

تمہارے بعد عشق پہ مرا یقیں رہا نہیں
تمہارے بعد باوفا مجھے کوئی ملا نہیں

تمہارے بعد زندگی نے رنگ ہی بدل دیا
تمہارے بعد مہرباں کوئی مرا رہا نہیں

تمہارے بعد خود سے ہی لپٹ کے میں نے رو دیا
تمہارے بعد حوصلہ کسی نے بھی دیا نہیں

تمہارے بعد دن ڈھلا نہ رات رونما ہوئی
تمہارے بعد وقت بھی میرے لئے رکا نہیں

تمہارے بعد آشیاں کے سب چراغ بجھ گئے
تمہارے بعد پھر کوئی دِیا کبھی جلا نہیں

تمہارے بعد یہ چمن تو ویسا ہی ہے ہاں مگر
تمہارے بعد پھول پھر یہاں کوئی کھلا نہیں

تمہارے بعد موسیقی بے سری سی ہوگئی
تمہارے بعد میں نے کوئی گیت بھی سنا نہیں

تمہارے بعد بے اثر طبیب سارے ہوگئے
تمہارے بعد با اثر دعا نہیں، دوا نہیں

تمہارے بعد وہ عقیلؔ چھوڑ کر گیا مجھے
تمہارے بعد کون ہوں میں یہ بھی اب پتا نہیں

☆☆☆

☆......شبینہ آرا

اجنبی سے اداس چہرے تھے
جو مِرے آس پاس بیٹھے تھے
رات، کشکول بھر گئی ان کے
دھوپ میں شام تک جو ٹھہرے تھے
ہجر کی پوٹلی میں بھر بھر کے
یاد تھی اور اُن کے وعدے تھے
میں جہاں سے فرار ہو جاتی
مجھ پہ رنج و الم کے پہرے تھے
پھول ہر رُت سے مانگتی کیسے
میرے موسم تو گونگے بہرے تھے
کچھ مداوا نہ ہو سکا ہم سے
روح کے زخم اتنے گہرے تھے

☆☆☆

شام سورج سے دست وگریباں ہوئی
رات پلکوں پہ فوراً نمایاں ہوئی
بس تیرے ہجر سے فائدہ یہ ہوا
زندگی نا سہی، موت آساں ہوئی
موجِ غم، بادباں کا جنازہ لیے
ڈوبتے ساحلوں کی نگہباں ہوئی
اتنے آسیب آنکھوں میں بسنے لگے
آئینہ دیکھ کر میں ہراساں ہوئی
دھوپ کے قافلے، پھول جھلسا گئے
اور صبا آج بھی چاک داماں ہوئی

☆☆☆

☆......شبینہ آرا

بے خیالی میں نہ جانے کیا سے کیا لکھتی رہی
ایک پتھر کو محبت کا خدا لکھتی رہی

کارواں لٹنے پہ اب خود سے بہت بیزار ہوں
جانے کیوں میں رہزنوں کو رہنما لکھتی رہی

مجھ کو بے شک آپ ہی کا نام لکھنا تھا مگر
بے ارادہ میں قلم سے بے وفا لکھتی رہی

وہ سر بازار سودائے وفا کرتا رہا
نام جس کا میں ہمیشہ باوفا لکھتی رہی

بے بسی کی شام کو جب مختصر لکھنا پڑا
درد کے صحرا میں شامِ کربلا لکھتی رہی

سنگ سے بھی سخت نکلا آخرش وہ دل بہت
عمر بھر جس کو شبینہ آئنہ لکھتی رہی

☆☆☆

یقیں کی ریت پہ خالی سراب بُنتی ہوں
چھلکتی آنکھ میں اَن دیکھے خواب بُنتی ہوں

میرے وجود کی ظلمت پہ بولنے والے
میں دیدہء تر سے کئی آفتاب بُنتی ہوں

جھلس نہ دے کہیں چاہت کی دھوپ ہی مجھ کو
تمہاری یاد سے اکثر سحاب بُنتی ہوں

تو میرے پاس مہکتا ہے خوشبوؤں کی طرح
ترے رومال پر جب جب گلاب بُنتی ہوں

ہوں رسن و دار کے قابل ہے اعتراف مجھے
کہ رتجگوں میں کہیں اب بھی خواب بُنتی ہوں

☆☆☆

☆......حاشر افنان

📖

وقت میرے لئے نکال میاں
کچھ تو میرا بھی کر خیال میاں
جسم سے روح تب نکلتی ہے
کاٹ دیتا ہے جب تو کال میاں
بن مرے ایک پل نہ کٹتا تھا
آج بچھڑے ہوا ہے سال میاں
اتنے خاموش کس لیے ہوئے ہو
تم بھی کرتے کوئی سوال میاں
یاد اکثر تری ستاتی ہے
اس اذیت کا حل نکال میاں
حاشر افنان ڈھونڈیئے تو سہی
مل ہی جاتا ہے ہم خیال میاں

☆☆☆

📖

سرِ گفتار خصلت بولتی ہے
جبھی میری شرافت بولتی ہے
اداسی، غم، اذیت ہے یہ دنیا
تو اس کو خوبصورت بولتی ہے
تبھی ہے لطف اس کی شاعری میں
فصاحت اور بلاغت بولتی ہے
وہ جب جب جھوٹ کہہ دیتی ہے یارو
وہ تب تب خوبصورت بولتی ہے
کسی کا دوغلہ پن بولتا ہے
کسی کی شان و شوکت بولتی ہے
کروں افنان اس پر جان قرباں
سخن میں جو لطافت بولتی ہے

☆☆☆

☆......حاشر افنان

تو ہی قسمت ہے مری اور مقدر تُو ہے
میرے زخموں کا مری جان رفو گر تُو ہے
میں تو احساس پروتا ہوں فقط بحروں میں
میری غزلوں، مری نظموں کا سخن ور تُو ہے
تجھ کو کس چیز کی ہے فکر مری جاں لاحق
تیرا ہم راز ہوں میں اور مرا ہم سر تُو ہے
کتنا کم بخت ہوں میں قدر نہیں کی تیری
کتنا خوش بخت ہے وہ جس کو میسر تُو ہے
مجھ کو ہر وقت ستاتی ہے تری یاد افنانؔ
تجھ کو واپس میں بلاتا ہوں کہاں پر تُو ہے

☆☆☆

آزمائے ہوئے چراغ ہیں ہم
ٹمٹماتے ہوئے چراغ ہیں ہم
آندھیوں کا بھی خوف دل میں ہے
گھر سے نکلے ہوئے چراغ ہیں ہم
راکھ ہوں گے جو پاس آئیں گے
دیکھ! جلتے ہوئے چراغ ہیں ہم
ہر کوئی آ کے روندتا ہے ہمیں
کیونکہ بکھرے ہوئے چراغ ہیں ہم
ناز خود پر نہ کیوں کریں افنانؔ
جانے مانے ہوئے چراغ ہیں ہم

☆☆☆

☆......ہجرؔ مومن

📖

تو آسماں، میں ہوں زمیں، من دیگرم تو دیگری
تیرا مرا رشتہ نہیں، من دیگرم تو دیگری
تو زندہ و پائندہ ہے، میں خاک کا ہوں مستحق
تو لامکاں کا ہے مکیں، من دیگرم تو دیگری
اے میری شاخِ یاسمیں تجھ کو نہیں مجھ پر یقیں
مجھ کو ہے بس تجھ پر یقیں، من دیگرم تو دیگری
دِکھتی ہے مجھ کو ہر طرف اللہ کی کاریگری
اوّل نمونہ ہے ہمیں، من دیگرم تو دیگری
تو سامنے کچھ اور ہے کچھ اور ہے تو بعد ازاں
کہنا مجھے ہے آخریں، من دیگرم تو دیگری
ہم ہوگئے محلول اب اک دوسرے میں جانِ جاں
''تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری''
ہیں راس مجھ کو تلخیاں، تجھ کو ہیں بھاتی نرمیاں
میں اور تو یکساں نہیں، من دیگرم تو دیگری

☆☆☆

📖

کام پہلی ہی ملاقات میں کر جاتا ہوں
آنکھ میں آتے ہی میں دل میں اُتر جاتا ہوں

پہلے لکھتا ہوں کوئی شعر بہت مشکل سے
اور پھر اُس کو سناتے ہوئے مر جاتا ہوں

یوں تو طوفان بھی گھبراتے ہیں مجھ سے لیکن
آپ جب شور مچاتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں

ایسے چھپ چھپ کے لگا تار ترے کوچے میں
میرا جانا تو نہیں بنتا، مگر جاتا ہوں

☆☆☆

☆......ہجرؔ مومن

📖

زندہ ہیں مگر زندگی آسان نہیں ہے
ہم کو کوئی خواہش، کوئی ارمان نہیں ہے

اندر کے سب احوال کا اللہ ہے حافظ
باہر سے کوئی چاک گریبان نہیں ہے

اک ہم کہ جو لکھتے ہیں ترے نام پہ غزلیں
اک تو کہ جسے شعر کی پہچان نہیں ہے

جنت کی کوئی حور ہے یا نورِ خدا ہے
وہ حسن مگر پیکرِ انسان نہیں ہے

ممکن ہے کہ آگے ہو اُسے مجھ سے محبت
فی الحال تو ایسا کوئی امکان نہیں ہے

☆☆☆

📖

بس پیکرِ جاناں پہ نظر کھینچ رہا ہوں
میں سانس سہولت سے اگر کھینچ رہا ہوں

میں اپنے مقدر کو ترے ہاتھ پہ رکھ کر
منزل سے لگاتار سفر کھینچ رہا ہوں

جو تیری محبت کا غمِ ہجر ہے اس کو
خوشیوں سے گھٹاؤں تو صفر کھینچ رہا ہوں

اک سمت سے تجھ کو وہ اُدھر کھینچ رہا ہے
اک سمت سے تجھ کو میں اِدھر کھینچ رہا ہوں

☆☆☆

☆......عمر عاؔلم

غموں کی یہ عجب برسات کیا ہے
مرے جاناں تری سوغات کیا ہے
میں اکثر بیٹھ کر یہ سوچتا ہوں
میں خود سے کیوں خفا ہوں، بات کیا ہے
چلے جانا ہے دنیا سے سبھی کو
مگر یہ سوچتا ہوں ساتھ کیا ہے؟
محبت پر یہ فتویٰ دینے والے
یہ پہلے پوچھتے ہیں، ذات کیا ہے
ہلا پایا نہ طوفاں بھی مجھے جب
مرے دشمن تری اوقات کیا ہے

☆☆☆

کسی کو وصل میں الفت کا ساگر مار دیتا ہے
کسی کو ہجر میں یادوں کا لشکر مار دیتا ہے
محبت کر تو لوں گا میں کسی سے بھی مگر یارو
کوئی محبوب ایسا ہے جو یکسر مار دیتا ہے
میں جب بھی بھیجتا ہوں خط پہنچتا ہی نہیں اس تک
نہ جانے کون رستے میں کبوتر مار دیتا ہے
میں اپنے وصل کی یادوں میں جی لیتا مگر جاناں
مجھے ہر پل جدائی کا وہ منظر مار دیتا ہے
زمانے سے تو لڑ لیتے ہیں ہم تا عمر پر عاؔلم
ہمارے جیسوں کو اکثر مقدر مار دیتا ہے

☆☆☆

☆......عمر عاؔلم

بچھڑنا رسمِ الفت ہے، کرشمہ ہو نہیں سکتا
تو میری ہو نہیں سکتی، میں تیرا ہو نہیں سکتا
سنو میں بھی تو انساں ہوں مجھے بھی درد ہوتا ہے
یہ تم سے کون کہتا ہے کہ لڑکا رو نہیں سکتا
یہ محفل ہے محبت کی، ترے شعروں میں نفرت ہے
کہا جو شعر تو نے وہ مکرر ہو نہیں سکتا
وہ سورج اور چراغوں کا سہارا بھی نہیں لیتا
جو راہِ حق پہ چلتا ہے کہیں وہ کھو نہیں سکتا
سخن سے منسلک ہوں میں، مرا مرکز محبت ہے
دلوں میں بیج نفرت کے کبھی میں بو نہیں سکتا

☆☆☆

مرے اس درد کا کوئی سہارا ہو نہیں سکتا
مجھے یہ ہجر سہنا ہے، کنارہ ہو نہیں سکتا
تمہاری عاجزی، منت، یہ آنسو اور پچھتاوا
تمہاری بے وفائی کا کفارہ ہو نہیں سکتا
تمہیں اپنا کہوں پھر سے بھروسہ بھی کروں تم پر
یہ عاشق عشق میں پاگل دوبارہ ہو نہیں سکتا
اسے کہہ دو کسی خط میں نئے کچھ زخم بھیجے وہ
فقط اب یاد سے اس کی گزارہ ہو نہیں سکتا
فقط تو ہی ستم گر تو نہیں عاؔلم کا دنیا میں
فقط تیرے ہی زخموں کا وہ مارا ہو نہیں سکتا

☆☆☆

☆......خالدہ بیتابؔ

دل کو ناشاد کر کے دیکھیں گے
خود کو برباد کر کے دیکھیں گے
لب کشائی کریں بھی کیوں تم سے
رب سے فریاد کر کے دیکھیں گے
کتنا برباد اب کریں خود کو
اب تو آباد کر کے دیکھیں گے
ہم ابھی وقت کی گرفت میں ہیں
خود کو آزاد کر کے دیکھیں گے
دل کے اس گھاؤ کا کوئی مرہم
ہم بھی ایجاد کر کے دیکھیں گے
اس کو بیتابؔ بھولنا بہتر
پھر کبھی یاد کر کے دیکھیں گے

☆☆☆

ترے حصار سے نکلوں تو کوئی بات بنے
میں دل کے غار سے نکلوں تو کوئی بات بنے
عجب سی بھیڑ ہے سُوجھے نہ راستہ کوئی
میں اِس دیار سے نکلوں تو کوئی بات بنے
جو چھولیا ہے مجھے تُو نے خواب میں جاناں
میں اُس خمار سے نکلوں تو کوئی بات بنے
چمن کی آب و ہوا سے مری نہیں بنتی
میں اس بہار سے نکلوں تو کوئی بات بنے
ہے اتنی دھول کہ آنکھیں نہیں کھلیں بیتابؔ
میں اس غبار سے نکلوں تو کوئی بات بنے

☆☆☆

☆......خالدہ بیتاب

کچھ نہ کچھ روز چال کرتا ہے
وہ بُرا دل کا حال کرتا ہے
میری نادانیوں کا وہ ظالم
یوں ہی مجھ سے ملال کرتا ہے
داغِ دل کیوں نظر نہیں آتا
آئینہ بھی کمال کرتا ہے
میرا محبوب، وہ میرا محسن
غم سے مجھ کو نڈھال کرتا ہے
وہ کبھی مانتا نہیں لیکن
چاہتیں بے مثال کرتا ہے
حسن کس کی نذر ہوا بیتابؔ
روز مجھ سے سوال کرتا ہے

☆☆☆

رسمِ الفت نبھائے جاتی ہے
تیرے صدمے اٹھائے جاتی ہے
تجھ سے ملنے کی آرزو جاناں
جانے کیوں دل کو کھائے جاتی ہے
سرخ پھولوں کے شوخ موسم میں
غم کی شدت جلائے جاتی ہے
تیرے ہونے سے ہی میرے محبوب
زندگی مسکرائے جاتی ہے
تیری چاہت کی انتہا ہے جو
مجھ کو سب سے چرائے جاتی ہے
اپنی نیندوں کو وار کر تجھ پر
خواب تیرے سجائے جاتی ہے
اُس کو بیتابؔ کب خبر ہوگی
جان جس پر لٹائے جاتی ہے

☆☆☆

☆......عقیل عباسی

📖

تو چل دیا تو تھا مگر یہ دل کہیں لگا نہیں
یوں درد و غم ملے کہ چین ایک پل ملا نہیں
اسی دیار میں کہیں بھٹک رہا ہے وہ ابھی
میں شوق سے چلا تو تھا مگر کہیں گیا نہیں
عجب ہے وہ کہ ہیں عجب عجب سی اس کی عادتیں
کبھی ملا تو جا بجا، کبھی کہیں ملا نہیں
مرے نصیب میں کہیں یہ صبح ہے نہ شام ہے
فقط ہے رات کا دھواں مگر کوئی دیا نہیں
رہی خموش گفتگو مری یوں رات بھر مگر
مرے قریب تھا کوئی جو روبرو ہوا نہیں

☆☆☆

📖

بہت عجیب ہے یہ شہر، وقت سب بتا گیا
مجھے مری مثال دے کے آئینہ دکھا گیا
ہوئی جو اک نگاہ اس فقیر کی اِدھر کو بھی
بہ یک نظر جمودِ جاں کو حشر سا بنا گیا
کسے وصالِ یار کی پڑی ہے جب کہ ہجر تو
فقط وہ درد ہے کہ جو مجھے یوں راس آ گیا
گھرا ہوا تھا ظلمتوں میں دیر سے عقیلؔ تُو
کوئی خیال آ کے پھر دیئے کئی جلا گیا

☆☆☆

☆......عرفان غازیؔ

زنجیر میرے در کی ہلا چیخ چیخ کر
وحشت سے پوچھ میرا پتہ چیخ چیخ کر

سرگوشیوں سے عدل کہاں ہوگا میرے ساتھ
تُو میری داستان سنا چیخ چیخ کر

اے درداب سکوت کے ظلم وستم نہ سہہ
خاموشیوں کا گھونٹ گلا چیخ چیخ کر

لوگوں کے چیختے ہوئے چھل جاتے ہیں گلے
لیکن مِرا وجود چھلا چیخ چیخ کر

یہ کیا کہ اپنی آہ سے کانپے ترا بدن
دم ہے تو عرش و فرش ہلا چیخ چیخ کر

وہ ضبط کیا رہا کہ رہا اشکبار تُو
وہ صبر کیا کِیا جو کِیا چیخ چیخ کر

یہ میرے کفر کی نہیں، غم کی دلیل ہے
میں آخرش جہاں سے گیا چیخ چیخ کر

☆☆☆

مِرے ہمسفر، سرِ رہگزر، مجھے چھوڑ کر تُو کدھر گیا
ترے نقشِ پا کی تلاش میں مِرا نقش چھالوں سے بھر گیا

نہ کوئی پناہ تھی راہ میں، نہ کہیں پہ چھاؤں کا آسرا
ترے انتظار کی دھوپ میں، مِرا شوخ رنگ اُتر گیا

تمہیں جو شباب پسند تھا، تمہیں جس کا حسن عزیز تھا
میں وہ نوجواں نہیں رہا، مِرا دورِ حسن گزر گیا

یہی عزم تھا کہ سفر میں ساتھ چلیں گے ہم، مگر اے رفیق
یہ سفر کے بیچ میں کیا ہوا، تُو اِدھر گیا، میں اُدھر گیا

غمِ عاشقی لئے چل پڑے تو تھے منزلوں کی طرف مگر
غمِ دو جہان سے ہار کر تُو بھی گھر گیا میں بھی گھر گیا

☆☆☆

نظمیں

☆......ایاز رسول نازکی

اگر میں چاند ہوتا
تو انگلی کے اشارے پر
نہیں بٹتا
ریزہ ریزہ ہو جاتا
قدموں میں گر جاتا
خاکِ کفِ پا سے مل کر
کیا پونم کیا اماوس
ہر دم چمکتا
جاوداں ہوتا
اگر میں چاند ہوتا
اگر میں آسماں ہوتا
تو قدموں سے لپٹتا
ایک نکتے میں سمٹتا
ستارہ بن کے نعلیں پر
جڑا جاتا
جاوداں ہوتا
اگر میں آسماں ہوتا
اگر میں کہکشاں ہوتا
کھجوروں کے درختوں پر
اتر جاتا
ٹہنیوں، پتیوں، خس وخاشاک
میں گھل کر
ایک فرشِ معلےٰ پر
بوریا بن کر بچھا جاتا
جاوداں ہوتا
اگر میں کہکشاں ہوتا
اگر میں بادباں ہوتا
سفینے کو منور ساحلوں تک
لے کے آجاتا
تار تار ہو جاتا

☆......ایاز رسول نازکی

ہواؤں میں بکھرتا
اپنی واپسی کے سارے امکاں
ختم کر دیتا
جاوداں ہوتا
اگر میں بادباں ہوتا

☆☆☆

جو گل رخوں میں شمار ہے تو
ہمارے پہلو کا خار ہے تو
مئے شبانہ کی خلوتوں میں
ہمارے من کا غبار ہے تو
تجھے خبر ہے کہ قاتلوں میں
یہاں وہاں پر شمار ہے تو
کہیں پہ غنچے کی تو چٹک ہے
کہیں پہ صوتِ ہزار ہے تو
تمہارا ڈھلتا شباب یوں ہے
خزاں میں دہکا چنار ہے تو
ہے غیر ممکن وصول ہو جو
بہی میں لکھا اُدھار ہے تو

☆☆☆

☆......حیات عامر حسینی

نعت

وہ سازِ نو بہار
موجِ ہستی
رقصِ دوراں ہے
وہ رازِ شش جہات ولفظ و معنی
نقشِ خوباں ہے
وہ نازِ کہکشاں وسوز و مستی
عزم وایقاں ہے
وہ چشمِ ناز کی صورت
چمکتا ہے ستاروں میں
گلِ تر میں مہکتا ہے
پری رفتار کی صورت
وہ سانسوں میں اترتا ہے
حیاتِ جاوداں بن کر
فضاؤں میں چمکتا ہے
صدائے لازماں بن کر

وہ پیکر خوشبوؤں کا
مثلِ باراں رقص رعنائی
شعور شش جہات ونور ہستی
بزم امکاں ہے،
وہ انساں ہے مگر ہے
شہہ سوار برق لاثانی
وہ رم جھم آگہی کا
رقصِ زم زم
نورِ فرقاں ہے
نزولِ تابش وعرفاں
طلوع رمز یزداں ہے
ازل کا گیت ہے
لیکن
ابد میں مسکراتا ہے

☆☆☆

☆......حیات عامر حسینی

کسوٹی

شمعیں گل ہیں
ہولے ہولے، دھیرے دھیرے
دھڑکن دھڑکن
شیتل، کومل، میٹھے میٹھے بول سہانے
وحی کی صورت اتر رہے ہیں

رات جواں ہے
ہولے ہولے دور گگن پر
تیر رہی خوابوں کی کشتی
جس کو جانا ہے وہ جائے
لمحہ لمحہ جاگ رہا ہے
دھڑکن دھڑکن سوچ رہی ہے
چاند پیاسا ڈوب رہا ہے
ریت کی دھڑکن ڈول رہی ہے
لفظوں کے سینے میں کیا ہے
لفظوں میں کیا آگ بھری ہے

لفظوں کی خوشبو سے حیراں
ساری شمعیں جاگ رہی ہیں
ایک ترازو تول رہی ہے
دھڑکن دھڑکن
ہولے ہولے، دھیرے دھیرے

☆☆☆

☆......رفیق سندیلوی

عجیب ماہتاب ہے

عجیب ماہتاب ہے
جو میرے دل کے عین وسط میں
چمک رہا ہے
جس سے سارا حاشیہ زمین کا
دَمک رہا ہے
یہ وجود
یہ نبود و بود
جس مقامِ اتصال پر کھڑے ہیں
کچھ سجھائی دے نہیں رہا
بس ایک دھند سی ہے
ایک کیف سا ہے
جس میں وضع ہو رہی ہیں صورتیں
میں جانتا ہوں
ابتدا سے
تیرے نرم پاؤں پر
لگا ہوا تھا آلتہ

اَزل سے
کائنات رقص کر رہی تھی
تیرے گھنگھروؤں کی تال پر
میں تیری صوتِ جسم
تیرے جسمِ صوت کا اسیر ہوں
خمیر ہوں
جو خود ہی پیدا ہو گیا
ہویدا ہو گیا
جو اپنی اصل میں
تو رُو بہ رُو ہے
پھر بھی تُو دِکھائی دے نہیں رہا
ذرا ذرا
دِکھائی دے رہا ہے اوٹ سے
بھرا بھرا
سفید لہردار سِلک میں
چمکتی جلد سے مِلا ہوا
کھلا ہوا

☆......رفیق سندیلوی

لباس
تجھ پہ سج رہا ہے
آس پاس
جَل ترنگ بج رہا ہے
ریشمیں پھوار سے
دھلا ہوا ہے آسمان
رات جیسے جنگلوں میں چھپ گئی ہے
اِک لکیر روشنی کی
نقرئی سی دھار
نیچے جا رہی ہے
اُوپر آ رہی ہے
بار بار
دیکھتا ہوں
آر پار
بہہ رہا ہے ندیّوں میں
نیند کا خمار
تیرے میرے درمیان
اِک طرف ہیں
جھولتی ہوئی
سبک، خفیف جالیاں وصال کی
تو دوسری طرف تَنا ہوا
مہین سا، فراق کا نقاب ہے
عجیب ماہتاب ہے!

☆☆☆

☆......رفیق سندیلوی

اُسی آگ میں

اُسی آگ میں
مجھے جھونک دو
وہی آگ جس نے بُلایا تھا
مجھے ایک دن دَمِ شعلگی
دَمِ شعلگی مرا انتظار کیا بہت
کئی خشک لکڑیوں، شاخچوں کے حصار
میں
جہاں برگ و بار کا ڈھیر تھا
دَمِ شعلگی
مجھے ایک پتّے نے یہ کہا تھا گھمنڈ سے
اِدھر آ کے دیکھ
کہ اِس تپیدہ خمار میں
ہمیں ہم ہیں
لکڑیوں شاخچوں کے حصار میں
یہاں اور کون وجود ہے
یہاں صرف ہم ہیں رکے ہوئے

کہیں آدھے اور
کہیں پورے پورے جلے ہوئے
دَمِ شعلگی ہمیں جو مسرتِ رقص تھی
تمھیں کیا خبر
اگر آگ تم کو عزیز تھی
تو یہ جسم کون سی چیز تھی
جسے تم کبھی نہ جلا سکے
وہ جو راز تھا پسِ شعلگی نہیں پا سکے!
سو کہا تھا میں نے یہ ایک اَدھ جلے برگ
سے
مجھ دکھ بہت ہے کہ آگ نے
مرا انتظار کیا بہت
مگر اُن دنوں
کسی اور طرز کی آگ میں
مرا جسم جلنے کی آرزو میں اسیر تھا
مگر اُن دنوں میں نہ جل سکا
میں نہ جون اپنی بدل سکا

مگر اب وہ آگ
کہ جس میں تم نے پناہ لی
جہاں تم جلے
جہاں تم کِھلے
جہاں تم عجیب سی لذّتوں سے گلے ملے
اُسی آگ میں مجھے جھونک دو!

☆☆☆

☆......رفیق سندیلوی

کوئی رت جگا ہے

کوئی رت جگا ہے
جو صدیوں پہ پھیلا ہوا ہے
یہ آنکھیں کہ سکتے سے
پتھر ہوئی ہیں
یہ شانے کہ گہری تھکن سے
جھکے ہیں
یہ پاؤں کہ رکنے سے
جن پر ورم آ گیا ہے!
کوئی رت جگا ہے
کہ جس کا کوئی نقطۂ ختم
کوئی کنارہ نہیں ہے
زمینوں پہ تھوڑی سی بادِ صبا
کوئی رنگوں کا ریزہ
ذرا سی مہک
آسمانوں میں ہلکا سا براق پَر

☆......رفیق سندیلوی

ایک چھوٹی سی کالی گھٹا
کوئی ننّھا سا مدّھم ستارہ نہیں ہے
کسی ذی نَفَس کو
یہاں ایک لحظہ بھی
سونے کا یارا نہیں ہے
بلاتی ہیں ریشم سی بانہیں
حریری نظر کھینچتی ہے
نہ جسموں کے اَطلس ہی آواز دیتے ہیں
صبحیں بہاریں نہ شامیں غنودہ
کسی ایک آغوش پر بھی یہاں
اپنی چَھب آشکارا نہیں ہے!
گھروں میں اَزل سے
گداز اور تہہ دار بستر لگے ہیں
مگر لوگ گلیوں میں نکلے ہوئے ہیں
چھتوں پر کھڑے ہیں
خلا کی طرف دیکھتے ہیں
کہیں اڑ گئی ہے پَری نیند کی
جس کی آنکھوں میں
سرخی کے مَلکوتی ڈورے تھے
جادو تھا جس کا فضا میں
فنا اور بقا میں
ہَوا میں
چھلکتا تھا جس کا پیالہ
سیاہی سفیدی کے مابین
دھندلا سا ہالہ
جسے توڑ کر اپنا جوہر سمیٹے
کہیں خواب رخصت ہوا ہے
کوئی رت جگا ہے
جو صدیوں پہ پھیلا ہوا ہے!

☆☆☆

☆......تیموؔر احمد خان

تنہائی میں

ایک تو آنکھ کی نمکین فضا
اُس پہ سوچوں کی اتھاہ گہرائی
اور پھر دل کا کرب آگ نما
جیسے صدیوں کے لئے کھویا ہو کچھ
جو نہ مل پائے مگر مرتے ہوئے

یہ تو اک شان کا تصور تھا
ٹوٹ گیا تو تجھے توڑ گیا

کیسا ہونے کا بھرم رکھا تھا
کس کی سنت کو لگایا تھا گلے
کس سا ہونے کا خبط تھا سر پر
عشق ہوتا ہے مگر ایسا نہیں
عشق تو وحدتِ عقل و دل ہے
عشق میں تم بھی نہیں، وہ بھی نہیں
تم مگر تم ہو تو وہ، وہ ٹھہرے

اُس کی زینت تو ہے تقدیر اُس کی
اُس کی صورت ہے خدا کی مرضی
اُس کے چہرے کے تبسم کے نثار
تیرا پیمانِ حیات نہیں

☆☆☆

گزشتہ سرد نومبر

میری ڈائری رد
میرے خواب بھی رد
وہ نظرِ جنوں، جذبِ نایاب بھی رد
میں کرتا ہوں اپنے بھرم کی زمیں رد
وہ عزم و یقیں، ان کے عنوان سارے
وہ راتوں کو لکھی عبارات بھی رد

☆☆☆

☆......تیموّر احمد خان

کاغذی آلام لمحے

کاغذی آلام لمحے، دفعتاً کی تیز رو
دھڑکنوں کی شاہراہ پہ مشکلوں کے چند میل
جیسے کانوں میں کبھی بجتی ہے اندر کی صدا
سو رہے تالاب میں مچھلی کا بل کھاتا اچھال
کوہ سے گرتی چٹان
نصف شب کا زلزلہ
زمستاں کی نیم شب میں سرسراہٹ اور صدا
کاغذی آلام لمحے
ہم نے چاہا تھا بہت، پر دام میں آئے نہیں

جب کبھی بھی تھے اکیلے
یاد کا ہم نے تدارک زمزموں سے کر دیا
پر کبھی بھی جلوتوں میں بن نہ پائی راہ کچھ
مستیوں میں دفعتاً کی یاد اُف

جیسے کانوں میں کبھی بجتی ہے اندر کی صدا
ہم نے چاہا ہے بہت پر مضمحل کرتی گئی
یخ بدن سی کاپیوں کے کاغذوں پہ شعر کچھ
نغمگی، سرمستیوں کے شاہدوں میں ایک ہیں
عشق سے پہلے زمانوں کا سماں، آزاد دن
لکھ گیا ہوں خواب، خواہش اور تمنا بے حساب
تتلیوں کی چار آنکھیں
وادیوں کے سب نقوش
حکمراں کی چال اپنی
سلطنت کے سب نقوش
عزم کے آثار ہیں معصوم لفظوں کا لباس
آج کی صبحِ زمستاں
زیرِ لب اک مسکراہٹ قرأتوں کے درمیاں
پڑھ گیا ہوں شعر اپنے
کیا قیامت ہے کہ سارے ذائقے برباد ہیں
کیا ہوا ایسا کہ یہ مبہوت ہو کر رہ گئے
کاغذی آلام لمحہ

☆......تیمور احمد خان

پتھروں کے کوہ سے گرتی چٹان
ہم نے چاہا لاکھ پر کچلا گئی اپنا وجود
زندگانی کے سفر میں آنجہانی رابطے
یاد کی صورت سے گزرے اور محبت ہو گئے
خوبصورت خم، ہلال،
جس طرح بنتا رہے اک رات کو ماہِ تمام
نصف شب کی چاندنی کو عشق سے تعبیر ہے
رات کی بیداریوں میں کرب سے بیتابیاں
اور نیندوں کا تعاقب کر سکے تو کر سکے
آنکھ کے کھلنے پہ صبحِ دم قیامت، طولِ غم
بجلیوں کی لرزشوں سا
سرحدوں پر زلزلہ
کاغذی آلام لمحہ، شام تک کی بے دلی

سو رہے تالاب میں مچھلی کا بل کھاتا اچھال
یا کہوں اک عارضی سے زلزلے کی شام ہے؟
جس پہ گلیوں میں اتر کر
ہر طرف ہیں قہقہے
مستیاں، سرمستیاں

کاغذی آلام لمحے
زندگی کا روگ ہیں
ہم نے چاہا ہے بہت پر دام میں آئے نہیں
کیا خبر دیوانگی ہو یا جنوں میں کاٹ لیں

☆☆☆

آپ سے لے کر ہمیں تک اور سانسوں کو محیط،
کس طرح زنجیرِ باطن کی طوالت توڑ دوں
کاغذی آلام لمحوں کی سزا کو کیا کہوں؟
دھڑکنوں کی شاہراہ پر مشکلوں کے چند میل؟

☆......تیمور احمد خان

آگہی

آگہی بعد از عرصہ کا بھلا
بے سبب ہم کو دیئے جائے سزا
کام کی بات ملے
شادمانی بھی لگے
پر نہیں اِن سا سبھی
آگہی تو نے مجھے مار دیا
پھول سے خوشبو ملے ایسا کہاں
رند سے گائیں پھریں ایسا کہاں
آج کہ صبحِ زمستاں کی قسم
حسن کا نام نہیں
سلسلۂ فن و ہنر،
ذوق کا کام نہیں
اُس کا محبوب خیال
اُس کی سانسوں کی مہک
اُس کی نیندوں کی لگن
اپنے ہر غم پہ یہاں اُس کے پیروں کی قسم
یہ مرا طرز ابھی، جیسے جانے کی روش
آگہی درد فقط، کیا کِیا جائے ابھی

سال کے سال گئے
کچھ بہاروں کا شباب
اُن کی آہوں کا اثر
سب دعاؤں کی تڑپ،
اُن کے پیروں کی قسم،
میں جو مر جاؤں ابھی، تو ملے عرقِ حیات
آگہی بعد از عرصہ کا بھلا
ہے بجا ہم کو ملے ایک صلہ
کیا تہی سر بھرا جائے میرا
خالی سنسان کسی تربت میں
اپنے ہر غم پہ فقط تیرے پیروں کی قسم
اب بھی بس تیری قسم
لاؤ مٹی سے بھلی، کوئی بجری جو ملے
اپنے ہاتھوں سے مگر
ترے پیروں کی قسم
تو تہی سر بھرا جائے میرا
آگہی بعد از عرصہ کا بھلا
یہ ملے ہم کو سزا، تو ملے عرقِ حیات

☆☆☆

☆...... تسنیم الرحمٰن حامؔی

میرا کمرہ

میرے کمرے کی چار دیواریں
تکتی رہتی ہیں مجھ کو جانے کیوں
میں بھی تکتا ہوں ان کو بدلے میں
ایک چھت اور ایک پنکھا ہے
جس پہ جمتی ہے گرد کی چادر
ایک کھڑکی ہے جس کے دو پَٹ ہیں
ایک کھلتا نہیں ہے کھولے سے
دوسرا تو کبھی نہیں کھولا
طاق پر اک پڑا ہے آئینہ
جس میں چہرہ کبھی نہیں دیکھا
ایک بستر ہے اَدھ بچھا جس میں
تیری یادوں کے آتشیں شعلے
سلوٹوں کو ابھار دیتے ہیں
جو کہ سونے سے باز رکھتی ہیں
ایک تکیہ ہے نیم عریاں سا
جس پہ دھبّے ہیں میرے اشکوں کے
اس پہ رکھتا ہوں ڈولتے سر کو
اور قصّے تمہاری چاہت کے
دل سناتا ہے وقفے وقفے سے
سنتا جاتا ہوں میں بھی چپ سادھے
دونوں آخر پہ رو ہی پڑتے ہیں
ایک کونے میں ایک الماری
جس میں دولت سنبھال رکھی ہے
میری سانسوں کا قیمتی حاصل
یعنی چھوٹا سا اک کتب خانہ
چند کاغذ سرہانے پڑتے ہیں
میرا برسوں کا ایک ساتھی ہے
میرے ہاتھوں میں ڈولتا اکثر
ایک پیارا قلم ہے جس سے میں
لکھتا رہتا ہوں چار چھ باتیں
خالی پیالہ ہے جس سے میں اکثر
چائے پیتا ہوں سرد کر کر کے

☆......تسنیم الرحمٰن حامیؔ

ایک میں ہوں ساتھ میں میرے
ایک سایا ہے تیری صورت کا
خوب جمتی ہے بات آپس میں
روٹھ جائے تو بھاگ چھپتا ہے
ڈھونڈتا ہوں تو مل نہیں پاتا
پھر بجھا کر سبھی چراغوں کو
پھر سے آخر کو ڈھونڈ لیتا ہوں
سامنے سے ہے ایک دروازہ
کوئی آئے تو کھولتا آئے
یا میں جاؤں تو کھولتا جاؤں
کوئی آتا نہیں ہے کمرے میں
کوئی آئے تو آئے بھی کیوں کر
میں بھی باہر کبھی نہیں جاتا!

☆☆☆

مناجات

میں طالبِ بے مایہ ہوں، تو صاحبِ جود و عطا
میں ہیچ ذاتِ خستہ ہوں، تو خالقِ ارض و سما
میں عاصی و لاچار ہوں، تو داورِ روزِ جزا
میں بندۂ بے نام ہوں، تو لائقِ حمد و ثنا
میں طائرِ محصور ہوں، تو دافعِ شرّ و بلا
میں گندگی میں غرق ہوں، تو پاک ذاتِ کبریا
میں ناتواں انسان ہوں، تو قوتوں والا خدا
میں جاہل و بے نور ہوں، تو نورِ ہر دو آشنا
میں ذاتِ فانی ہوں مگر، تو ذات ہے بے انتہا
میں پیکرِ کم مائیگی، تو مائیگی سے ماورا
میں مفلس و دستِ دعا، تو مالکِ گنج و سخا
میں اپنے آپ کو دیکھ لوں، تو اپنی شان کو آزما

☆☆☆

☆......تسنیم الرحمٰن حامؔی

حمد

نہیں تعریف ممکن جس کی ذات کبریا تو ہے
مفاہیم سپاس وحمد سے بھی ماورا تو ہے

یہ ماضی حال و مستقبل تجھے پانے سے قاصر ہیں
ازل کی ابتدا تو ہے، ابد کی انتہا تو ہے

زمین وآسماں ہر لحظہ تیری حمد کہتے ہیں
خدایا ذوالکرم تو، ذوالجلال وذوالغنا تو ہے

سبھی انفاسِ عالم کا کوئی رزاقِ اکبر ہے
قسم تیری خدائی کی فقط رب العلیٰ تو ہے

کوئی حیوان وانس وجن وارض وآسماں سورج
ترا ساجھی نہیں قدرت میں واحد یکتا تو ہے

سبھی انس وملک تسبیح کرتے ہیں فقط تیری
تقدس بھی ترا حق ہے سزاوارِ ثنا تو ہے

فنا ہر ایک ہستی کا مقدر ہے ابھی یا کل
نظامِ نیستی میں ایک ہی ذاتِ بقا تو ہے

توئی محبوب ہر دل را، توئی معبود ہر سر را
توئی موجود ہر سو است ومعشوقِ پیمبر را

☆☆☆

☆......تسنیم الرحمٰن حامی

جھوٹ بولا کر

زمانے بھر کی تلخی کو سمیٹے سچ اگل کر کیوں
بہت شیریں ہے یہ جاناں، ہمیشہ جھوٹ بولا کر

سنا ہے سچ کی بالآخر ہمیشہ جیت ہوتی ہے
مگراب سچ بھی کترائے، تو اتنا جھوٹ بولا کر

زمانے کی ڈگر کو دیکھ کر سچ بولے جاتے ہیں
زمانہ دیکھتا رہ جائے، ایسا جھوٹ بولا کر

بہت دل ٹوٹ جاتے ہیں تری اس راست گوئی سے
مری تجھ سے گزارش ہے، خدارا جھوٹ بولا کر

تجھے جب جان کر جھوٹا چھڑالیں گے سبھی دامن
کسی دشت و بیاباں میں تو تنہا جھوٹ بولا کر

اگر سچے سبھی بیٹھے ہوں مجلس میں تو مت گھبرا
تو سینہ تان کر اپنا، اکیلا جھوٹ بولا کر

جو اک مرشد سے پوچھا سچ اگر کہنا ضروری ہو
تو بولے گر ضروری ہو تو سچا جھوٹ بولا کر

شکایت کی جو حامی سے، برا ہے جھوٹ، تو بولا
برا ہے جھوٹ گر اتنا، تو اچھا جھوٹ بولا کر

☆☆☆

☆......مصروفہ قادر

نہ یوں کرنا!

📖

بھلے مانس یہ کیا پوچھا ؟
یہ کیوں چھیڑا ہے یادوں کو
کریدا کیوں ہے زخموں کو
یہ کیوں پھر راکھ کو تم نے بکھیرا
ڈھونڈتے کیا ہو؟
بھلے مانس یہ کیا پوچھا؟
کہ کیا سچ یہ کہانی ہے؟
محبت جاودانی ہے؟
محبت مر نہیں سکتی؟
بھلے مانس لو سن لو پھر
جو تم ایسے کسی بھی ہاتھ کو جھٹکو
جو تم کو تھامے رکھتا ہو
جو تم پھیرو نگاہیں ایسے چہرے سے
جو تم کو تکتا رہتا ہو
جو تم الفاظ کے خنجر اتارو ایسے سینوں میں
کہ جن میں تم دھڑکتے ہو
جو تم بس سرد لہجے سے بجھا دو دہکتے
جذبے
تو ہاں اے نیک دل انساں
محبت مر بھی سکتی ہے
محبت مر بھی سکتی ہے

☆☆☆

☆......مصروفہ قادر

اعتراف

📖

یہ کہنا کتنا آساں ہے
میرا سب کچھ تمہارا ہے
میرا ہر پل تمہارا ہے
سبھی قصے تمہارے ہیں
میرا دل، جسم و جاں ہمدم
میرے سپنے تمہارے ہیں
مگر اے جان من سن لو
ہے کذب و افترا یہ تو
نہیں منظور مجھ کو کہ
کھری میری محبت میں
کوئی بھی جھوٹ ہو شامل
سب ہی کچھ تو نہیں ہرگز
کہیں پہ کچھ تو میرا ہے
صرف میرا۔۔۔
میرے بچپن کی کچھ یادیں
میرے اپنوں کی چند باتیں
میرے کچھ گھاؤ میرے ہیں
کئی دکھ میرے اپنے ہیں
کہیں کچھ خواب ادھورے سے
ابھی بھی طاقِ نسیاں پہ
ہیں میرے منتظر جاناں
نہیں منسوب وہ تم سے
وہ میرے ہیں
وہ میرے ہیں

☆☆☆

☆......مصروفہ قادر

حاصل

اک تری جستجو
بس یہی آرزو
اپنے دل میں لئے
میں بھٹکتی رہی
تپتے صحراؤں میں
شہروں اور گاؤں میں
دھوپ اور چھاؤں میں

بس میں چلتی رہی
ہاں کبھی تھک کے جب پاؤں رکنے لگے
شوقِ دیدار نے پھر سے سرگوشی کی
دیکھ لو سامنے ہے وہ منزل کھڑی
گرتے پڑتے تو تم تک میں پہنچی مگر

حیرتوں نے مجھے آن گیرا ہے اب
تم کسی اور کی جستجو میں مگن
اک نئے ہی سفر کی تیاری میں ہو

پر میرا یہ سفر رائیگاں تو نہیں
مجھ کو بھی تو ملے
درد کے سلسلے
وحشتوں کے دیئے
پاؤں کے آبلے!!!

☆☆☆

☆......مصروفہ قادر

عہد

تری بے رخی کی یہ سل صنم
ہے گڑی یوں میرے وجود میں
مجھے سانس لینا محال ہے
ترے سرد لہجے کی مار نے
ایسے ادھ موا سا کیا مجھے
کہ یہ زیست جیسے وبال ہے
مگر جان من تو بھی سن لے اب
کہ اذیتوں سے بھرے یہ دن
جو گزر گئے تو جیوں گی میں۔۔
(ہے یقیں مجھے کہ جیوں گی میں)
نیا جام عمر پیوں گی میں!!!

☆☆☆

تھکن

ایک عرصہ ہوا نیند آئے ہوئے
ایک مدت سے آنکھیں ہیں بنجر مری
اک صدی جیسے بیتی ہو چلتے ہوئے
اب عجب سی تھکن سے بدن چور ہے
میں جہاں تھی وہیں پر کھڑی ہوں مگر
ہے یہ کیسی تھکن؟
روح کے آبلے پھوٹنے کو ہیں اب
کیا کہیں پہ ہے ایسا مسیحا کوئی؟؟
روح کی جو تھکن دور کر دے مری
خالی آنکھوں کو خوابوں سے بھر دے مری!

☆☆☆

☆......مصروفہ قادر

خیر

محبت اک طلسم ہے
یہ ایسا اسم ہے لوگو
جسے بھی ورد ہو جائے
کہ جواز بر کرے اس کو
وہ دل آباد ہوتا ہے۔۔

یہ ہے اک نور کا ہالہ
عقیدت کی ہے اک مالا
جسے حاصل یہ ہو جائے
وہ روح سرشار ہوتی ہے۔۔

محبت وہ صحیفہ ہے
جو ہر اک لفظ سے اپنے
بخشتا نوعِ انساں کو
سکونِ جاودانی ہے!۔۔

دعا ہے میری اب اس سے
محبت کا جو خالق ہے
جو خود عین محبت ہے
محبت ورد ہونے میں
نہ اب کچھ دیر ہو مولا
محبت اسم ہو میرا
اور تا دیر ہو مولا
محبت سب کے دل میں ہو
ہر اک کی خیر ہو مولا!!

☆☆☆

افسانے

☆......طارق چھتاری

غم سے نجات پائے کیوں؟

شکستہ دیوار و در، ہرسُو بیاباں، قیامت خیز یہ منظر کہ بوسیدہ محراب کے نیچے شطرنجی بچھا کر مرزا نوشہ نے سیاہ مہروں کو بساط پر یوں سجایا گو یا ان کی فتح لازم ہو اور مدِ مقابل کی شکست ملزوم۔ مرزا نے فرغل سمیٹا اور دوزانو بیٹھ کر پیادے کو ایک خانہ آگے بڑھا دیا۔ دوسری جانب کا سفید پیادہ ایک ساتھ دو خانے آگے بڑھ گیا۔

''یہ کیا ہوا اور کیوں کر ہوا؟'' انہوں نے سوال کرنا چاہا لیکن جب نظر اٹھا کر دیکھا تو پایا کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔

''معلوم ہوتا ہے سفید پیادے خود مختار ہیں۔''

دراصل چال چلنے والا سب کی نظروں سے پوشیدہ تھا اور اس نے کھیل کے بیشتر اصول بھی تبدیل کر دیئے تھے۔ اس کا پیادہ ہمیشہ پہلی چال دو خانے چلتا تھا۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے چار چھ چالوں میں ہی قلعہ بنا لیا اور وزیر، ہاتھی، اونٹ اور ڈھائی چال چلنے والے گھوڑے کی پاسبانی میں اپنے بادشاہ کو محفوظ کر لیا۔ وقت کے بازی گر نے کیا چال چلی کہ سفید مہرے 'بشپ، نائٹ، رؤک اور پون' اس طرح اپنا اپنا مقام متعین کرنے لگے کہ کوئین قلعے کی سب سے طاقتور محافظ بن گئی۔ دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھنے والے اسداللہ، خان بہادر، نظامِ جنگ نہایت احتیاط اور دور اندیشی کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے مگر جانے کیسے بساط الٹ گئی۔ چوسر

بچھائی تو سب گوٹیاں بکھر گئیں اور پیچھے سے آ کر شہر کوتوال نے نجم الدولہ، دبیر الملک مرزا غالبؔ کو قمار خانہ چلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا کہ کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ ستم زدگاں کے مکان کی طرح تنگ قید خانۂ فرنگ کی ہیبت ناک دیواریں، موٹی موٹی آہنی سلاخیں، نیچی چھت اور چھت سے لگے روشن دان کہ جن سے روشنی کی بجائے کمرے میں تاریکی داخل ہوتی تھی۔ کوئی پوچھے کہ یہ قیدی کون ہے تو تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ یہی کہ ایک قمار باز، تماش بین اور بادہ خوار کہ وتیرہ جس کا آوارگی یا یہ کہ شاعر، ولی اور فلسفی، جس کی آنکھ سے لہو ٹپکتا ہے اور دل جسم کے ساتھ جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ مدتِ قید چھ ماہ قرار پائی ہے اور رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ سیشن جج باوجود یہ کہ اس کا دوست ہے اور اکثر صحبتوں میں بے تکلّفانہ ملتا ہے، اس نے بھی اِغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کی مگر کسی نے نہ سنی اور وہی حکم بحال رہا۔

اب مرزا غالبؔ کسی محفلِ سخن میں نہیں جیل خانے میں تھے۔ وہ بے قراری کہ ہائے ہائے۔ چارو ناچار کیا کرتے، کبھی صبر کیا اور کبھی شکوہ۔ زندگی کچھ اس ڈھب سے گزر رہی تھی کہ رات میں چاند گرہن لگتا اور دن میں سورج سَوا نیزے پر اُتر آتا۔ آنکھیں نہ بند ہوتی تھیں اور نہ کھلتی تھیں کہ ایک شب نیم باز آنکھوں سے خواب دیکھا: عمائدینِ شہر اور منتخب شعراء جمع ہیں، محفل شباب پر ہے۔ اِدھر محمد ابراہیم ذوقؔ، نواب ضیاالدین نیّرؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ، امام بخش صہبائیؔ تو اُدھر سید غلام علی وحشتؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، نواب شیفتہؔ، لالہ مہیش داس اور ہرگوپال تفتہؔ۔ سامنے تاجدارِ ہندوستان ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ۔

شہنشاہِ فلک منظر، بہادر شاہ ظفر اٹھتے ہیں اور چھ پارچے کا خِلعت مع تین رقومِ جواہر یعنی جِیغہ، سرپیچ اور حمائلِ مروارید ایک نقرئی طشت میں رکھ کر غالبِؔ خستہ

کی طرف بڑھتے ہیں۔ مرزا کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں کہ محسوس ہوا شاہ نے اپنا دستِ شفقت ان کی پیشانی پر رکھ دیا ہے اور اس کے بعد ایک بے کس ضعیف بادشاہ کی کانپتی ہوئی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

''مرزا نوشہ، اٹھو۔''

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی آنکھ کھل گئی۔ سامنے قید خانے کا دربان کھڑا تھا۔

''میرے بھائی سنتے ہو؟ ذرا نزدیک تو آؤ، کچھ تو بتلاؤ کہ میں کس جرم میں گرفتار ہوا؟''

دربان آخر کیا جواب دیتا۔ قریب آیا اور بولا۔ ''کچھ درکار ہے کیا؟''

''بے شک۔''

''کیا چاہیے حضور؟''

''محض ایک تپائی۔''

''تپائی؟ لیکن کیوں؟''

''مطمئن رہو، دربان۔''

''کیا فرار ہونا چاہتے ہیں یا پھندا لگا کر مرنا؟''

''فرار کی حاجت نہیں اور موت میری قسمت نہیں کہ اس کا ایک دن معیّن ہے۔''

دربان باہر نکلا، سلاخوں کی زنجیر میں تالا لگایا اور تھوڑی دیر بعد لکڑی کی ایک چھوٹی میز لے کر آ گیا۔

''بہت مشکل سے لایا ہوں مرزا صاحب۔''

''جیتے رہو، آفریں، صد ہزار آفریں۔''

دربان مرزا کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا لیکن چھپ کر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر وہ اس میز کا کیا کریں گے؟ غالبؔ روزن کو تکتے رہے، دیر تک تکا کئے، بالآخر

صبح ہوئی اور سورج نکل آیا۔ حبس گزیدہ غالبؔ نے دیوار کے سہارے میز لگائی اور اس پر چڑھ گئے۔ دربان چوکنا ہوگیا۔ وہ ایک ہی جست میں مرزا کو گرفت میں لینا چاہتا تھا، مگر کچھ ایسا دیکھا کہ بے حس و حرکت بُت بنا کھڑا رہا۔ دراصل سوختہ ساماں مرزا غالبؔ کا چہرہ یکا یک آتش رنگ ہوگیا تھا اور پھر لمحے بھر میں ہی سیاہ پڑ گیا، گویا ان کا دل سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا ہو۔ مرزا غالبؔ بمشکل تمام میز سے اترے۔ چہرہ فق تھا اور جسم لرز رہا تھا۔ دربان قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ مرزا نے جبیں سے پسینہ پونچھا اور خلا میں گھورنے لگے۔ گمان گزرا کہ وہ اپنے کو اپنا غیر تصور کر رہے ہیں۔

''مرزا صاحب، آپ کی اس حیرانی و پریشانی کا سبب.........؟''

''کیا تم جانتے ہو دربان کہ باہر ہوا کیا ہے؟'' اتنا کہا اور روشن دان پر نگاہ جما دی۔

''آپ نے باہر ایسا کیا دیکھ لیا مرزا صاحب کہ آپ کی یہ حالت.......''

''ابھی میرے حواس درست نہیں، یکتائے روزگار یہ غالبؔ فی الوقت تنہائی چاہتا ہے۔''

دربان چلا گیا۔ لیکن وہ ہر روز دیکھتا کہ مرزا غالبؔ روشن دان سے باہر جھانکتے ہیں اور اسی کیفیت سے گزرتے ہیں۔ دربان تجربے کار تھا، اسے پورا یقین تھا کہ مرزا قید کی تنہائی سے گھبرا گئے ہیں۔ کھلی فضا میں سانس لینے اور انسانوں کے درمیان جانے کی خواہش ہی ان کی اس حالت کا سبب ہے۔ ان کے لیے تو نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ لوگ، جن کے ساتھ شطرنج اور چوسر کی بازیاں لگتی تھیں اور ساغر و مینا کی محفلیں جمتی تھیں۔

اب مرزا غالبؔ کی سزا کے تین ماہ مکمّل ہوگئے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا، شب کی آمد آمد تھی۔ ابھی مشعلیں روشن نہیں کی گئی تھیں۔ مرزا رنج سے خوگر ہو چکے تھے اور ان کی تمام مشکلیں آسان ہوگئی تھیں۔ وہ گاؤ تکیے پر نیم دراز تھے کہ اسی پل لوہے کا

دروازہ کھلا۔ دو سائے رینگتے ہوئے نظر آئے۔ ایک نے قدم بڑھا کر آبنوسی کشتی میز پر رکھ دی۔ اس میں کشمش، بادام اور اخروٹ سے بھرا پیالہ اور ولایتی شراب کا شیشہ رکھا تھا۔

''دربان! تمہارے ہم راہ کون ہے؟''

''حضور، نواب مصطفیٰ خاں۔''

غالبؔ کے چہرے پر شادمانی کے نقوش ابھر آئے۔

''تو اے کہ شیفتہؔ و حسرتی لقب داری۔''

''آداب، مرزا نوشہ''

کسی نے مشعل جلا دی اور کمرہ روشنی سے بھر گیا۔

''گویا کہ آج رحمتِ حق بشر کی شکل میں آئی ہے۔'' مرزا غالبؔ نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب جہانگیر آباد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کو بھی اپنے بوریئے پر بٹھا لیا۔

''مرزا صاحب، آپ کے لیے خوش خبری ہے۔''

''اب نہ اچھی خبر سے خوشی ہوتی ہے اور نہ بری خبر سے آزردگی۔'' غالبؔ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر بولے۔ ''میں واقف ہوں کہ شیفتہؔ نے ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کا برتاؤ کیا ہے۔''

''مرزا صاحب، یہ آپ کا حق ہے۔''

''منت کش ہوں تمہارا۔''

نواب شیفتہؔ نے مرزا صاحب کو رہائی کا پروانہ دکھاتے ہوئے کہا۔

''آدھی معیاد گزرنے کے بعد مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں آپ کی رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا۔''

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ بجائے خوش ہونے کے، فکرمند نظر آنے لگے۔

''ہائے یہ کیا غضب ہوا'' علاوہ اس کے کچھ نہ کہہ سکے۔

''سنا ہے کہ جب رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو آپ کی آزادہ روی سے مطلع کیا تو مجسٹریٹ نے خود بخود رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔''

یہ سننا تھا کہ سپاہ گری سے منسلک اپنے خاندان پر نازاں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ گلے کی تمام رگیں تن گئیں۔ خوف اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ جیسے مالیخولیا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ شیفتہؔ نے یہ منظر دیکھا تو ششدر رہ گئے، خود کو سنبھالا اور آہستہ سے بولے۔

''مرزا صاحب آپ کو رہائی ملی ہے۔ سزا کی مدّت نصف ہوئی ہے، اس میں توسیع نہیں۔''

''شیفتہؔ وہ آوازیں سنو۔''

''کون سی آوازیں۔ وہ آوازیں جہاں رقص وسرود کی محفل ہے۔ ساز ہے آواز ہے اور آپ کی غزل۔ کیا آپ وہاں جانا نہیں چاہتے مرزا نوشہ؟'' شیفتہؔ نے ان کو معمول پر لانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ غالبؔ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ جنوں میں کیا کیا کچھ بک رہے ہیں۔

''آخر آپ کا مُدّعا کیا ہے مرزا نوشہ؟''

وہ خاموش رہے تو دربان نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''نواب صاحب معافی پاؤں تو کچھ کہوں؟''

''ہاں بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟''

''مرزا صاحب روزانہ اس جھروکے سے باہر جھانکتے ہیں اور پھر......'' وہ اپنی بات مکمّل بھی نہیں کر پایا تھا کہ مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالبؔ گویا ہوئے۔

''بھائی شیفتہؔ تم کہتے ہو میں یہاں تین ماہ سے ہوں، میں کہتا ہوں صدہا سال گزر گئے۔''

''کیا سینکڑوں برس؟''

''ہاں میرے بھائی! اب یہی میری جائے پناہ ہے۔ کیا تم نہیں جانتے ہو قید خانے میں تو سب خیریت ہے، ولیکن باہر پوری کائنات مشکوک ہے۔ یہ دنیا دیارِ غیر معلوم ہوتی ہے اور ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ہماری خبر نہیں آتی۔

اہلِ خرد کو سر چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔ آتش ہے، دھواں ہے، غبار ہے، گویا ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے۔''

شیفتہ نے مرزا کا ہاتھ تھام لیا اور بولے۔ ''لیکن مرزا صاحب یہ ایک قید خانہ ہے۔''

''اور وہ کیا ہے باہر؟ شیفتہ یہاں سزا ہے تو وہاں قضا ہے میرے بھائی۔ وہاں کوہِ گراں گردش میں ہیں، جن سے ٹکرا کر انسانوں کے سر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔''

''یہ آپ کا وہم ہے مرزا صاحب۔''

''نہیں شیفتہ یہ وہ منظر ہے جو خود اپنا ناظر ہے۔ جو غائب بھی ہے اور حاضر بھی۔'' شیفتہ خاموش تھے اور مرزا بول رہے تھے۔

''مقدّس صحیفوں کے حروف مٹنے لگے ہیں۔ چھاپ تلک سب چھین لی گئی ہیں۔ کوہِ قاف کی پریوں کے بال و پر نوچ لیے گئے ہیں اور سارا عالم حشر کا میدان بن گیا ہے۔ ارژنگ، عظیم مصوّر کا نگار خانہ، ویران ہے جبکہ اسلحہ خانوں کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کو قتل کر دیا گیا ہے۔ میرا بائی اور حبّہ خاتون گرفتار کر لی گئی ہیں اور ہر موڑ پر کالی داس، رومی، عمر خیام اور شیکسپئر سر کے بل کھڑے ہیں۔ بدھ اور مہاویر کی تعلیمات کے نئے معنی تلاش کیے جا رہے ہیں۔ فرید بابا اور نانک گرو افسردہ ہیں۔ خزاں کی حکمرانی ہے اور اب گھر کی دیواروں پر بھی سبزہ

نہیں اگتا۔ہائے ہائے وہ شہرِ فسوں کہ ذکر آتے ہی جس کا سینے پر اِک تیر لگتا تھا۔آہ......''

غالبؔ کی زباں سے آہ نکلی اور وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے، پھر لڑکھڑا کر زمین پر یوں گرے جیسے سارے عالم کی بلند اور عظیم الشان تاریخی عمارتیں گر کر ریزہ ریزہ ہوگئی ہوں۔نجم الدولہ، دبیر الملک، نظامِ جنگ، خان بہادر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے ایک ہچکی لی اور موت کی آغوش میں چلے گئے۔غالبؔ کی لاش فرش پر پڑی تھی اور وہ خود قید خانے کے تاریک گوشے میں بیٹھے تماشائے اہلِ جہاں دیکھ رہے تھے کہ اچانک ان کی لاش ہزار لاشوں میں تبدیل ہوگئی۔

''یاالٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟''

سارا جہاں محوِ حیرت تھا کہ شاعروں اور فن کاروں ،فلسفیوں اور دانشوروں ،صوفیوں اور سنتوں کی بے شمار لاشیں قید خانے کی سنگلاخ زمین پر بکھری پڑی تھیں، غالبؔ تاریک گوشے میں بیٹھے تھے اور قید خانۂ فرنگ کا دربان اپنی جگہ اسی طرح تعینات تھا لیکن سخن فہم اور غالبؔ کے طرفدار نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ وہاں سے غائب تھے۔

☆☆☆

☆......صادقہ نواب سحر

اندرونی دروازے کی دہلیز

کار تیزی سے بورگھاٹ کی پہاڑیوں سے گزرتی جا رہی تھی۔رئیسہ کار کی پچھلی سیٹ پر لیٹی ہچکولے کھا رہی تھی۔اس کی آنکھیں کسی اندرونی درد کا اظہار کر رہی تھیں۔آگے ڈرائیور کی سیٹ پر شہزاد بیٹھا تھا۔

''شیزو!''اس نے بے اختیار آواز دی،''اور کتنا راستہ باقی ہے؟''

شہزاد نے شاید اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔سیٹی پر کسی تازہ فلم کی دھن بجاتا رہا۔

''ذرا تیز چلاؤ۔''

''او کے''،شہزاد نے کہا اور دوبارہ سیٹی بجاتے ہوئے کار کو موڑ پر گھمانے لگا۔

کھنڈالہ پہنچتے پہنچتے دھوپ چڑھ چکی تھی۔شہزاد بھوک سے بے حال تھا مگر رئیسہ کو بالکل بھوک نہیں تھی۔اس کی بھوک کسی کی بے وفائی کی یاد نے ختم کر دی تھی۔آخر شہزاد کی ضد پر اس نے کھانا کھا ہی لیا۔

دو وسیع کمروں کی مشرقی اور مغربی کھڑکیوں کے قریب صاف ستھرے پلنگ لگوا دیئے گئے تھے۔سامنے کشادہ گیلری، ایک جانب کچن، دوسری طرف بڑا سا ہال، سونے کے کمرے سے ملحق باتھ روم، ہلکا پھلکا فرنیچر، کچن میں گیس کی سہولت، بہر حال ہر طرح کا آرام تھا۔

''شیزو! بنگلہ تو بڑا پیارا ہے۔رئیسہ نے خوش دلی سے کہا۔

’’بہت خوبصورت‘‘ شہزاد نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

سامان اندر رکھوا کر بنگلے کے باہر بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے رئیسہ اور شہزاد چائے کا انتظار کرنے لگے کہ منیر نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ تین لوگ تھے۔ سبھی سیاہ سوٹ اور نیلی ٹائیوں میں ملبوس تھے۔ شاید وہ اپنے کلائنٹس کے ساتھ تھا۔ حیران حیران سا ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ کر رئیسہ کے قریب آیا۔ وہ تینوں کانفرنس ہال کی طرف بڑھ گئے۔

’’جناب منیر صاحب! ان سے ملئے۔ یہ ہیں شہزاد میرے...‘‘

’’نئے ڈرائیور!‘‘

’’دوست ہیں۔‘‘ رئیسہ نے منیر کے لہجے کی کاٹ اپنی مسکراہٹ سے دبا دی۔ ’’کل ہمارا پنچ گنی کا پروگرام ہے۔ کیا آپ ہمارا ساتھ دینا پسند کریں گے؟‘‘ رئیسہ نے پوچھا اور آگے بڑھ گئی۔

’’ڈرائیور کی ضرورت ہو تو ساتھ لے چلو۔‘‘ منیر کے لہجے کی کاٹ کو انجان بن کر اُڑن چھو کرتے ہوئے رئیسہ مسکرا کر بولی، ’’صبح نو بجے نکلیں گے۔‘‘

شہزاد آزاد خیال، امیر والدین کی اکلوتی اولاد۔ زندگی کے پل پل سے لطف اندوز ہونے کا خواہشمند، چوبیس سالہ نوجوان کسرتی جسم کا مالک تھا اور رئیسہ چھتیس برس کی حسین عورت، کمر کو چھوتے گھنگھرالے بال اس کے حسن میں اضافہ کر رہے تھے۔

’’تم اتنی دکھی کیوں ہو؟‘‘ شہزاد نے سوال کیا تو وہ ہنس دی۔

’’بھائی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے اسی لیے نا؟‘‘ وہ جان بوجھ کر انجان بننے لگا۔

’’ارے بھئی شہزاد تم بھی کہاں کی کہانی لے بیٹھے۔‘‘ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن اس کا بے چین دل کہہ رہا تھا، ’’شہزاد! تمہارے بھائی صاحب تو میرے لیے اسی دن

مر چکے، جب انھوں نے شادی کی پیشکش رکھی۔''

رئیسہ نو سال کی تھی جب نوشابہ بیاہ کر ان کے پڑوس میں آئی تھیں۔اس منّی سی بچی سے انھیں بے حد پیار تھا۔''رئیسہ رئیسہ'' کہتے نہ تھکتی تھیں۔نوشابہ کی سسرال میں کوئی نہیں تھا۔وہ جلدی جلدی نوکروں سے کام کروا کر اس کے لئے فرصت بنا لیتیں۔شام کو رئیسہ اسکول سے ان کے یہاں آ جاتی اور پھر اپنی ماں کو بھی یاد نہ کرتی۔ ان کے شوہر مظہر بھی اکثر اسے پاس بٹھا کر کہانیاں سناتے۔ بھوتوں کی ڈراؤنی کہانیاں......اور وہ رات میں ڈر کر اپنی ماں سے لپٹ جاتی۔

دن ہمیشہ ایک جیسے کہاں رہتے ہیں! وقت ایک جگہ پر کہاں ٹھہرتا ہے! رئیسہ بڑی ہو چکی تھی۔ باجی اب بھی اسے گھر بلاتیں مگر وہ ماں کا چہرہ دیکھ کر انکار کر دیتی، البتہ صبح کے وقت اپنے گھر کے صحن میں لگی گلابوں کی کیاریوں کو پانی دیتے ہوئے مظہر بھائی سے گفتگو ہو جاتی۔شام کے وقت وہ اپنے لان میں چائے کا انتظار کرتے ہوئے ملتے۔ باجی اکثر اندر باورچی خانے میں تلن میں مصروف ہوتیں۔مظہر بھائی جانے کہاں کہاں سے لطیفے اور مزے مزے کے واقعات یاد رکھ کر اسے سناتے۔ وہ بھی میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔خوب ہنستی۔باجی چائے لے آتیں تو وہ بھی محظوظ ہوتیں۔

''آؤ رئیسہ بی! ساتھ چائے پئیں۔''، وہ پیار سے آواز دیتیں، دیکھو تمہارے پسندیدہ سموسے بنائے ہیں قیمے کے۔''

''باجی! وہ مجھے ذرا کام ہے۔''، وہ جھجھکتے ہوئے کہتی، ''یہیں دے دیں تو اور بات ہے۔آپ کا دل رکھنے کے لیے کھا لوں گی۔'' پھر تینوں بڑے مزے سے ہنسنے لگتے۔

''اور آپ باجی۔'' رئیسہ سموسے کا بڑا سا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھ لیتی۔

''وہ تو پکاتے پکاتے کھاتی رہتی ہیں۔دیکھو نا کیسی موٹی تازی ہو گئی ہیں۔'' مظہر

ایک طویل قہقہہ لگانے کا لطف لیتے۔

نوشابہ رئیسہ کے دکھ کو سمجھتی تھی۔ اس کی دونوں بڑی بہنیں سولہ اور اٹھارہ سال کی ہو چکی تھیں۔ باپ کمپاؤنڈری کرتے کرتے چار پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ امی کی خواہش تھی کہ اپنی بچیوں کو اچھی تعلیم دیں لیکن ممبئی کے مضافات میں تھانے ضلع کے وسئی شہر میں ہتّی محلّہ' میں نانا میاں کی درگاہ کے قریب اپنے خاندانی مکان میں ایک حصے کو کرائے پر اٹھا دینے سے صرف پانچ ہزار روپے ہاتھ آتے تھے۔ چنانچہ لڑکیوں کی پڑھائی روک دی گئی اور رئیسہ تیسری جماعت میں ہی گھر بٹھالی گئی۔ ویسے بھی اسے پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو نئی نئی دوست بنانے، کھیلنے کودنے اور گانے بجانے کا شوق تھا۔ اس وقت تو اسے باجی پر بہت غصہ آیا جب انھوں نے رئیسہ کی پڑھائی کا ذمہ اپنے سر لینا چاہا۔ رئیسہ نے انکار کر دیا لیکن امی نے اشاروں اشاروں میں اکبر کی پڑھائی کی طرف دھیان دلا دیا اور باجی بات گول کر گئیں۔

اکبر امی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ آوارہ گرد دوستوں کی صحبت نے اسے نکمہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ اپنے گھر کے پچھواڑے کے گھروں کی قطار سے گزر کر تکیہ محلّہ سے نکل کر وہ سمندر کے ساحلوں پر دوستوں کے ساتھ خرمستیوں میں مگن رہتا۔ کبھی تیرتا ہوا سمندر میں بنے وسئی قلعے تک پہنچ جاتا۔ کبھی درگاہ کی پشت سے کولی واڑا، ہولی اور بندر محلّہ میں دھوم مچاتے ہوئے اس طرف کے قلعے پر شرارتوں کے جھنڈے گاڑتا۔ ناریل اور تاڑ کے پیڑوں پر چڑھ جانا اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کبھی پاپلیٹ، گھول، سرمئی، حلوہ مچھلیاں شکار کر لاتا۔ کبھی دوستوں سے سوکھے جھینگے مانگ کر گھر لے آتا اور پکانے کی فرمائش کرتا۔ اس کے ساتھی بگڑے ہوئے امیر عیسائی کولی تھے۔

سب قابل برداشت تھا لیکن جب اکبر بہنوں کی شادی کے لیے رکھے ہوئے زیور سمیت ایک دوست کی بہن کو لے کر فرار ہو گیا تو امی کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ دیوانی سی

ہوگئیں۔جوان بیٹیاں پہاڑ معلوم ہونے لگیں۔اب ایسے کی بہنوں کو کون شریف بیاہے گا!

دن اپنے سارے بکھیڑے ختم کر کے کوچ کر چکا تھا۔بارش کی آمد آمد تھی۔بادل مہیب دیو کی طرح بانہیں پسارے گویا کسی شکار کی تلاش میں سرگرداں نظر آرہے تھے۔ امی ٹین میں بچے کھچے چاول صاف کر رہی تھیں۔تینوں بیٹیاں خاکی کاغذوں سے لفافے بنا رہی تھیں کہ یہی ان کی روٹی روزی کا ذریعہ رہ گیا تھا۔دروازے کی گھنٹی بجی۔ رئیسہ اٹھی۔دروازہ کھلا۔

''السلامُ علیکم''،مردانہ آواز آئی۔بڑی دونوں نے کاغذ،لفافے سمیٹے اور اندر کو دوڑیں۔

''وعلیکم السلام مظہر بھائی!''رئیسہ نے بڑھ کر ان کے سلام کا جواب دیا۔اس نے دو ہفتوں بعد انھیں دیکھا۔مظہر کام کاج کے سلسلے میں گوا گئے ہوئے تھے۔نوشابہ کا مائیکہ وہیں کا تھا۔گوا کے شہر 'ماپسا' میں انہوں نے ایک بنگلہ بھی خرید رکھا تھا،جس کی دیکھ بھال بھی ہو جاتی تھی،اسی لیے وہ بھی ساتھ گئی تھیں۔

''باجی آ گئیں؟''رئیسہ نے چہک کر پوچھا۔

''آج وہ کرن پانی گاؤں اپنی ایک دوست کے گھر گئی ہیں۔''

''کِرن پانی! گاؤں کا نام!!؟''وہ ہنس دی۔

''کہا جاتا ہے کہ یہاں سمندر میں ویتال کی مورتی ملی تھی۔سورج کی پہلی کرن اسی مورتی پر پڑی تھی۔اس مورتی کو پانی سے نکال کر مندر میں رکھ دیا گیا اسی سے اس کا نام کرن پانی پڑ گیا۔''

''راجہ وکر مادتیہ اور اور بے تال والے بے تال ہم نے بچپن میں ٹی وی پر ان کی کہانیاں دیکھی ہیں۔''

''ہاں ہاں وہی۔گوا میں سبھی جگہ ویتال کی مورتیاں ہیں۔کرن پانی،ماپسا سے

بس آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔''

''باجی بتا رہی تھیں کہ گوا بہت خوبصورت ہے۔ہمیں بھی لے چلئے نا کبھی گوا!''

اور اس سے پہلے کہ مظہر کچھ جواب دیتے امی نے رئیسہ کو حکم دیا، ''رئیسہ چائے لے آؤ۔'' اور وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔ بڑی آپا سے چائے کا کہہ کر وہ دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر ان دونوں کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگی۔ اپنی اس عادت کی وجہ سے اس نے بچپن میں بارہا امی کی مار بھی کھائی تھی مگر کمبخت چھوٹتی ہی نہیں تھی۔ اور پھر مظہر بھائی کی باتیں ۔میٹھی میٹھی اور پیاری! اس نے کسی ایسے ہی صحتمند مہذب نوجوان کا خواب دیکھا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''پھر نوشابہ کا کیا ہوگا؟'' امی کی دھیمی آواز آئی۔

''آپ جانتی ہی ہیں میں اولاد کا خواہشمند ہوں۔ دس سال ہو چکے ہیں۔ اب تو ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا ہے۔ سب کچھ ہے پھر بھی کسی چیز کی کمی ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اسے الگ رکھوں گا۔''

''رئیسہ میری سب سے چھوٹی اور نازوں کی پلی بیٹی ہے۔ پھر ابھی بڑی دو بھی تو بیٹھی ہیں۔'' امی نے دوسرا رخ پیش کیا۔

''میں رئیسہ کو زیادہ بہتر جانتا ہوں۔'' مظہر نے ذرا مستحکم لہجے میں کہا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' امی کی نڈھال آواز آئی، ''آج نہیں تو کل اس کی بھی تو شادی ہونی ہی ہے۔''

''آپ لوگ میرے لئے غیر تو نہیں۔ میں اکبر کو دوکان میں لگوا دوں گا۔ آپ اسے بلوا لیجئے، ورنہ میں اپنی چوک کی دوکان کا کرایہ آپ کے نام لکھ دیتا ہوں۔'' بڑے کاروباری انداز میں کہا گیا۔ رئیسہ کو نتھو بنئے کا خیال آیا۔ وہ بھی تو کچھ اسی انداز میں سودا کرتا ہے۔

پھر جاتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔
''چائے لے جاؤ نا!''، بڑی آپا رئیسہ کو جھنجھوڑ رہی تھیں لیکن جیسے وہ سن ہی نہیں پا رہی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ مظہر بھائی اب عظیم نہیں رہے تھے۔ کانچ کے گڈّے کی طرح نیچے آ رہے تھے..
'کیا میں اپنی پیاری نوشابہ باجی کا گھر اجاڑ دوں گی!...'' رئیسہ نے اپنے آپ سے پوچھا۔
''ہرگز نہیں۔'' رئیسہ نے نہایت جذباتی ہو کر سوچا۔
رات دسترخوان پر کئی قسم کی مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں لیکن کسی نے انھیں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ بہنیں سخت ناراض تھیں مگر امی کے چہرے پر اطمینان بخش کش مکش کی لہریں ابھر اور مٹ رہی تھیں۔
''امی میں شادی نہیں کروں گی۔ بڑی آپا اور چھوٹی آپا دونوں کی کر دیں۔ میں آپ کے پاس ہی رہوں گی۔'' رئیسہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔
''ان دونوں کی شادی مظہر میاں کروا دیں گے۔'' امی نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
''رئیسہ تو پندرہ سال کی بھی نہیں۔ اور وہ پینتیس...... چالیس......''
''چپ کر بڑی! اس کے نصیب کھلے ہیں تو تجھے کیا!'' وہ سختی سے بولیں اور بڑی گنگ رہ گئی۔ یہ تو مطلب نہ تھا اس کا!
''امی مجھے نوشابہ باجی بہت پیاری ہیں۔'' رئیسہ دھیرے سے بولی۔
''اسی لئے تو تجھے اس کی پناہ میں دے رہی ہوں۔''
پھر کوئی کچھ نہ بولا۔
رئیسہ اور مظہر کی شادی ہوگئی۔ نوشابہ پھر گوا سے نہیں لوٹی۔ اس نے کبھی رئیسہ سے

رابطہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔اسے محبت راس نہیں آئی تھی۔رئیسہ اس کے بسائے ہوئے گھر میں رہنے لگی۔اس کی زندگی میں ایک غیر متوقع انقلاب آچکا تھا۔اور رئیسہ کے دل میں اٹھی نفرت کی چنگاری سونے کے ڈھیر تلے دبا دی گئی۔حسن سنور کر اور نکھر گیا۔اس کی دونوں بہنیں کھاتے پیتے گھرانوں میں بیاہ دی گئیں۔امی اکیلی اپنے مکان کے ایک کونے میں پڑی رہتیں لیکن رئیسہ کا دل نہ چاہتا کہ ان کے گھر جائے۔وہ بیچاری تڑپتی رہتیں۔بیٹے کی آس تو کب کی چھوڑ چکی تھیں۔عید برات کے روز تینوں بہنیں اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ماں کے گھر یکجا ہوتیں۔خوب ہنسی مذاق ہوتا۔ بڑی اور منجھلی کے شوہر اپنی بیویوں سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتے۔گپیں ہوتیں لیکن مظہر صرف مسکراتے رہتے۔شاید ان کے سامنے وہ اپنے کو بزرگ محسوس کرتے تھے۔بہنوں کے بچوں کو دیکھ کر رئیسہ کو رشک سا محسوس ہوتا۔وہ بہنوں کے سامنے جان بوجھ کر زیوروں سے لدی پھندی جاتی۔ لیکن ان کے گلوں میں جھولتے بچوں کو دیکھ کر اسے اپنے زیور بوجھ لگنے لگتے۔

پھر رئیسہ نے بناؤ سنگھار کرنا چھوڑ دیا۔سادگی اختیار کر لی۔مظہر جب بھی گھر میں رہتے، رئیسہ انھیں زیادہ تر قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف دکھائی دیتی۔مظہر بھی شاید اس کے جذبات کو سمجھتے تھے۔انھوں نے اس کی اپنی طرف سے بے پروائی کی کبھی شکایت نہیں کی لیکن اس سرد مہری نے انھیں گھلا کر رکھ دیا۔کاروبار میں زیادہ دھیان دینے لگے۔وہ اکثر گھر سے باہر ہی رہتے۔

شام کے پانچ بج رہے ہوں گے۔رئیسہ ٹہلتے ٹہلتے اپنی امی کے گھر کے پچھواڑے نکل آئی۔برآمدے میں منیر بیٹھا کینوس میں قید برفانی منظر میں رنگ بھر رہا تھا۔

''تصویر بناؤ گے میری بھی؟'' وہ منڈیر پر بے تکلفی سے بیٹھ گئی۔

''ہاں کیوں نہیں!'' منیر کی محویت ٹوٹی، ''مصوری میں ایم اے کس لیے کر رہا

ہوں!!‘‘اس نے اپنی ڈگری جتادی۔
’’لیکن معاوضہ کتنا ہوگا؟‘‘
’’جتنا تم چاہوگی۔‘‘ وہ مسکرا کر تصویر مکمل کرنے لگا۔ رئیسہ کی خاموشی سے پلٹ کر بولا، ’’ارے نہیں، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔‘‘
’’میں اپنے بچپن کی دوست سے معاوضہ لوں گا!!‘‘
وہ چونکی۔ ’’مگر محنت تو تم کروگے ہی......اور پھر سامان کا خرچ......!!‘‘
’’پھر!!‘‘
’’معاوضہ بھی لینا ہوگا۔‘‘
’’مغرور‘‘، منیر نے زیرِ لب کہا تو وہ گنگ رہ گئی،’’پھر کل سے یہاں آجایا کروگی؟‘‘
’’اگر مغرور نہ سمجھو تو میرے یہاں آجاؤ۔‘‘
’’بچے ڈسٹرب کریں گے۔‘‘
’’نہیں۔‘‘
تمہارے بچے نہیں؟‘‘
’’نہیں۔‘‘ کہتے ہوئے وہ منڈیر سے اٹھی اور گھر چلی آئی۔
تصویر پر رنگ بکھیرتے بکھیرتے منیر نے رئیسہ کی زندگی کی بے رنگی کو بھی جان لیا۔ بے رنگ اداس زندگی میں اس نے شوخ چٹکیلے رنگ بھرنے شروع کردیئے۔ وہ اپنے پینٹنگ جگت کے تجربے بلکہ دنیا بھر کی دلچسپ خبریں اسے سناتا اور رئیسہ کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر خوش ہوتا۔ رئیسہ نے بھی اپنی ہنسی کی آواز سولہ سال بعد پہلی بار سنی تھی۔ اسے مظہر کا خیال آجاتا۔ وہ بیچارے تو اتنے سالوں میں اس کی پہلی سی کھلی مسکراہٹ کو ترستے رہے تھے۔ وہ منیر کے ساتھ خوش تھی۔

مظہر سنگا پور کے سفر سے لوٹ آئے تھے۔ لان میں مظہر، رئیسہ اور منیر کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ رئیسہ نے اپنے ہاتھوں سے ان کے پسندیدہ قیمے کے سموسے اور پُڈنگ تیار کیے تھے۔

''اس بار آپ کی کمی بہت محسوس ہوئی۔'' رئیسہ نے چہک کر مظہر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ... کیونکہ'' وہ بوکھلا گئی۔ ''بہت اکیلی ہوگئی ہوں نا!''

''وہ تو پہلے بھی تھیں۔'' مظہر نے بے پروائی سے کہا۔

منیر کا ہاتھ پُڈنگ کی طشتری پر رک گیا۔

''اس بار آپ کچھ دنوں کے لیے میرے پاس رہیں۔ ہم شاہ بابا کی درگاہ پر جائیں گے۔''

''کوئی خاص بات؟''

''ہاں منت مانی ہے۔''

''کیسی منت؟''

''ایسے ہی۔ کہتے ہیں، شاہ بابا کے دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔''

''کیا مانگو گی؟''

''ہماری زندگی۔''

''پینٹر صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔'' انہوں نے سادگی سے کہا۔ رئیسہ اور منیر دونوں ہی کے دل کانپ گئے۔

''آپ سنگا پور تھے، تب میں منیر کے ساتھ دو بار شاپنگ کے لئے چلی گئی تھی۔ ڈرائیور نہیں آیا تھا نا!'' رئیسہ نے اطلاع دی۔

''پتہ ہے۔'' مظہر نے معمولی لہجے میں کہا۔
''کیا!!'' رئیسہ کے منہ سے نکلا۔
''مظہر بھائی صاحب! مجھے اجازت دیں۔'' منیر چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیل کر اٹھ کھڑا ہوا بولا، ''ایک ضروری میٹنگ کے لیے پُونا جانا ہے۔''
''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ کے لوٹنے سے پہلے میرا ٹور طے ہے۔ اگلی بار جب لوٹوں تب تک شاید آپ کی کئی تصویریں بن جائیں!''
''خدا حافظ'' منیر نے کہا اور جلدی سے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔
''اچھا منیر صاحب خدا حافظ!'' مظہر نے ذرا زور سے آواز لگائی۔
''چلو گے نا میرے ساتھ؟'' اپنی شادی شدہ زندگی میں وہ پہلی بار مظہر سے اس طرح لبھاؤنے انداز میں بولی تھی۔
''کل جمعرات بھی ہے۔''
''کہا تو منیر کے ساتھ چلی جاؤ۔''
''مگر وہ تو پونا جا رہا ہے۔''
''اس سے کہہ دو کہ پونا پرسوں چلا جائے۔''
''نہیں۔'' وہ منہ پھلا کر بولی، ''آپ کے رہتے میں کسی کے ساتھ کیوں جاؤں؟''
آج وہ اپنی تمام ادائیں ان پر صرف کر رہی تھی۔ پچھلے کچھ برسوں میں مظہر ذیابیطیس سے پوری طرح ڈھل گئے تھے۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو چلی تھی۔ آج وہ اپنے بڑھاپے کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اپنی جوان بیوی کی ناز برداری ان سے نہ کی گئی۔ زندگی کے پچپن سال انہیں بوجھ لگنے لگے۔
''ٹھیک ہے، مجھے پرسوں ٹور پر جانا ہے۔ کل درگاہ لے چلوں گا۔''
''کچھ دن نہیں رہو گے میرے ساتھ؟''

’’میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں۔‘‘

مظہر نے تعجب سے اسے دیکھا۔اتنے سالوں کے انتظار کے بعد رئیسہ کی زبان شہد ٹپکا رہی تھی۔انھوں نے بھرپور نظروں سے جائزہ لیا۔گلابی شلوار قمیص، سچی موتیوں کی مالا، کانوں کے ہیروں کے جھمجھماتے بوندے، سونے میں گُندھے ہوئے ہیروں کے کڑوں والی بانہیں دراز تھیں۔ان کا جی چاہا، زندگی کے وسیع میدان میں پیچھے کی طرف دوڑتے چلے جائیں اور پھر تھک کر پھولوں کے بستر پر سو جائیں لیکن طبیعت میں جو سنجیدگی آ چکی تھی اسے وہ پل بھر میں دور نہ کر سکے۔اڑتی اڑتی خبروں کو وہ رئیسہ کے کچھ میٹھے بولوں میں بھلا بیٹھے۔سال کے آخری مہینے تھے۔اُس سال رئیسہ نے انھیں کہیں جانے نہیں دیا۔اِس دوران منیر کبھی کبھی اس طرف آ نکلتا۔رئیسہ نے اسے پھر کبھی اہمیت نہیں دی۔تصویر بن چکی تھی۔منیر بہت خوشدلی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا۔مظہر بڑے کھلے دل سے اس سے ملتے۔

نعیمہ کی پیدائش پر مظہر نے خوشی کا اظہار کیا۔مٹھائیاں بنٹیں۔خوشیاں منائی گئیں۔نعیمہ ننھے ننھے گھنوں کپڑوں سے لد گئی۔

رئیسہ نے شاہ بابا کے مزار کے لیے گلاب کے پھولوں کی چادر بھجوائی۔

’’سب شاہ بابا کی دعاؤں کا پھل ہے۔‘‘ رئیسہ بار بار کہتی اور مظہر فوراً بچی کو گود میں اٹھا لیتے۔وہ جھٹ اپنی جیب سے نرم برش نکال کر پیار سے اس کے بال سنوارنے لگتے۔

نعیمہ سال بھر ہی کی تھی جب مظہر عمرہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ گئے۔وہاں ایک صبح نماز پڑھتے پڑھتے جانماز پر انھوں نے دم توڑ دیا۔وہ وہیں تدفین پا گئے۔

بہنیں پرسہ دینے آئیں۔اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔امی نے رئیسہ کے ساتھ رہنے کی خواہش ظاہر کی۔لیکن اس کی خاموشی دیکھ کر چپ ہو رہیں۔شاید اسے اپنی

آزادی عزیز تھی۔

دوپہر کا وقت تھا۔نعیمہ دودھ پی کر جھولے میں سو رہی تھی۔عدّت کے چار مہینے، دس دن گزر چکے تھے۔رئیسہ کی نئی پڑوسن اتفاق سے اس کی اسکول کی دوست بھی تھی۔ یہ نئے نئے انداز کے جوڑے بنانے میں ماہر تھی۔ رئیسہ نے کل ہی اس سے ایک نئی طرز کا جوڑا بنانا سیکھا تھا۔اسی کی مشق کر رہی تھی۔ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اوپر اٹھایا ہی تھا کہ اچانک منیر کی آواز آئی۔

''ارے!!'' اُس نے تو آپا کے لئے گیٹ کھلا رکھ چھوڑا تھا۔

''کتنی پیاری بچی ہے۔'' رئیسہ نے لجا کر ہاتھ چھوڑ دیے۔بال کُھل کر بکھر گئے۔

''بہت پیاری! بالکل اپنے ابّا سی، ہے نا!'' منیر نے نعیمہ کو بانہوں میں اٹھالیا۔

''تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ لے آؤں۔'' رئیسہ نے کہا۔

''نہیں بھئی میں تو یونہی۔ پرسہ دینے چلا آیا۔کہو کیسی ہو؟''

''پرسہ......ہوں......'' حقارت سے بھری رئیسہ کی آواز حلق میں پھنسی رہ گئی۔

''کہو کیسی ہو؟ کبھی ہماری بھی یاد آئی؟'' وہ بھی ہلکے سے طنز سے بولا۔

''جناب تو بذاتِ خود ہمارے دل میں رہتے ہیں۔'' رئیسہ نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی۔

''اچھا!'' طنز سے کہا گیا۔

''اچھا بتاؤ کب سے آرہے ہو تصویر بنانے۔'' رئیسہ نے طنز کی پروا نہیں کی۔

''اگلے مہینے شادی ہے اِس جناب کی!''

''منیر، میں تمہارے لیے...!''

''نہیں رئیسہ، میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔کہا بھی تھا، طلاق لے کر میرے پاس چلی آؤ مگر تم نہیں مانیں۔''

''تم جانتے ہو تمہارے گھر والے میرا منہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ تمہاری ماں تو میری دشمن ہی ہو چلی تھیں۔ مجھے کس طرح بدنام کر رہی تھیں!''

''سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ان کو کون سا ہمارے یہاں رہنا تھا۔ گاؤں میں ہی رہتی آئی ہیں مگر تمہیں تو شوہر کی دولت چاہیئے تھی۔ اولاد کی کمی تھی سو پوری ہو گئی۔''

''نہیں منیر یہ بات نہیں۔ میں...... کیا رکھا ہے اب ان باتوں میں!...... چلو بے بی کے ساتھ میری ایک تصویر بنا دو۔''

''نہیں رئیسہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب میں نے مصوری کا پیشہ چھوڑ دیا ہے۔''، وہ دیوار کی پینٹنگ کریدنے لگا۔ کبھی اس نے بڑے پیار سے وہاں گل بوٹے بنائے تھے، ''اور شادی کر رہا ہوں۔''

''ایک دولتمند گریجوئیٹ لڑکی سے؟؟''

منیر خاموش تھا۔

''میری ساری دولت تمہاری ہی تو ہے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''مایوس کیوں ہوتی ہو جان! تم اب نعیمہ کو سنبھالو گی یا مجھے!''

''مگر وہ تو..!''

''اب ان باتوں میں کچھ مزا نہیں رئیسہ! چھوڑو، کچھ اچھی باتیں سناؤ۔''

اس واقعے نے رئیسہ کی امنگوں کا خاتمہ کر دیا۔ وہ محل اچانک کھنڈر میں تبدیل ہو گیا جو اس نے مظہر کی بے پناہ جائیداد، منیر کے پیار اور مظہر کی تیزی سے گرتی ہوئی صحت کی بنیادوں پر تعمیر کیا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی دیوانگی بھری جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ نعیمہ کا وجود اب ایک ایسا پنجرہ بن گیا تھا، جس میں وہ بری طرح محبوس کر دی تھی۔

اور نعیمہ اپنی نانی کے پاس بھیج دی گئی۔

رئیسہ کی زندگی میں انقلاب آ گیا۔ وہ اونچی سوسائٹی کے تقاضوں کو پورا کرنے

لگی۔ بال ترش گئے۔ کلبوں میں شامیں گزرنے لگیں۔ کینوس پر بے شمار رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے اور اس کی زندگی کی گاڑی بڑی تیزی سے راستے بدلنے لگی۔

ایسی ہی ایک پارٹی تھی۔ اپنی نئی دوست مسز فرنانڈیس کے دیور ولیم کی سالگرہ کی پارٹی۔ وہیں رئیسہ کو شہزاد مل گیا۔ اتفاق ہی تھا۔ مسز فرنانڈیس اسی ٹیبل پر بیٹھی تھیں جس پر شہزاد بیٹھا ولیم کے ڈانس کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

''ان سے ملو رئیسہ، دہلی سے بی کام ایم بی اے کر کے لوٹے ہیں۔ نام شہزاد دیکھنے میں شہزادہ، ہمارے ایڈورٹائزنگ بزنس کی جان۔ ماڈلنگ کی دنیا میں بھی دھوم نہ مچائی تو جو کہو وہ ہار دوں!!'' مسز فرنانڈیس نے جوش کے ساتھ متعارف کروایا۔

اور اب چوبیس سالہ شہزاد رئیسہ کا دوست، بہت گہرا دوست اور غم گسار تھا۔

کھنڈالہ میں 'سمر پیلیس'، ایک خوبصورت بنگلہ کرائے پر لیا گیا تھا۔ چوکیدار نے بہت اچھا کھانا بنایا تھا۔ دونوں اپنے اپنے کمروں میں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

شہزاد خود سے بری طرح پریشان تھا۔ منیر کی ملاقات اور زہریلی معنیٰ خیز باتوں سے شہزاد کا موڈ بری طرح خراب تھا۔

''ماں سے جھوٹ بول کر کیوں آیا تھا یہاں؟...... منیر کا رویہ کتنا عجیب سا تھا.. کس بھنور میں پھنس رہا ہے ہوں میں!!''

شام تک شہزاد کا موڈ ٹھیک ہوتا نہ دیکھ کر رئیسہ نے لوناولہ کے 'نیل کمل' تھیٹر میں آن لائن دو ٹکٹیں بک کر لیں۔ لیکن کار کا انجن الیکٹریکل خرابی کی وجہ سے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر کر رہا تھا۔ شہزاد کا موڈ اور خراب ہونے لگا۔

''ٹیکسی لے لیتے ہیں۔ موڈ کا ستیاناس کیوں کریں۔'' رئیسہ نے کہا تو وہ راضی ہو گیا لیکن دستوری گاؤں تک پہنچے ہی تھے کہ ٹیکسی جھٹکا کھا کر رک گئی۔

''ٹائر پنکچر ہو گیا ہے۔ میں ابھی ٹائر بدل دیتا ہوں میم صاحب!.. صرف پانچ

منٹ لگیں گے۔'' ڈرائیور تیزی سے ٹیکسی سے اترتے ہوئے بولا۔

''افوہ!'' رئیسہ کے منہ سے نکلا۔

''لگتا ہے اپنی قسمت میں آج کے روز فلم نہیں!'' شہزاد بیزاری سے ہنسا، ''چلیئے واپس چلتے ہیں۔''

''نہیں شیزو!'' رئیسہ نے عجیب سے فیصلہ کن لہجے میں کہا، ''میں ٹیکسی بدلنا پسند کروں گی۔''

اور کرایہ ادا کرنے کے لئے اپنا پرس کھولا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ چند لمحوں بعد رئیسہ سڑک کنارے برگد کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پانی لاؤں؟'' شہزاد پاس کھڑا پوچھ رہا تھا۔

''شیزو مجھے گھر جانا ہوگا۔''

شہزاد اُس پارہ صفت خاتون کا چہرہ حیرت سے دیکھنے لگا۔

''امی نہیں رہیں۔''

......

''آپ کی بچی آپ کے حوالے کرنے آئی ہوں۔'' چند روز بعد رئیسہ نوشابہ کے گھر میں تھی۔ اس کی گود میں نعیمہ تھی۔ نوشابہ نے درد کے ساتھ رئیسہ کو دیکھا۔

''شاہ بابا کی دعاؤں کا پھل ہے۔'' رئیسہ نے اپنے سر پر پلو ٹھیک کیا۔

''یہ لو وہ خط جو انتقال سے پہلے مظہر نے تمہارے لیے لکھا تھا۔ غلطی سے مکہ سے ان کے سامان کے ساتھ مجھے بھیج دیا گیا۔''

''رئیسہ جان!

جانتی ہو، اللہ تعالیٰ نے دنیا سے معجزے اٹھا لئے ہیں۔ میں تمہیں شاہ بابا کے مزار پر لے گیا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ شوگر کی زیادتی سے آنکھوں کے ساتھ ساتھ میری

فرٹیلٹی ختم ہوچکی

تھی۔ پتہ کر لیا تھا مگر میں نے یہ بات بھی تم سے چھپا لی تھی تا کہ تمہیں شرمندگی محسوس کرنے سے بچا لوں۔اب بھی نہیں چاہتا لیکن آج دل بھاری سا ہے۔تم سے کچھ کہنے کا جی ہے۔ابھی خط پھاڑ کر پھینک دوں گا۔سنو! میں نے تمہیں معاف کیا۔تم اللہ سے معافی مانگ لینا۔

تمہارا بہت چاہنے والا شوہر

مظہر''

خط پڑھ کر رئیسہ نے اسے خاموشی کے ساتھ اپنے پرس میں رکھ لیا۔کچھ دیر دونوں سوکنیں گم سم سی بیٹھی رہیں پھر رئیسہ نے نوشابہ سے نظر ملا کر کہا:

''جانتی تھی،فرٹیلٹی کلینک بھی تو ہیں......ایک بچے کی خواہش تھی......کیا تھا؟ یا نفرت؟ میں کس سے بھاگتی رہی؟ نفرت کرتی رہی؟ کس سے؟ آپ سے؟ اپنے آپ سے؟ اپنی امی سے؟ مظہر سے؟ کون سا عدم تحفظ کا احساس تھا؟ کیوں خود کو ذلیل کیا؟۔۔کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں، پیاری نوشابہ باجی؟؟؟''

وہ نوشابہ کے گھٹنے سے لگی ہوئی تھی۔نعیمہ زمین پر رینگتے رینگتے اندرونی دروازے کی دہلیز تک پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

☆......رتن سنگھ کنول

زندگی

کُتا بھونکا اور زندگی بدِک گئی............

زندگی اپنے کھلونوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنے کھلونے اپنے اِرد گِرد پھیلا کے رکھے تھے۔ کھلونے وہیں چھوڑ کر وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ کُتا اب لگاتار بھونکنے لگا۔ یہ بھونک روزمرہ کی بھونک سے کچھ ہٹ کر تھی۔ اس میں فکر، خوف اور غصہ شامل تھا۔ خوف زدہ زندگی نے سب کی طرف ایک نظر دوڑائی، تھوڑی دیر رکی، سوچا اور پھر لپک کر باپ کی گود میں جا کر بیٹھ گئی۔

ایسا اکثر تب ہوتا ہے جب کسی جنگلی جانور کی بُو پا کر بستی کے کُتے بھونکنے لگتے ہیں۔ یہ جنگلی جانور خوراک کی تلاش میں انسانوں کی بستی کا رُخ مجبوری میں ہی کرتے ہیں۔ کُتے جہاں خود چوکنا ہو جاتے ہیں وہیں بستی کے لوگوں، یعنی اپنے مالکوں کو بھی خبردار کر دیتے ہیں۔ اس وقت ان پر خطرہ بھی منڈلاتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی ان کی جان بھی چلی جاتی ہے۔ لیکن اپنے فرض سے مُنہ نہیں موڑتے۔ وفاداری کی نظیر ہیں یہ کُتے۔ نان کے دو ٹکڑوں کی خاطر نہ دِن کا چین ہے اور نہ رات کا آرام۔ بستی کے لوگوں کا بھی یہی کہنا ہے۔

''پاپا کُتا کیوں بھونک رہا ہے؟''

زندگی نے باپ کی گود میں دبک کر پوچھا۔ اب خود کو محفوظ سمجھ رہی تھی لیکن

باہر کے حالات سے بھی بے فکر نہیں تھی۔

''بلی کو دیکھا ہوگا، ڈرو مت!''

''پاپا نہیں ریچھنی ہوگی!''

''ریچھنی تو اُس دن ماڑ ڈالی گئی تھی، تمہیں نہیں معلوم؟''

زندگی کچھ نہ بولی......ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

اُس کو باپ کی کہی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اندر ہی اندر سوچنے لگی۔ جب سے ریچھنی (براہنی) نے مویشیوں سے بھرے مویشی خانہ سے چھ مہینے کا نرم و نازک بچھڑا اٹھا لیا تھا زندگی تب سے کتوں کے بھونکنے پر ڈر جاتی تھی۔ اِس دن بھی کُتا اسی شدت سے بھونکا تھا۔ پھر بعد میں جو کچھ ہوا وہ سب زندگی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لوگ بڑے بڑے ڈنڈے لاٹھیاں، کلہاڑیاں، نیزے اور بھالے اٹھا کر پیچھے دوڑے تھے۔ ریچھنی تھی کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ ہاں لہولہان بچھڑے کو گھسیٹنے کی بجائے کندھے پر دھر لیا تھا اور دو ٹانگوں پر لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگی تھی۔ دائیں بائیں جھومتی ہوئی۔ مزاحمت کر رہے لوگ جیسے کیڑے مکوڑے تھے اس کے سامنے اور بچھڑے کو نوچ کھانا جیسے اُس کا حق......۔

زندگی کو اس دن باپ کے ہاتھوں جھٹکایا مُرغا بھی یاد آیا، جو بنا سر کے تڑپ رہا تھا اور شہ رگ سے ''ہو ہو'' کی آواز کے ساتھ خون کے بُلبُلے اُٹھ رہے تھے۔ زندگی کے خیال میں بچھڑے کا حشر بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریچھنی بچھڑے کو لے کر بہت دور چلی گئی۔ جس نے بھی بچھڑے کو چُھڑانے کی کوشش کی اس کو دانت دکھا کر، غُرا کر بھگا دیا۔ ڈر کے مارے باقی مویشی پگے تڑا کر بھاگ گئے۔

گائے بچھڑے کی جُدائی اور صدمے میں پاگل سی ہوگئی۔ بنا کچھ کھائے مارے مارے دھرتی کو سونگھتی ہوئی اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ زندگی کو بھی بچھڑا بہت

عزیز تھا۔ تھوتھنی اٹھائے دوڑے دوڑے آتا، سونگتا، چاٹتا اور زندگی بھی اس کو اپنی بانہوں میں لے کر چومتی تھی۔ مخمل جیسے نرم گرم بالوں پہ اپنے رُخسار رکھتی اور محفوظ ہوتی۔

''پاپا ریچھنی نے بچھڑا ہی کیوں اُٹھا لیا تھا؟''

زندگی کے اندر سے ایک ہُوک اُٹھی اور پوچھا۔ ''چھوٹا تھا نا'' باپ نے زندگی کی طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کمزور!''

''باقی؟''

''بڑے تھے...... طاقت والے......''

زندگی نے بھی ''پاپا'' کی طرف دیکھا اور آنکھیں موندلیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

کچھ دیر کے بعد پھر بولی:

''وہ ہمارے گھر کے اندر بھی تو آسکتی تھی؟ اور مجھے......؟''

''نہیں بیٹی! اُس کے اندر آنے کی مجال نہیں!'' باپ نے فخر سے کہا۔

''دوسرے بڑے جانور بھی نہیں جو اس سے بھی زیادہ طاقتور ہیں''۔

''کوئی بھی نہیں؟'' زندگی کو یقین نہیں آرہا تھا۔

''جسم کی طاقت سے عقل کی طاقت بڑی ہوتی ہے...... آدمی سے کوئی بھی جانور بازی نہیں لے سکتا!''

''ٹھیک ہے...... پھر چیتا پچھلے سال اس عورت کو کیوں کھا گیا تھا؟''

زندگی کو باپ کی یہ دلیل ہضم نہیں ہوئی، اس لئے تکرار جاری رکھی۔

''وہ گھر میں نہیں تھی۔ باڑی سے اکیلے سبزی لینے گئی تھی...... چیتا باڑی میں

سو یا تھا......ڈسٹرب ہوااور غصے میں آ گیااور جھپٹ پڑا''۔

''اچھا......وہ جنگل سے کیوں آیا تھا باڑی میں سونے کیلئے؟''

''زندگی بس! اب تو میرا سر مت کھا۔ جا اپنا کام کر......''

شاید باپ کے پاس زندگی کے سوال کا جواب ہی نہیں تھا یا اب وہ اوب گیا تھا۔

زندگی کو باپ کا یہ سلوک بھایا نہیں......وہ ناراض ہوکر، آنکھیں ملتی ہوئی ماں کے پاس چلی گئی۔ ماں نے پچکارا، دُلارا اور پوچھے گئے سوال کا جواب بھی دیا:

''پتہ ہے چیتا جنگل چھوڑ کر بستی یا باڑی میں کیوں آیا تھا؟ کیونکہ آدمی نے جنگل سے بہت سارے پیڑ پودے کاٹ ڈالے ہیں۔ چیتے، ریچھ اور دوسرے کئی جانوروں کے گھر برباد کردیئے ہیں۔ ان کا کھانا بھی جنگل سے ختم ہوگیا ہے۔ اوران جنگلی جانوروں کا انسانی بستیوں یا باغوں، باڑیوں کی طرف رخ کرنا قدرتی عمل ہے ......لگ گیا پتا؟''

اب باہر بہت سارے کُتے اکٹھے ہو گئے تھے اور ایک ساتھ بھونک رہے تھے۔ شور اور بھی بڑھ گیا تھا۔ رات کے سناٹے میں شور بہت خوفناک لگتا تھا۔ زندگی کا دھیان باہر کی اور چلا گیا۔ پتا نہیں اس کو کیا سوجھی کہ ماں کی گود سے اُتری اور پھر باپ کی گود میں جا بیٹھی۔ باپ نے اب غصہ تھوک دیا تھا۔ اس نے زندگی کا سر اپنے سینے پر رکھ دیا اور انگلیاں بالوں میں ڈال کر سہلانے لگا۔ زندگی کو بھی باپ کی چوڑی چھاتی پہ سکون سا مل رہا تھا۔ دھڑکتے دل کی آواز سُن کر اچانک بول اُٹھی تھی۔

''پاپا کا دل کتنا بڑا ہے''۔

باپ سُن کر مُسکرایا......ماں بھی چپُ نہ رہ سکی......اس کو بھی مذاق سوجھا۔

''بڑے دل والے بہادر ہوتے ہیں۔''

زندگی نے باپ کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو دوبارہ پوچھنے پر تُل گئی۔

''پاپا آپ بہادر ہیں؟''

''ہاں بیٹی میں بہادر ہوں۔''

''آپ چیتے کو مار سکو گے؟''

''ماردوں گا۔''

''کیسے''

''جس طرح مُرغی کو مارا تھا اُس دن''

''چھی چھی! گندے پاپا......!!!''

کتے دیوار پھلانگ کر اندر آ گئے۔زندگی خاموش ہوگئی۔کچھ دیر بعد باپ کی چھاتی سے سر اُٹھایا اور سونے لگی۔

''پاپا ریچھنی!''

''میں نے کہا نا ریچھنی مار ڈالی تھی،اُس دِن''......

''وہ تو بچھڑا اُٹھا کر بھاگ گئی تھی!''

''دوسرے ہی دن مار ڈالا تھا اُسکو''

''کیسے؟''

''عقل کی طاقت کے ساتھ!

باپ اپنے آپ کو عقلمند اور طاقت ور ثابت کرنا چاہتا تھا۔زندگی کو''ریچھنی'' کے مارے جانے کا کوئی علم نہیں تھا۔باپ نے زندگی کے شک کو دور کرنے کیلئے تفصیلاً کہا:

''......پہلے دن جتنا گوشت کھانا تھا کھالیا''

''بچھڑے کا؟''

''ہاں بچھڑے کا......باقی جو بچا اس کو گھاس کے نیچے چُھپا کر رکھ دیا تھا''

''بچوں کو نہیں کِھلایا؟''

زندگی غور سے سُن رہی تھی اور بیچ بیچ میں بات کاٹ کر پوچھ لیتی۔

''ہاں کِھلایا......'' باپ بھی ٹھسکے سے جواب دیتا۔''ماں جو تھی۔۔تمہیں مما نہیں کِھلاتی؟'

زندگی نے ہاں میں سر ہلایا پر بے دلی سے۔باپ پھر گویا ہوا:

''پھر بچے لیکر ریچھنی کہیں دور چلی گئی۔ میں نے بچھڑے کا آدھا کھایا ہوا جسم دیکھا۔گھاس پھوس کے تنکوں کے نیچے چُھپا کر رکھا ہوا تھا۔دوسرے دن کیلئے۔

خوبصورت تھوتھنی ابھی جوں کی توں تھی، پیاری پیاری ننھی سی۔ مجھے بہت دُکھ ہوا۔جیسے کھولتا ہوا تیل جگر پر گرا۔ریچھنی پر بہت غصہ آیا۔اس کو مارنے پر تلا۔ بندوق تو تھی نہیں اور نہ ہی کوئی اور ہتھیار۔ایک ترکیب سوجھی۔۔۔۔باقی بچے گوشت کے ساتھ زہر ملاِ دیا اور اسی طرح رکھ دیا جیسے ریچھنی نے رکھا تھا۔گھاس پھوس کے نیچے۔دوسرے دن ریچھنی آئی، گوشت کھایا اور وہیں چت ہوگئی'' ہوئی نا آدمی کی عقل کی طاقت؟''

زندگی نے ایک لمبی سانس بھری اور پوچھا......

''ریچھنی کے بچے ریچھنی کا انتظار کرتے رہے ہونگے؟''

''ہاں، وہ بھی مر گئے ہونگے بھوکے پیاسے ماں کا انتظار کرتے کرتے۔۔''

باپ نے فخر سے کہا اور ایک قہقہہ لگایا۔زندگی نے باپ کے کھلے مُنہ کی طرف دیکھا۔ اس کو لگا جیسے چیتے نے نوکیلے دانتوں والا مُنہ زندگی کو کھانے کیلئے کھولا ہو۔وہ باپ کی گود سے کود کر ماں کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

☆......وحید احمد قمر

شہزادہ

نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں سرمئی بادل تیر رہے تھے۔اور سورج بھی اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔تاہم کبھی کبھی بادل کا کوئی بڑا ٹکڑا سورج کے سامنے آ کر وادی کے کچھ حصے پر چھاؤں کر دیتا۔لیکن جب کچھ دیر بعد ہوا بادل کے اس ٹکڑے کو دور اڑا لے جاتی تو وادی پھر سورج کی تیز کرنوں میں نہا سی جاتی۔تا حد نگاہ سرسبز ٹیلے اور میدان تھے۔اطراف میں جنگلی جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات تھی۔کہیں کہیں کھیت اور باغات بھی تھے۔اور ان کے بیچوں بیچ آڑھی ترچھی پگڈنڈیاں دور دور تک جاتی نظر آتیں۔ایسی ہی ایک پگڈنڈی پر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی بڑھی چلی جا رہی تھی۔جس راستے پر وہ چل رہی تھی اس کے دونوں جانب خوش رنگ پھولوں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔جن کی خوشبو فضا کو معطر کیے ہوئے تھی۔وہ چلتے چلتے رکی اور پگڈنڈی کو چھوڑ کر پھولوں کے بیچ راستہ بناتی گھنے درختوں کے درمیاں اس جگہ جا پہنچی، جہاں ایک پہاڑی جھرنا بہہ رہا تھا۔جس کا پانی پتھروں پر اچھل اچھل کر عجب دلکش آواز پیدا کرتا نیچے وادی میں گر رہا تھا۔وہ چند لمحے کھڑی ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اس نے وہ بڑی سی سیاہ چادر اتار کر ایک پتھر پر رکھ دی۔جسے اب تک سر تا پا اوڑھے ہوئے تھی۔یہاں درختوں کی چھاؤں گھنی تھی۔سورج کی روشنی ان درختوں کی شاخوں سے چھن چھن کر اس کے چہرے اور جسم پر پڑ رہی تھی۔وہ دلکش خدوخال اور متناسب

جسم کی مالک ایک خوبصورت لڑکی تھی۔اس نے گہرے نیلے چمکدار رنگ کی قمیض اور ہلکے گلابی رنگ کی شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔ جب کہ گلابی رنگ کا ہی دوپٹہ اس کے گلے میں تھا۔اس کے بال بہت لمبے تو نہیں مگر گھنے اور چمکدار تھے جو اس کے دونوں شانوں سے ڈھلکتے ہوئے سینے تک آ گئے تھے۔ وہ کچھ دیر درختوں کے درمیاں چلتی رہی پھر جھرنے کے قریب ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔اس کی نگاہیں مسلسل اپنی کلائی کی گھڑی پر تھیں۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے چہرے پر اضطراب کی کیفیت نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ جب کافی دیر یونہی گزر گئی تو اس کے چہرے پر اضطراب کی جگہ پریشانی نے لے لی۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹتی ہوئی اٹھی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ وہ تھکے تھکے اور بوجھل قدم بڑھاتی اوپر کی طرف چلدی۔اسی وقت اچانک ایک درخت پر سے ڈھیروں پھولوں کی بارش سی اس کے وجود کو معطر کر گئی۔آن کی آن میں ان گنت پھول اس پر گرتے چلے گئے۔اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔خرم شہزاد کا مسکراتا چہرہ ٹہنیوں کے بیچ نظر آیا۔اس نے خفگی سے اپنا رخ دوسری جانب کر لیا۔ وہ درخت سے چھلانگ لگاتا ہوا اس کے قریب آیا اور ایک گھٹنا ٹیک کر اس کے سامنے جھک گیا۔ پھر لڑکی کے ہاتھ کو نزاکت سے اپنی انگلیوں میں تھاما اور اس کی پشت پر ایک طویل بوسہ دیا۔ وہ مصنوعی خفگی سے اسے دیکھتی رہی۔ مگر کچھ نہ بولی۔ کچھ لمحات اسی طرح گزر گئے۔آخر خرم نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

اتنی خفا کیوں ہو فاخرہ؟

ارے۔۔جیسے تم جانتے ہی نہیں۔ پورا ایک گھنٹہ لیٹ آئے ہو۔اور یہ پہلی بار نہیں ہے۔تم نے تو عادت ہی بنا لی ہے۔ ہمیشہ انتظار کرواتے ہو۔جان لیوا انتظار۔

فاخرہ منہ پھلائے ہوئے بولی

تمھارے لیے پھول اکٹھے کرتے کرتے دور تک نکل گیا۔اور پھر ایک گھنٹہ

کچھ ایسی بھی تاخیر نہیں کہ اتنا ناراض ہوا جائے۔خرم شہزاد کی آواز میں کسی قدر لاپروائی تھی۔

تمھارے لیے نہ ہوگی تاخیر۔مرد ہونا۔کسی کو جواب دہ نہیں ہو۔میں چھپتے چھپاتے آتی ہوں۔محدود وقت ہوتا ہے میرے پاس۔جس کا ایک ایک لمحہ میں تمھارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔مگر آج۔۔میں ابھی واپس جاؤں گی۔اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے......

ارے ارے، اتنا غصہ۔رکو۔یوں چھوڑ کے نہ جاؤ۔اتنے دن بعد تو ملے ہیں۔خرم اس کے پیچھے چلتا ہوا بولا۔

نہیں رکوں گی۔آج ملے بغیر واپس جاؤں گی تو آئندہ تم کبھی لیٹ نہ آؤ گے۔وہ درختوں کے درمیاں تیز تیز چلتی ہوئی بولی۔

اور اگر میں بڑھ کر تمھیں روک لوں تو؟

روک سکتے ہو تو روک لو۔میں چلی۔فاخرہ درختوں کے درمیان بھاگتے ہوئے بولی۔کالج میں دوڑ کے مقابلوں میں ہمیشہ اوّل آتی رہی ہوں۔تم مجھے نہ پکڑ پاؤ گے۔

خرم چند لمحے اسے اپنے سے دور جاتے دیکھتا رہا۔پھر اس کے پیچھے دوڑا۔اور جلد ہی اس کے عقب میں جا پہنچا۔ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنا چاہا، اسی لمحے پاؤں الجھے اور وہ نیچے آ رہا۔

فاخرہ نے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔رکی اور چڑانے والے انداز میں بولی۔میں نے کہا تھا نا کہ تم مجھے نہ پکڑ سکو گے۔پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس کے قریب آئی اور شوخی سے بولی۔چوٹ تو نہیں آئی میرے شہزادے کو۔

خرم نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے یوں گرایا کہ فاخرہ کے جسم کا سارا بوجھ اس پر آ رہا۔اس کا چہرہ خرم کے مقابل تھا اور وہ اس کے سینے سے لگی گہری گہری سانسیں لے

رہی تھی۔ وہ چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر فاخرہ نے اپنا ایک ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیا۔

کچھ وقت یونہی گزر گیا پھر خرم نے اسکا ہاتھ اپنی آنکھوں سے ہٹایا اور اس کے دلکش چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

تم نہیں تھیں تو دل اک شہر وفا تھا جس میں
تمھارے ہونٹوں کے تصور سے تپش آتی تھی

خرم اس کے سرخ ہونٹوں پہ جھکا۔ فاخرہ نے ہاتھ اپنے اور اس کے لبوں کے درمیاں رکھ لیا۔ خرم محویت کے عالم میں کہتا رہا۔

تمھارے انکار پہ بھی پھول کھلے رہتے تھا
تمھارے انفاس سے بھی شمع جلی جاتی تھی
دن اس امید پہ کٹتا تھا کہ دن ڈھلتے ہی
تم نے کچھ دیر کو مل لینے کی مہلت دی ہے

وہ شعر پڑھتے پڑھتے رکا اور فاخرہ کے گالوں کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔
پھر اگلا شعر پڑھا

انگلیاں برق زدہ رہتی تھیں جیسے تو نے
اپنے رخساروں کو چھونے کی اجازت دی ہے

فاخرہ کھلکھلا کر ہنسی اور دیر تک ہنستی رہی۔ پھر بولی۔ مصطفیٰ زیدی کی روح تڑپ اٹھی ہوگی اپنی نظم کی یوں مرمت ہوتے دیکھ کر۔ سچ بہت کیوٹ ہو تم۔

خرم شہزاد کچھ دیر خاموشی سے اس کے چہرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا اگر میں شاعر یا ادیب ہوتا تو خود تم پر نظمیں کہتا۔ تمھارے عارض و رخسار کو

غزل میں برتتا، تمھارے شیریں لبوں اور سحر انگیز آنکھوں کے افسانے لکھتا۔ تمھاری گھنی زلفوں اور۔۔ فاخرہ نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ بس۔ اور کچھ نہیں۔ تم بہک رہے ہو۔ جب کہ میری سلطنت میں بہکنا منع ہے شہزادے۔

اسی وقت زور سے بادل گرجے اور ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ چلو بھاگ کر کسی سائباں تلے پناہ لیتے ہیں۔ ورنہ بری طرح بھیگ جائیں گے۔

نہیں، خرم شہزادنے اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر لیے۔ بری طرح بھیگ جائیں، پرواہ نہیں۔

تمھیں پرواہ نہ ہوگی۔ مجھے ہے۔ شام سے پہلے گھر پہنچنا ہے۔ چھوڑو مجھے، جانے دو۔ خرم نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ فاخرہ کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ اور تنگ کر دیا۔

ارے۔ بارش تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اور تمھیں اٹھکیلیاں سوجھی ہیں۔ ہم شرابور ہو جائیں گے۔ میری کمر چھوڑو پلیز۔

پہلے میری ایک فرمائش پوری کرو۔ اپنے بھیگتے لبوں کو چھونے کی اجازت دے دو۔

ہرگز نہیں۔۔۔۔ ایسا ویسا کچھ نہ ہوگا۔ بس اب چھوڑو مجھے۔ میرے بال بھیگ رہے ہیں۔ دوپٹہ جانے کہاں گیا۔ اور چادر تو جھرنے کے قریب رکھ آئی تھی۔ پھر اس نے ایک جھٹکے سے خود کو الگ کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری شامت آجائے گی آج، سارے کپڑے بھیگ گئے۔ افففف، شہزادے۔ تم بہت ضدی ہو۔

یہاں سے میری حویلی قریب ہے۔ پہلے وہاں چلتے ہیں۔ جب بارش رک جائے گی تو میں تمھیں تمھارے گھر تک چھوڑ آؤں گا۔

نہیں شہزادے، بہت دیر ہو جائے گی۔ بس میں اب جاتی ہوں۔

اگلی ملاقات کا تو بتاتی جاؤ۔

فون کروں گی۔ اور تم بھی جلد اپنی حویلی پہنچو۔ بارش تیز ہوتی جا رہی ہے......خدا حافظ

......

فاخرہ حویلی کے طویل وعریض صحن سے گزر کر جونہی برآمدے میں داخل ہوئی۔ اس کی نظر پھوپھی جان پر پڑی۔ جو تخت پوش پر بیٹھی اسے پر تشویش نظروں سے دیکھ رہیں تھیں۔

فاخرہ بیٹا۔ آج بہت دیر کر دی۔ موسم بھی خراب ہے۔ میں تمھارے لیے بہت پریشان تھی۔

پھوپھو جان۔ کالج کے بعد میں لائبریری چلی گئی تھی وہاں پرسکون ماحول میں بیٹھ کر اپنے ناول کا ایک باب مکمل کیا۔ پھر بارش شروع ہوگئی تو وہیں بیٹھی رہی کہ بارش رکے تو گھر جاؤں۔

فون کر دیا ہوتا بیٹا۔ شکر ہے تمھارے بابا گھر پر نہیں ہیں۔ ورنہ اک ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ وہ پہلے ہی تمھارا گھر سے نکل کر جاب پر جانا کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔

ری پھوپھو جان۔ فون چارج نہ تھا۔ آئندہ خیال رکھونگی۔ بابا سائیں کہاں گئے ہیں۔

زمینوں پر۔ شاید کل ہی واپسی ہو۔ اچھا تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔

مجھے بھوک نہیں ہے پھوپھو جان۔ رقیہ آپا اور ساجدہ نے کھا لیا کھانا؟۔

کہاں بیٹا جی۔ رقیہ کو آج پھر دورہ پڑا ہے۔ بڑی مشکل سے اسے سنبھالا اور دوا پلائی۔ سو رہی ہے اپنے کمرے میں۔ اور ساجدہ نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ بس اک سلمٰی نے میرا ساتھ دیا کھانے پر۔

تو تم بالکل کچھ نہ کھاؤ گی؟

نہیں پھوپھو، بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ اچھا میں رقیہ آپا کو دیکھ لوں۔ فاخرہ اندرونی راہداری کی طرف مڑی۔

سنو۔ پھوپھی جان کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک لیے۔

وہ مڑی۔ اور استفہامیہ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔

ادھر آؤ۔ میرے پاس آ کر بیٹھو۔

فاخرہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب تخت پوش پر آ کر بیٹھ گئی۔ پھوپھی جان کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں دنیا جہان کا پیار سمٹ آیا تھا۔

بیٹا۔ بابا سائیں تمھاری شادی کرنا چاہتے ہیں؟

فاخرہ نے خالی خالی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ اور آہستگی سے بولی

پھوپھو جان۔ پہلے رقیہ آپا اور ساجدہ کی شادی ہونی چاہیے۔

رقیہ سے اب کون شادی کرے گا۔ اس کی بیماری کا سارے خاندان کو علم ہے۔ اور ساجدہ سے میں پوچھ چکی ہوں۔ وہ وہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جو رشتہ تمھارے بابا نے بتایا ہے۔

اور بابا سائیں نے اس کا انکار تسلیم کرلیا ہے؟

ہاں۔ وہ نہیں چاہتے کہ تم بہنوں کی مرضی کے بغیر رشتے طے کریں۔

یہ انقلاب کب آیا ان کی سوچ میں؟ جب یونیورسٹی کے زمانے میں میرے رشتے آتے تھے تو وہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی انکار کر دیتے تھے کہ ہم خاندان سے باہر شادی نہیں کریں گے۔

تم اپنے بابا سے شاکی ہو؟

نہیں پھوپھو، میں شاکی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے بہت دکھ ہے۔ جب وقت تھا

اور اچھے رشتوں کی اک قطار لگی ہوئی تھی میرے لیے۔ تب صرف اس لیے کہ وہ رشتے ہمارے ہم پلہ نہ تھے۔ ان کو ٹھکرا دیا گیا۔

نادانی کی باتیں نہ کرو۔ تمھارے بابا تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے جو فیصلے کیے تمھارے بھلے کے لیے کیے۔

جی۔ جیسے آپ کا بھلا کیا انہوں نے۔

فاخرہ۔۔ میں کسی کو قصوروار نہیں ٹھراتی۔ میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہ تھی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا۔ تمھاری ماں کی وفات کے بعد تم لوگوں کو سنبھالنے کے لیے بھی تو کسی کی ضرورت تھی نا۔ خدا نے مجھ سے یہ کام لیا۔

اچھا پھوپھو جان۔ میں ایک نظر رقیہ آپا کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ فاخرہ اٹھتے ہوئے بولی۔

یہ نہ پوچھو گی کہ کس نے رشتے کا پیغام بھیجا ہے؟

نہیں، مجھے اندازہ ہے کہ کوئی بے جوڑ رشتہ ہی ہوگا۔

بے جوڑ نہیں ہے۔ ہمارے ہی خاندان کے معزز اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ شہاب الدین خان۔

وہ شہاب الدین خان، جنہیں میں آج تک انکل کہتی آئی ہوں۔ پھوپھو۔۔ خدا کے لیے۔ یہ آپ کے نزدیک بے جوڑ رشتہ نہیں ہے۔

دیکھو۔ تم تیس سے اوپر ہو چکی ہو۔ اب ایسے رشتوں کا آنا غنیمت جانو۔

فاخرہ کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے۔ چند ایک گالوں پر بھی ڈھلک آئے۔ جنہیں ہتھیلی سے پونچھتے ہوئے وہ اندرونی کمروں کی طرف بڑھتی چلی گئی

......

وہ بستر پر دراز کھڑکی سے نظر آتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں بلا کی اداسی جب کہ چہرے پر گہری یاسیت طاری تھی۔وہ کافی دیر خالی الذہنی کی کیفیت میں چاند کو تکتی رہی۔ پھر اس نے ایک طویل سرد آہ بھرتے ہوئے کروٹ لی۔اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ وقت گزر گیا۔اچانک اسے ایک کھٹکے کی آواز بہت قریب سے سنائی دی۔اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔خرم شہزاد کھڑکی کے قریب کھڑا اسے پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اوہ۔شہزادے تم۔۔۔اس وقت یہاں۔اوہ......اوہ......کیسے یہاں تک پہنچے۔ وہ تیزی سے بستر سے اٹھی اور خرم کے قریب پہنچ گئی۔ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی اور مضطربانہ انداز میں اس کی طرف مڑی۔وہ سینے پر ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

تم حویلی کے اندر کیسے آئے۔اور پھر میرے کمرے تک......

بس آ گیا۔ یہ اہم ہے کہ میں اس وقت تمھارے روبرو ہوں۔کیسے آیا۔۔ کیونکر آیا۔اہم نہیں۔

لیکن شہزادے، حویلی کی دیواریں بہت اونچی ہیں نا۔ پھلانگ کر آئے ہو۔؟؟ تمھیں چوٹ تو نہیں آئی......وہ اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کو چھو کر بولی

چھوڑو یہ سوالات، یہ بتاؤ۔ اسقدر اداس کیوں ہو۔شام کو تو بالکل ٹھیک تھیں۔

میں نے تو آج سوتے وقت کوئی میسج بھی نہیں کیا تمھیں؟ پھر تمھیں کیسے پتہ چلا کہ میں بے حد اداس ہوں۔

میرے دل نے کہا......اور تم سونے سے پہلے ہمیشہ مجھے میسج کر کے سوتی ہو۔مگر آج شام سے تم آف لائن ہو۔میں نے کال بھی کی تھی مگر شاید تمھارا فون ہی بند

ہے۔ مجھے سخت پریشانی ہوئی۔ پس میں نے فیصلہ کیا کہ ہرصورت تم تک پہنچا جائے۔ آہ۔ تمھیں میرا کتنا خیال ہے۔ آہ، آہ۔ میرے دل کی سلطنت کے شہزادے، میرے محبوب۔ میرے ہمدم، میرے دوست۔ فاخرہ والہانہ انداز سے آگے بڑی اور اس کے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

خرم نے دونوں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کیے اور اس کے سر پر اپنی تھوڑی ٹکا دی۔ وہ کافی دیر اس کے سینے سے لگی روتی رہی۔ پھر سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ خرم نے دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ وہ اپنی انگلیوں سے اسکے گالوں پر ڈھلکے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روتی بسورتی لڑکی وہی ہے جو شام کو جنگل میں ہرنی کی طرح قلانچیں بھر رہی تھی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ تم پہلی بار میرے کمرے میں آئے ہو۔ کیا سوچتے ہو گے کہ میں نے تمھاری کوئی خاطر تواضع کرنے کی بجائے رونا دھونا شروع کر دیا ہے۔ یہ بتاؤ کیا لاؤں تمھارے لیے۔ چائے، جوس یا کچھ کھانے کے لیے؟

نہ پیئوں گا کچھ اور نہ کھاؤں گا ہی۔ تمھیں دیکھنے کی پیاس ہے، تم سے بات کرنے کی بھوک ہے۔ وہ پھر ہنسی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی، چلو آؤ اس طرف بستر پر چل کر بیٹھتے ہیں۔

نہیں تم اپنے بستر پر بیٹھو۔ میں رائٹنگ ٹیبل کے قریب پڑی کرسی اس طرف کھسکا کے بیٹھ جاتا ہوں۔

ارے نہیں، وہ کرسی آرام دہ نہیں ہے۔ تھک جاؤ گے۔ تم بستر پر ہی بیٹھو گے۔ یہ کہہ کر فاخرہ نے اسے بستر پر دھکیل دیا۔ خرم کے لیے اس کی یہ حرکت غیر متوقع تھی۔ وہ کمر کے بل بستر پر گرا۔ ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ فاخرہ نے اپنے بدن کا سارا

بوجھ اس پر ڈال دیا۔ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ خرم نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک طوفان بپا تھا۔ اس نے اپنے بالوں کو ربن کی قید سے آزاد کیا اور گھنیری زلفیں خرم کے چہرے پر بکھیر دیں۔ پھر خمار آلود لہجے میں بولی۔ تم میری طرف بڑھنے سے پہلے اجازت لیا کرتے تھے نا۔ اور میں منع کر دیتی تھی۔ لو تمھیں اجازت ہے۔ آج جی بھر کے میری زلفوں سے کھیلو۔ میری جلتے ہوئے چہرے پہ اپنا چہرہ رکھ دو۔ اے میرے پیار کے خوابوں کے حسیں شہزادے۔ مجھ کو اپنے ہونٹوں سے چھو لو............ میری نس نس میں شرارے بھر دو............ تم خاموش کیوں ہو۔ کچھ بولتے کیوں نہیں۔

فاخرہ۔ تم ہوش میں نہیں ہو۔

میں اس وقت ہی تو ہوش میں ہوں شہزادے۔ میں نے جوانی کے بہترین سال اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹتے گزارے۔ خوابوں میں بھی تمھاری پیش قدمی کو روکتی رہی۔ کیا ملا مجھے، تنہائی کی طویل سیاہ راتیں؟............ اذیت............ بے بسی...... بیچارگی۔

آج کی رات...... میں اپنے آپ کو نہیں روکوں گی۔ میرے محبوب۔ میرے ہمدم۔ مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لو۔ اپنی گرم سانسوں کو میری سانسوں میں گھل مل جانے دو۔ میرے سلگتے ہوئے ہونٹوں پہ اپنے لب رکھ دو۔ میں دل و جان سے تمھاری ہوں۔ میرے مالک، میرے ساتھی۔

تم چپ کیوں ہو۔ کوئی بات کیوں نہیں کرتے...... تمھاری آنکھیں بھی بند ہیں۔ اور تمھارا جسم سرد ہو رہا ہے۔ شہزادے آنکھیں کھولو۔ مجھ سے بات کرو...... شہزادے...... شہزادے......

فاخرہ کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔۔۔ اس کی پھوپھو فجر کی نماز کے لیے اٹھی

تھیں۔شورسن کروہ تیز تیز قدموں سے چلتی فاخرہ کے کمرے میں پہنچیں۔فاخرہ تکیے کو اپنے سینے سے بھینچے چیخے چلی جارہی تھی۔

شہزادے۔۔۔شہزادے۔۔۔شہزادے

☆☆☆

تبصرۂ کتب

(۱)

افسانوی مجموعہ : گمشدہ دولت

افسانہ نگار : طارق شبنم

مبصر : ڈاکٹر توصیف احمد ڈار

وادیٔ کشمیر کے معاصر اردو افسانہ نگاروں میں طارق شبنم ایک اہم نام ہے۔ کشمیر اور بیرون کشمیر کے ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات وغیرہ میں ان کے تازہ افسانے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں اور حلقۂ قارئین میں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کے بعض منتخبہ افسانوں کا ایک مجموعہ ''گمشدہ دولت'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس میں کل ستائیس (۲۷) افسانے شامل ہیں جو متنوع فکری جہات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ بیشتر افسانے ریاست جموں و کشمیر بالخصوص وادیٔ کشمیر کی گزشتہ کئی دہائیوں سے بدلی ہوئی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و تمدنی صورت حال کی ترجمانی کرتے ہیں، جب کہ چند ایک اس مخصوص جغرافیائی حدود کو پھلانگ کر عالم انسانیت کو درپیش مسائل و مصائب کی عکس نمائی کے آئینہ دار ہیں۔ اولذکر زمرے کی افسانوی تخلیقات میں اندھیرے اجالے، صدمہ، دہشت کے سائے ، وغیرہ کا شمار کیا جاسکتا ہے جب کہ ثانی الذکر میں بے درد زمانہ، پشیمانی، اعتبار، انتظار وغیرہ جیسے افسانے اہم ہیں۔

افسانوی مجموعہ ''گمشدہ دولت'' میں شامل اوّلین افسانہ ''بے درد زمانہ'' ہے۔ موضوعی و ہئیتی ہر دو اعتبار سے یہ مذکورہ مجموعے کا سب سے لائق اور قابلِ مطالعہ افسانہ ہے۔ اس افسانے کی بنت کاری میں فن کار نے جس جانفشانی کا مظاہرہ کیا ہے وہ واقعی ان کی تخلیقی ہنر مندیوں کو زندہ جاودانی عطا کرتا ہے۔ اس افسانے کی قرأت

کے بعد یہ امر بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ زمانہ چاہیے کتنا بھی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، معاشرہ کس قدر بھی مہذب کیوں نہ ہو اور انسانی اقدار و روایات کی بحالی کا کتنا ہی ڈھنڈورا کیوں نہ پیٹا جائے لیکن زمینی سطح پر حالات کسی بھی طور اطمینان کن نہیں ہیں اور شاید یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر بھی نہیں ہو سکے گا۔ دنیاوی معاشرے کا ایک بڑا طبقہ آج بھی برابر بے تحاشا ظلم و جبر اور استحصال کی چکی میں پسا جا رہا ہے۔ قدم قدم پر اس کے جذبات و احساسات اور عقائد و توقعات کا خون کیا جا رہا ہے۔ اسی غیر محسوس طبقاتی استحصال کی ایک جھلک سے اس افسانے میں فن کار نے قارئین کو روشناس کرایا ہے اور تخلیقی انداز میں ہمیں غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ ''سندری'' اپنے بیمار شوہر کو علاج و معالجہ کے لیے سرکاری اسپتال میں داخل کرتی ہے لیکن وہاں ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس سے ان کی رہی بچی آس بھی دم توڑ دیتی ہے۔ افسانے سے ایک مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''کل بھی وہ بڑی آس لے کر اسپتال کے تشخیصی لیبارٹری میں گئی تھی۔

''آپ ایک مہینہ بعد آیئے۔''

وہاں تعینات ملازم نے چند الفاظ تحریر کر کے نسخہ اس کے ہاتھ میں واپس تھماتے ہوئے بڑی بے رخی سے کہا اور سر تا پاؤں حریص نگاہوں سے اس کو گھورنے لگا۔

''ایک مہینہ بعد''۔۔۔۔۔۔

بھائی صاحب۔۔۔ مریض درد سے تڑپ رہا ہے۔ ایسی حالت میں ایک مہینہ تک اس کا جینا محال ہے۔ خدا کے لیے رحم کیجیے اور مجھ غریب بے سہارا عورت پر ترس کھایئے۔''

''دیکھئے یہاں سب تڑپ رہے ہیں۔ آپ ہمیں تنگ مت کیجیے۔ آپ کا نمبر ایک مہینہ بعد ہی آئے گا۔ اگر آپ کو اتنی ہی جلدی ہے تو بازار سے ٹیسٹ کروا لیجیے۔ ایک گھنٹے میں ہو جائیں گے۔''

اس اقتباس سے معاشرے کے ایک طبقے کی خود غرضی اور دوسرے کی بے

بسی ولاچاری صاف طور پر مترشح ہو جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وقت وقت پہ اس لاچار عورت کی مجبوری کا فائدہ ہر وہ انسان لیتا ہے جس سے اس کا سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے قیمتی زیورات اور گھر بار کی بچی پونجی وغیرہ کو مفت دام میں لوٹا جاتا ہے۔ روزمرہ زندگی کے اس ناسور کو افسانہ نگار نے بڑی عمدگی سے فنی قالب میں پرو کر سامنے لایا ہے۔ لفظوں کا موزوں انتخاب، جملوں کی دروبست، مکالموں کی چستی اور اشاروں کنایوں کا برمحل استعمال اس فن پارے کو ادبی افادیت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔

افسانہ ''اندھیرے اجالے'' زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعے میں شامل دوسرا اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے کی وساطت سے تخلیق کار نے کرۂ ارض کے اس خطے کی موجودہ صورت حال کا نقشہ اُتارا ہے جسے کبھی دنیا بھر میں جنت نظیر یا خوابوں کی دھرتی سے جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ کس طرح اس گلشن کا ہر ایک پھول سوکھا پڑا ہے، کیوں کہ اس کی رونق اور خوش حالی پھیکی پڑی ہے اور کیا وجہ ہے کہ اس چمن کی ہریالی زردی میں بدل گئی ہے، یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے فکری عناصر اس افسانے کا خام مواد طے پا چکے ہیں۔ اس افسانے میں اگرچہ ایک اہم اور قابلِ فکر موضوع کو سمانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اسلوب بیان اور طرزِ پیش کش میں کسی حد تک کم توجہی اس کے تاثر میں حائل آجاتی ہے اور افسانہ اپنی اصل لطافت و دلکشی کھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ''صدمہ'' بھی اسی قبیلے کا ایک دوسرا افسانہ مذکورہ مجموعے میں شاملِ اشاعت ہے۔ اس افسانے میں بھی فن کار نے کشمیری تہذیب اور یہاں کے حالات و واقعات کے تعلق سے افسانوی فضا تیار کی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ مذکورہ موضوع کے حوالے سے کئی سارے فن پارے وجود پا چکے ہیں لیکن رفعت والمناکی کے حامل اس نوع کے افسانے جس فنی مہارت اور تخلیقی پیش کش کے متقاضی رہتے ہیں' اس کا فقدان بہرحال اس تحریر میں بھی محسوس کیا جاتا ہے۔ فن کار نے جہاں راست گوئی اور جانب

داری سے برابر کا کام لیا ہے وہیں رمزیت، غیر جانب داری اور دوسرے فنی وسائل کا عدمِ استعمال افسانے کے دیرپا تاثر کو زائل کر دیتا ہے۔افسانہ ’’فریبی اُجالا‘‘ موجودہ معاشرتی منظرنامے میں جڑ پا چکے مختلف النوع غیر قانونی اور غیر اخلاقی عناصر جیسے شراب و کباب، چرس گانجا، رشوت خوری، دھوکہ فریبی اور فحاشی و عریانی وغیرہ کے پھیلاؤ اوران کے عام ہونے کے پس پشت چھپے اصل اسباب ومحرکات کی ترجمانی کے حوالے سے ایک اہم کارنامہ ہے۔افسانے کے مطالعے سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ اس ضمیر شکن ماحول کے فروغ میں ہر ایک طبقے، فرقے، مذہب اور زمرے کے لوگوں کا ہاتھ برابر شامل ہے۔

افسانہ ’’دہشت کے سائے‘‘ جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس خوفناک اور الم انگیز صورت حال کی آئینہ داری کرتا ہے جو عالمِ انسانیت کے ساتھ ساتھ اپنے گردونواح کی ترجمانی کرتا ہے۔یہ افسانہ جہاں فکری معنوں میں ایک اچھوتا فن پارہ ہے وہیں فنی سطح پر بھی اس میں بھرپور پختگی کا مظاہرہ ملتا ہے۔’’اعتبار‘‘ کے زیرِ عنوان مذکورہ مجموعے میں شامل افسانہ جہاں بچپن کے دو ساتھیوں، ان کے پیار ومحبت کی کہانی، ان کے آپسی وعدے اور اعتبار بھرے قسموں کی غیر متوقع بیخ کنی جیسے رومانوی نوعیت کے موضوع کو محیط ہے وہیں ساتھ ساتھ اس میں کیٹگری کے نام پر باصلاحیت اور ہونہار امیدواروں پر ہونے والے بے جا استحصال کی ترجمانی بھی فن کارانہ انداز کی گئی ہے۔ یہ دونوں فکری پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گتھے ہوئے ہیں کہ کہانی کا تاثر بھرپور انداز میں قائم و دائم رہتا ہے۔افسانہ ’’پشیمانی‘‘ موجودہ معاشرے میں ایک عورت پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان ہے۔انسانی معاشرے میں ابتدائی آفرینش سے ہی عورت کے کردار کو حاشیے پر دھکیل دیا گیا ہے۔اس بھید بھاؤ اور غیر اخلاقی تقسیم کے خلاف اگرچہ ہر دور اور ہر زمانے میں

صدائے احتجاج سامنے لایا گیا ہے ،عورتوں کو ان کے سماجی ، سیاسی اور معاشرتی و اخلاقی حقوق اور اختیارات فراہم کرنے کے لیے مختلف تحریکات و رجحانات کا ظہور ہوا ہے لیکن باوجود اس کے یہ ظالمانہ روایت آج بھی اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ صحیح و سالم ہے ۔ بالخصوص ازدواجی بندھن میں بندھنے کے بعد عورت کو جن مصائب کا سامنا رہتا ہے وہ کسی سے چھپے نہیں ہیں ۔ یہ افسانہ ''شازیہ'' کی صورت میں ان تمام عورتوں کے خون ریزہ جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے جو اپنے سسرال میں اس نوع کے معاملات کا شکار ہیں ۔ علاوہ ازیں یہ مظلوم طبقہ اس قدر ظلم و جبر سہنے کے باوجود بھی کس طرح صبر وشکر پر قناعت کرتا اور گھریلو تعمیر وترقی میں اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے، یہ افسانہ اس سب کی بہترین فنی تصویر کشی ہے۔

مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ ''گمشدہ دولت''، ''بے رنگ''، ''بغاوت''، ''مسیحا کی تلاش'' اور'' آخری جام'' وغیرہ اس مجموعے میں شامل ایسی تخلیقات ہیں جو سماج و معاشرے میں راہ پائے ہوئے دوسرے تلخ اور تند پہلوؤں کی ترجمانی کو محیط ہیں ۔ طارق شبنم نے ان تمام موضوعات کو افسانے کے رنگ میں رنگنے کے لیے جس طرح فنی وسائل کو بروئے کار لایا ہے اور اسلوبیاتی سطح پر جن تجربات کو راہ دی ہے وہ ان تخلیقات کی ادبی معنویت کو دوبالا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ۔ ہاں چند ایک افسانوں میں فنی کوتاہیوں کا بھی احساس رہتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کا یہ افسانوی مجموعہ اردو کے افسانوی ادب بالخصوص ریاست جموں و کشمیر کی افسانوی روایت میں ایک اہم اضافہ گردانا جاسکتا ہے ۔ امید کرتے ہیں کہ آئندہ آنے والی تخلیقات میں ان کی فن کارانہ صلاحیتوں اور تجربات کا مزید نکھار دیکھنے کو ملے گا۔ جموں وکشمیر کے ادبی منظرنامے سے شغف رکھنے والے قارئین، محققین اور ناقدین کے لیے یہ افسانوی مجموعہ ایک کارآمد دستاویز کی حیثیت سے کم نہیں ہوگا۔ اس کا مطالعہ کرنے

اور تعمیری تنقیدی آرا سے فن کار کو نوازنے کی اشد ضرورت ہے تا کہ مثبت نتائج برآمد ہوں۔ اس افسانوی مجموعے کو جے۔ این۔ کے پبلی کیشنز نے نہایت عمدگی سے شائع کیا ہے۔

☆☆☆

(۲)

نام شعری مجموعہ : الہام سے پہلے

شاعر : اشرف عادل

مبصر : خان زاہد

اشرف عادل کا شمار وادی کشمیر کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے کافی محنت ومشقت اور اکتسابِ فیض سے شعروادب کی دنیا میں اپنی ایک مستحکم اور منفرد پہچان قائم کی۔ پچھلی چند دہائیوں میں دبستان کشمیر میں جن شعرا نے اپنی شعری تخلیقات سے یہاں کے ادب کو ایک اچھا خاصا مقام اور مرتبہ عطا کیا ہے ان کی تاریخ اگر مرتب کی جائے تو اشرف عادل کا ذکر کیے بغیر یہ تاریخ ادھوری رہ جائے گی۔ انجمن علم و ادب ہوں، ادبی محفلیں ہوں یا سوشل میڈیا کی دنیا ہو، اشرف عادل ہر جگہ نہایت ہی فعال اور متحرک نظر آتے ہیں۔ شاعری کا جنون ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عالمی نوعیت کے آن لائن مشاعروں میں اپنی شرکت یقینی بنانا ناگزیر سمجھتے ہیں۔ ان کا خاصہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں جہاں ''آمد'' کا عنصر ملتا ہے وہیں اچھی خاصی ''آورد'' کی بھی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اپنی اسی فن کارانہ صلاحیت پر انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے دبستان کشمیر میں طرحی مشاعروں پر مبنی ایک مجموعہ کلام "الہام سے پہلے" منصۂ شہود پر لاکر قارئین کی نذر کر دیا۔ ''الہام سے پہلے'' ۸۵

غزلوں، ایک حمد اور ایک نعت پر مشتمل طرحی مصرعوں پر کہی گئی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

اشرف عادل بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنا خون جگر نچوڑ کر غزل گوئی میں صرف کیا اور غزل ہی کو اپنے ذریعہ اظہار کا مرکز و محور بنایا جس کی عکاسی ان کے ان اشعار میں بخوبی ملتی ہیں:

مرے ہنر کو خدا نے کی ہیں عطا سانسیں
غزل کے ہاتھ کا کوئی کمال ہے مجھ میں

☆

غزل سے ہم نے نچوڑے ہیں فکر کے دریا
تمہارے نام صنم ہم نے نغمگی کر لی

☆

غزل کا تعلق تو ہے زندگی سے
مری شاعری کی مثال اوج پر ہے

ادیب اپنے ماحول، سماج اور گرد و نواح سے آنکھ چرا کر کوئی تخلیق نہیں لکھ سکتا ہے اور یہ تو ماننا ہوگا کہ ہر سچا قلم کار اپنے معاشرہ، اپنی ثقافت سے وابستہ رہ کر ہی پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی زمین میں اپنے ادب کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ ادیب کسی بھی زبان میں لکھتے ہوں ان کی شناخت کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں سے کسی نہ کسی زاویے سے اپنی زمین اور اپنے تہذیب کی گنگناہٹ لازمی طور پر سنائی دیتی ہے۔ اشرف عادل کے یہاں ان اصولوں کی پابندی بھی ملتی ہے اور خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے روایت کے ساتھ ساتھ جدت کا ہاتھ تھام کر شاعری کو نئے اور عصری تناظر میں پیش کرنے کی ممکنہ کوشش کی ہے۔ شعر کہنے کے لئے بحر، وزن، ردیف اور قافیہ سے ہٹ کر جس vision کی ضرورت لازمی ہے اس پر اشرف عادل پورے اتر

کر کامیاب شاعروں میں شمار کیئے جائیں گے۔اپنے وطن، سماج کی نابرابری اور سیاسی چیرہ دستیوں سے متعلق یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر اک مکیں کو ہے دعویٰ یہاں خدائی کا
ہجوم دل سے نکل آیا آشنائی کا

☆

کوئی افسر کوئی رہبر کوئی خودسر ہے یہاں
سب زمانوں کے خداؤں سے بچانا مجھ کو

جہاں اس دنیائے رنگ و بو کے دگر گوں حالات، آپسی چپقلش، بے ایمانی، غربت و افلاس، دل و دماغ کا انتشار ہمیں کم ہمت اور مایوس کرنے کے لیے کافی ہے۔انسان کو خوف و دہشت، مایوسی اور ناامیدی نے ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے تو وہیں دوسری طرف ہمارے شعرا سماج میں مثبت پہلو اپنا کر پیار و محبت، امید، حوصلہ، امن اور انسانیت کا پیغام دینے میں پیش پیش رہے۔اس دنیا کو اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ امید اور محبت ہے۔

بقول بشیر بدر:

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انساں کو محبت کی ضرورت ہے بہت

اشرف عادل بھی اس اندھیری نگری میں امیدوں کے چراغ جلا کر اٹھا ہے اور انھوں نے بھی امن، محبت، شرافت و انسانیت کا پیغام دیگر شعرا سے ہٹ کر اپنے مخصوص اسلوب اور انداز میں پیش کیا۔۔

چلو کانٹے رقیبوں کی بھی راہوں سے ہٹا لیں ہم
چلو اپنے حریفوں کو گلے سے اب لگا لیں ہم

کیا نمرود کی آتش کو آخر عشق نے ٹھنڈا
چلو کاجل محبت کی نگاہوں سے چرا لیں

میں اپنے تبصرے کو سمیٹتے ہوئے آخر پر یہی کہتا چلوں کہ مجموعی اعتبار سے بظاہر عادل صاحب کے اشعار سہل ممتنع میں نظر آتے ہیں، لیکن ان کے بطن میں کئی جہانِ معنی پوشیدہ ہیں۔آپ کا شعری قرطاس ایک بحر بیکراں ہیں جس میں رنگ برنگے قیمتی پتھر نگینے کی طرح محفوظ ہیں۔گویا کہ پرورش لوح وقلم کا سلسلہ اشرف عادل کے یہاں ابھی مسلسل جاری ہے۔امید ہے کہ یہ کتاب اردو دنیا میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

☆☆☆

(۳)

افسانوی مجموعہ	:	خوابوں کی کسک
افسانہ نگار	:	ڈاکٹر محمد یونس ڈار
مبصر	:	ڈاکٹر گلزار احمد وانی

صنف افسانہ کی مقبولیت بقیہ اصناف ادب کے ساتھ ساتھ برابر جاری و ساری ہے۔منشی پریم چند سے لے کر دور حاضر تک کے تمام افسانہ نگاروں نے مذکورہ صنف میں طبع آزمائی کر کے زمانے کی اتھل پتھل کو تخلیقیت کے دائرے میں لایا ہے۔ڈاکٹر محمد یونس جدید تر نسل کے ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو کشمیر کے ضلع پلوامہ سے تعلق رکھتے ہیں اور پیشے سے معالج ہیں۔ان کا پہلا عشق شاعری سے رہا ہے غزل باقی شعرا کی طرح انہیں بھی بے حد پسندیدہ صنف سخن ہے اور ان کا شعر کی طرف ذہنی

میلان بھی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ افسانے کی طرف بھی انہیں کافی کھینچاؤ نظر آتا ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کی کسک'' حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے جس میں ان کے بیس افسانے تخلیقیت کا جامعہ اوڑھے ہوے ہیں جو کئی زاویوں سے ایک قاری کا ذہن اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ مذکورہ مجموعے میں جہاں ان کی نظر سماج کے ان افراد پر رہتی ہے جنہوں نے صالح معاشرے کو بگاڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ہے وہیں وہ افراد بھی ان کے زیر نظر ہیں جن کے ساتھ ان کی اٹھک بیٹھک رہتی ہے۔غرض کہ سماج کے سبھی افراد پر ان کی نظر گہری ہے۔ان کے گھیراؤ میں وہ اپنے تجربے، مشاہدے اور تخلیق کے نت نئے رنگ نکھارت ہوئے نظر آتے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ چونکہ محمد یونس ڈار کی اولین کاوش ہے اس لیے اس میں فنی و تکنیکی طور پر کچھ کمیاں ہوسکتی ہیں۔البتہ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں جن کرداروں کو پیش کیا ہے ان کے مکالمے اپنے ماحول کے بمطابق ہیں اور وہی افراد بھی ان کی کہانیوں کے کردار ہیں جن کی زندگیوں کے آپ بالکل پاس پاس رہ چکے ہیں۔آپ نے لوگوں کے درد وغم اور خوشی ومسرت کی کیفیات کا بغور جائزہ لیا ہے اور افسانے کے کینوس پر پیش کر کے اپنے معاشرے کی بخوبی مرقع کاری کی ہے۔پیش ہیں چند اقتباسات جن میں ان کی بات میں ہمدردی اور سچائی مضمر ہے۔

> ''زبیدہ پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑی کہ اس کی ہمت جواب دینے لگی وہ حاملہ تھی اور محض اس امید پر زندہ تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ بشیر میں تبدیلی آجائے گی مگر یہ محض اس کا گمان تھا'' (افسانہ۔۔۔طلاق)

افسانہ طلاق میں انہوں نے ایک ایسی سچویشن کو پیش کیا ہے کہ موجودہ سماج میں لڑکے شراب اور نشے کی حالت میں اپنی خوشگوار زندگی کو جہنم بنا دیتے ہیں اور ساتھ

ہی اپنے گھروں کو بھی برباد کر دیتے ہیں۔ گھر کا پرسکون ماحول کیسے بگھاڑتے ہیں اور اپنی بیویوں پر کس قدر ظلم کرتے ہیں بڑے ہی فن کارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''نیا سبق'' میں ایک اور کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

''میرے دوست میرے یار حوصلہ رکھو...... ناامید بالکل بھی نہ ہو۔ تم تو جانتے ہو کہ ناامیدی کفر کے مانند ہے لہذا ایسی باتیں نہیں کیا کرتے''۔

زیرِ تبصرہ افسانوی مجموعہ میں جو قدرتی مناظر پیش کیے گئے ہیں ان سے کشمیر کے موسم کی صحیح عکاسی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کے برف پوش پہاڑ، جھیلیں، جاڑے کی یخ بستہ راتیں، اوس، ندی نالوں میں بہتے جھرنے، جنگلات کے پیڑ، جن میں دیودار، بدلو، کایرو قابل ذکر ہیں، چناروں کے ٹھنڈے سائے، یہاں کی سایہ دار سڑکیں، سیب کے باغات اور حکیم منظور کی طرح اخروٹ اور خوبانیوں کا ذکر بھی کہیں کہیں افسانے کی حرمت اور رونق میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد یونس کو اپنے گردو پیش پر گہری نظر ہے وہ ایک نبض شناس تخلیق کار ہیں انہیں ہر ایک کردار کے اندر ایک ایک کہانی نظر آتی ہے۔ وہ سماج کے تغیر پذیر حالات کو صحیح معنوں میں اپنے قلم کی جنبش سے صفحہ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ ان کے کردار اپنے ہی سماج کے ہیں جن سے افسانہ نگار اپنی قربت اور دوری کے احساسات اور تعلقات کو بے تکلف انداز میں بیان کرنے میں ید طولی رکھتے ہیں۔

امید قوی ہے کہ ڈاکٹر محمد یونس آگے بھی اسی شد و مد کے ساتھ اپنے افسانوی سفر پر خوشی خوشی گامزن ہوں گے اور آنے والے وقت میں یہاں کے مستند افسانہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

☆☆☆

☆......میم دانش

شعبۂ اردو، کلچرل اکیڈیمی کی ۲۰۲۳ء میں
ادبی سرگرمیاں

☆......اردوافسانے کی شعریات

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام سے ۱۴/ مارچ ۲۰۲۳ء کو دو روزہ اردو افسانہ سمپوزیم ''اردو افسانے کی شعریات'' کا آغاز ہوا۔ افتتاحی نشست کی صدارت جناب غلام نبی خیالؔ نے کی جب کہ ایوان صدارت میں جناب نور شاہ مہمان خصوصی اور جناب وحشی سعید مہمان ذی وقار کی حیثیت سے موجود تھے۔ اس موقع پر مہمانوں کا استقبال ڈویژنل آفس کشمیر کے سربراہ ڈاکٹر فاروق انوار مرزا صاحب نے کیا۔

افتتاحی نشست میں پروفیسر نذیر احمد ملک نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر ملک نے افسانہ کی شعریات کے بنیادی مباحث پر سیر حاصل مقالہ پیش کیا۔ ارسطو کی بوطیقا میں پلاٹ، کردار اور مکالمہ کے بنیادی اور اولین خط وخال کی نشان دہی کرتے ہوئے پروفیسر ملک نے افسانے کے سفر کے تمام اہم مراحل پر پُر مغز گفتگو کی اور افسانے کی تاریخ کا جائزہ پیش کیا۔ اس نشست میں اکیڈمی کی شایع کردہ تازہ مطبوعات کی رسم رونمائی انجام دی گئی جن میں جموں کی تمدنی تاریخ (کے۔ڈی۔مینی)، شیرازہ کا پروفیسر ظہور الدین نمبر اور شیرازہ کا سفرنامہ نمبر شامل ہیں۔

اس موقع پر وحشی سعید اور نور شاہ نے بھی اپنے تاثرات پیش کئے۔ جناب غلام نبی خیال نے اپنے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں لکھے گئے اردو افسانے کا بنیادی عنصر خلوص اور نیک نیتی رہا ہے...... پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ دَھر کے افسانے اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ بہترین افسانہ وہ ہے جو مستقبل میں بھی اپنی اہمیت برقرار رکھ سکے اور وقت گزرنے پر غیر متعلق نہ ہو جائے۔

پہلے دن کی دوسری نشست کی صدارت پروفیسر نذیر احمد ملک صاحب نے کی اور ایوان صدارت میں مشتاق احمد مشتاق اور محترمہ رخسانہ جبین بھی شامل رہے۔ اس نشست کے دوران ڈاکٹر الطاف انجم نے اپنا مقالہ ''افسانے میں بیانیہ کا عمل'' کے عنوان سے پیش کیا۔ بیانیہ، اس کی حدود اور اس کے اطلاق کی مدلل طور پر وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر انجم نے بہت عالمانہ انداز میں فکر انگیز گفتگو کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر ریاض توحیدی کے افسانہ ''ماں'' کا تجزیہ پیش کیا۔ اس نشست میں ڈاکٹر رافعہ ولی، ناصر ضمیر اور مشتاق مہدی نے اپنے افسانے پیش کئے جن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ ایوان صدارت میں موجود شخصیات جناب مشتاق احمد مشتاق اور محترمہ رخسانہ جبین نے نشست کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کئے۔

پروفیسر نذیر احمد ملک نے اپنے صدارتی خطبہ میں زندگی کے مختلف شعبہ جات میں بیانیہ کی موجودگی اور اہمیت کی وضاحت کی۔ نشست کے دوران افسانوی ادب سے وابستہ کئی مقتدر قلم کار اور ادب نواز شخصیات کے علاوہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم کئی ریسرچ اسکالرز بھی موجود رہے۔ نظامت کے فرائض مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے انجام دیئے۔

''دوروزہ اردو افسانہ سمپوزیم'' کے دوسرے روز کی پہلی نشست کا آغاز آج صبح گیارہ بجے ہوا۔ اس نشست کی صدارت معروف افسانہ نگار اور معالج ڈاکٹر نذیر

مشتاق نے کی جب کہ جواں سال افسانہ نگار اور ناقد ڈاکٹر ریاض توحیدی مہمان خصوصی اور مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک میزبان کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود رہے۔ مہمانوں کا باضابطہ استقبال محمد سلیم سالک نے کیا۔

اس نشست میں ڈاکٹر مشتاق حیدر صاحب نے افسانہ کے مبادیاتی مباحث ولوازمات سے متعلق اپنا مقالہ پیش کیا اور فکشن اور نان فکشن کے درمیان حد امتیاز اور شناخت کی تعریف وتوضیح بہت دلکش انداز سے کی۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے باریک بینی سے افسانہ کے عناصر ترکیبی کے اسرار ورموز پر روشنی ڈالی۔ مقالہ سماعت کرنے کے بعد سامعین نے مقالہ نگار سے کئی نکات سے متعلق استفسار کیا اور کچھ معاملات کی توضیح چاہی اور فاضل مقالہ نگار نے تمام استفسارات کا تشفی بخش جواب دیا۔

اس نشست میں محترمہ ریحانہ شجر نے اپنا افسانہ بعنوان ''ابہام'' متاثر کن انداز میں پیش کیا جس کو سامعین نے بہت انہماک سے سماعت کیا اور بعدازاں افسانہ نگار کو داد وتحسین پیش کی۔ نشست میں دوسرا افسانہ طارق شبنم نے '' بے ریا عاشق '' عنوان سے پیش کیا۔ ایوان صدارت میں تشریف فرمہمان خصوصی ڈاکٹر ریاض توحیدی نے نشست کی مجموعی کارروائی سے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے اور صاحب صدر ڈاکٹر نذیر مشتاق نے مختصر مگر جامع خطبہ صدارت پیش کیا۔

دوسری نشست کی صدارت جناب محمد امین بٹ صدر ادبی مرکز کمراز نے کی جب کہ معروف افسانہ نگار محی الدین ریشی مہمان خصوصی کے بطور اور محمد سلیم سالک میزبان کی حیثیت سے ایوان صدارت میں شامل تھے۔

اس نشست کا پہلا مقالہ ڈاکٹر کوثر رسول نے ''روایتی، تجریدی اور علامتی افسانہ'' کے عنوان کے تحت پیش کیا۔ ڈاکٹر کوثر رسول نے اپنے مقالے میں روایتی،

تجریدی اور علامتی افسانے کی تاریخ اور روایت پر نہ صرف مفصل اور سیر حاصل گفتگو کی بلکہ مختلف افسانوں سے مثالیں پیش کر کے سامعین کی علمی تشنگی کو دور کیا۔ مقالہ پیش کرنے کے بعد فاضل مقالہ نگار نے علمی استفسارات کا جواب دیا۔ دوسری نشست کا پہلا افسانہ راجہ یوسف نے ''نا قابل تنسیخ'' عنوان سے پیش کیا۔ راجہ یوسف کا رومانی افسانہ بہت عمدہ اور ان کی پیشکش بہت متاثر کن رہی جس کے لئے سامعین نے انہیں بہت سراہا۔ دوسرا افسانہ معروف افسانہ نگار شفیع احمد نے ''پرچھائیں'' عنوان سے پیش کیا۔ شفیع احمد کا علامتی افسانہ بہت عمدہ رہا اور انہوں نے سامعین سے بہت داد حاصل کی۔

نشست کا دوسرا مقالہ ڈاکٹر ریاض توحیدی نے ''افسانچہ نگاری: فن اور تکنیک " کے موضوع پر پڑھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نذیر مشتاق اور ڈاکٹر فیض قاضی آبادی نے اپنے افسانچے پیش کئے۔

اس موقعہ پر مہمان خصوصی محی الدین ریشی صاحب نے کشمیری افسانچہ کی روایت کے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے۔ آخر پر صاحب صدر نشست جناب محمد امین بٹ نے اکادمی کو دوروزہ اردو افسانہ سمپوزیم منعقد کرنے پر مبارک بادی پیش کی اور ساتھ ہی مستقبل میں ایسے علمی و ادبی سرگرمیوں میں وسعت دینے پر زور دیا۔ شیرازہ اردو کے مدیر محمد سلیم سالک نے مہمانوں کا باقاعدہ شکریہ ادا کیا ۔ ''اردو افسانہ سمپوزیم'' کے دوسرے روز نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دیئے جبکہ پروگرام انچارج جناب سلیم ساغر اور تکنیکی معاون جناب امتیاز شرقی نے سمپوزیم کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

☆☆☆

☆......اردو شاعری کی شعریات: بنیادی مباحث

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام سے ۱۴ر جون

2023 کو۲روزہ شاعری سمپوزیم کا افتتاح کیا گیا۔سمپوزیم کا عنوان ''اردو شاعری کی شعریات: بنیادی مباحث'' تھا۔ یہ سمپوزیم کانفرنس روم ٹیگور ہال سری نگر میں منعقد ہوا۔افتتاحی نشست کی صدارت نامور براڈ کاسٹر اور شاعر رفیق رازؔ نے کی جب کہ ایوان صدارت میں معروف شاعر اور محقق ڈاکٹر ایاز رسول نازکی بطورِ مہمان خصوصی شریک تھے اور سیکریٹری اکیڈمی بھرت سنگھ منہاس میزبان اعلیٰ کی حیثیت سے ایوان میں تشریف فرما تھے۔نشست کے دوران ڈاکٹر راشد عزیز نے ''اردو شاعری کی مبادیات'' کے عنوان سے اپنا مفصل کلیدی مقالہ پیش کیا اور سمپوزیم میں موجود شعرا و ادبا کے سامنے کئی معلومات افزا دلائل پیش کئے۔ڈاکٹر ایاز رسول نازکی نے اپنے خطاب کے دوران زبان و شعر و ادب کو موجودہ سماجی تناظر میں دیکھتے ہوئے بہت دلکش اور پُر مغز گفتگو کی۔رفیق رازؔ نے خطبہ صدارت کے دوران شعر و ادب کی دنیا کے اسرار و رموز سے متعلق پُر مغز اور بصیرت افروز گفتگو کی۔اس افتتاحی نشست کے آخر پر ڈاکٹر فاروق انوار مرزا انچارج ڈویژنل آفس کشمیر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔افتتاحی نشست کی نظامت مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے انجام دیئے۔

سمپوزیم کی دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر نذیر آزادؔ نے کی جب کہ ڈاکٹر راشد عزیز مہمان خصوصی کے بطور ایوان میں موجود تھے۔اس دوران پروفیسر شمس کمال انجم نے اپنا مقالہ ''اردو شاعری میں عروض کی اہمیت'' کے عنوان سے پیش کیا جسے تمام حاضرین نے سراہا۔اس نشست میں مبارک لون، تسنیم الرحمان حامی، رابعہ گیلانی، ہجر مومن، عامر گلشن، راشف عزمی اور ڈاکٹر ایاز رسول نازکی نے اپنا کلام پیش کیا۔

تیسری نشست کی صدارت کہنہ مشق شاعر اور مترجم سلطان الحق شہیدی نے کی جب کہ ڈاکٹر ریاض توحیدی ایوان میں مہمان خصوصی کے بطور شریک رہے۔اس

دوران ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی نے اپنا طویل مقالہ ''اردو شاعری میں محاسن و معائب '' پیش کیا۔ اگر چہ ڈاکٹر موصوف خوف طوالت سے مقالہ مکمل طور پر پیش نہ کر سکے لیکن انہوں نے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کر کے موضوع کا حق ادا کیا۔ اس نشست میں عقیل فاروق، راقم حیدر، صابر شبیر بڈ گامی، اعظم فاروق، شفیع شاداب، خوش حال فیضی، ساگر سلام اور الطاف زرگر نے اپنی تازہ شعری تخلیقات پیش کیں۔ آخر پر سلطان الحق شہیدی نے اپنا کلام پیش کیا اور صدارتی کلمات پیش کیے۔ اس دوران ڈاکٹر نذیر آزاد، رخسانہ جبین، رضیہ حیدر، ڈاکٹر ایاز رسول نازکی، اشرف عادل اور ڈاکٹر راشد عزیز موجود رہے۔

سمپوزیم کے دوسرے روز کی پہلی نشست کی صدارت پروفیسر نذیر احمد ملک صاحب نے کی جب کہ ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی بہ طور مہمان خصوصی ایوان صدارت میں موجود تھے اور محمد سلیم سالک مدیر شیرازہ اردو میزبان کی حیثیت سے شامل تھے۔ نشست کے دوران ڈاکٹر نذیر آزاد نے ''اردو شاعری کا علامتی نظام'' کے عنوان کے تحت اپنا مفصل اور بصیرت افروز مقالہ پیش کیا۔ اس دوران مرحوم حکیم منظور کے کلام پر مشتمل غنی غیور کا مرتب کردہ شعری مجموعہ ''آزارِ جاں'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ اس نشست میں حاشر افنان، جاذب جہانگیر، عقیل کلاروسی، خالدہ بیتاب، میسر ناشاد، عمر عالم، شائستہ بخاری، سید واصل بخاری اور قتیل مہدی نے اپنا کلام پیش کیا۔ نشست کے اختتام پر پرفیسر نذیر احمد ملک نے اپنا مدلل و مفصل اور بصیرت افروز صدارتی خطبہ پیش کیا۔ اس نشست کے دوران ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی، غنی غیور، ڈاکٹر نذیر آزاد، سلطان الحق شہیدی، رخسانہ جبین، اشرف عادل، حسن انظر، ڈاکٹر راشد عزیز، شبیر احمد شبیر، شفیع احمد کے علاوہ نوعمر شعرا کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔۔ نشست کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دیئے

دوسری نشست کی صدارت پیر حسن انظر نے کی اور پروفیسر پرویز احمد اعظمی مہمان خصوصی کے بہ طور ایوان میں موجود تھے۔اس نشست میں شبیر احمد شبیر نے اپنا طویل مگر پُر مغز مقالہ ''شاعری میں صنائع و بدائع'' کے موضوع کے تحت پیش کیا۔ نشست کے آخر پر زاہد جمال بانڈے، ڈاکٹر یونس ڈار، مصروفہ قادر اور شاہدہ نور نظر نے اپنی تازہ شعری تخلیقات کو پیش کیا۔

آخری نشست کی صدارت رخسانہ جبین صاحبہ نے انجام دی جب کہ مہمان خصوصی کے بہ طور غنی غیور ایوان میں موجود تھے۔اس دوران پروفیسر پرویز احمد اعظمی نے اپنا مقالہ ''اردو شاعری میں روزمرہ کی اہمیت'' کے عنوان سے پیش کیا جو حاضرین کے لئے بہت معلومات افزا اور چشم کشا رہا اور اس مقالے کو بہت سراہا گیا۔نشست کے آخر پر سیفی وسیم، روشن آرا، راہی گل، اطہر بشیر، عارض ارشاد، شیخ گلزار احمد، بخشی مشتاق احمد، رضیہ حیدر، تنویر طاہر، طاہر احمد وانی، شکیل مقبول یتو، اشرف عادل، غنی غیور اور رخسانہ جبین نے اپنی تازہ شعری تخلیقات پیش کر کے داد و تحسین حاصل کی۔آخر پر رخسانہ جبین صاحبہ نے صدارتی خطبہ پیش کیا۔اس دوران ڈاکٹر نذیر آزاد، حسن انظر، پروفیسر نذیر احمد ملک، سلطان الحق شہیدی، شبیر احمد شبیر اور ڈاکٹر راشد عزیز موجود رہے جنھوں نے نوجواں شعرا کی بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔محمد سلیم سالک مدیر شیرازہ اردو نے مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا۔پروگرام کے انچارج معاون مدیر شیرازہ سلیم ساغر نے سمپوزیم کو کامیاب بنانے اہم اقدامات کئے اور ساتھ ہی تیکنیکی امور کے لئے جمیل انصاری اور امتیاز شرقی نے اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی۔

☆☆☆

☆......**نامور شاعر جناب رفیق راز کے ساتھ ایک ملاقات**

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کے زیر اہتمام

ٹیگور ہال سری نگر میں Meet The Eminent Writer سیریز کے تحت مایہ ناز شاعر و ادیب اور معروف براڈ کاسٹر جناب رفیق رازؔ کے ساتھ ۱۵؍ جولائی ۲۰۲۳ء کو ایک ملاقات کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر ایاز رسول نازکی نے انجام دی جب کہ پروفیسر شیخ اعجاز محمد بہ طور مہمان خصوصی شامل تھے اور جناب ڈاکٹر مرزا فاروق انوار بہ طور میزبان ایوان صدارت میں موجود تھے۔ نشست کے دوران نوجواں اسکالر جناب جاوید رسول نے رفیق رازؔ کے فکر و فن پر اپنا مقالہ کیا بہ عنوان "صاحب اسلوب شاعر......رفیق رازؔ" پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔ اس دوران نوجوان اسکالر ڈاکٹر شبیر احمد کی کتاب "اردو مابعد جدیدیت اور تصوف کی واپسی" کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ تقریب کے دوران رفیق رازؔ نے اپنی زندگی اور شعر و شاعری کے حوالے سے مفصل گفتگو کی اور حاضرین کے استفسارات کے جوابات اپنے تجربات کی روشنی میں دیئے۔

اس نشست کے دوران جناب ابدال مہجور، نذیر فدا، پروفیسر مجروح رشید، محمد امین بٹ ،غنی غیور ،رخسانہ جبین ،مشتاق احمد مشتاق ،شبیر مجاہد ، ناصر مرزا، برج ناتھ بیتاب، شکیل الرحمان، پروفیسر فاروق فیاض، نثار نسیم, مولانا شوکت حسین کینگ ،مشتاق مہدی، شمشاد کرالہ واری ،ڈاکٹر مشتاق حیدر ،ڈاکٹر کوثر رسول، حسن انظر، ڈاکٹر راشد عزیز، شفیع احمد ،نیاز احمد بٹ ،عنایت گل ، ڈاکٹر عرفان عالم، ڈاکٹر شبنم عشائی , امداد ساقی ،ڈاکٹر شہزادہ سلیم ،ڈاکٹر نگہت نظر ، ڈاکٹر فیاض احمد ، محمد یوسف شاہین، ڈاکٹر حسرت حسین اور کشمیر یونیورسٹی اور سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے ریسرچ اسکالرز کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ تقریب کی نظامت مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے کی۔

☆☆☆

☆......ایک روزہ سیمینار ''جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا مستقبل''

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے زیر اہتمام ''ایک روزہ سیمینار بہ عنوان ''جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا مستقبل'' ۲۷ر جولائی ۲۰۲۳ء کو منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار کی صدارت کہنہ مشق شاعر وادیب جناب رفیق رازؔ نے کی اور ممتاز شاعرہ محترمہ رخسانہ جبین بہ حیثیت مہمان خصوصی ایوان صدارت میں شامل رہیں۔ اس دوران سابق چیف انفارمیشن کمشنر جناب جی۔ آر۔ صوفی بہ حیثیت مہمان ذی وقار اور ایڈیشنل سیکریٹری اکیڈمی جناب سنجیو رانا بہ حیثیت میزبان اعلیٰ ایوان صدارت میں موجود تھے۔ نشست کے آغاز میں ڈاکٹر مشتاق حیدر نے اپنا مفصل کلیدی مقالہ بہ عنوان ''جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا مستقبل'' پیش کیا۔ اس نشست کے دوران نظامت کے فرائض مدیر شیرازہ محمد سلیم سالک نے انجام دیئے۔

دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر نذیر آزاد نے کی، جبکہ جناب حسن انظر مہمان خصوصی کے بہ طور ایوان صدارت میں موجود رہے۔ اس نشست کی ابتدا میں ایک ادبی مذاکرہ کیا گیا جس میں غنی غیور، ڈاکٹر راشد عزیز اور محترمہ حنا خان نے شرکت کی۔ مذاکرہ میں ''جموں وکشمیر میں اردو شاعری کا مستقبل'' کے موضوع پر بحث کی گئی۔ مباحثہ کے دوران نظامت کے فرائض مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے انجام دیئے۔ شرکائے بحث نے اردو شاعری سے متعلق کئی اہم معاملات پر سیر حاصل گفتگو کی اور حاضرین کے استفسارات کے جوابات دیئے۔

سیمینار کے آخر پر ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں شعرا کی عمر ۳۵ سال سے کم رکھی تھی۔ یہ اس نوعیت کا پہلا مشاعرہ ہے جس میں عمر کی قید رکھی گئی تھی۔ جن نوجوان شعراء نے کلام پڑھا ان میں تسنیم الرحمان حامی، مبارک لون، رابعہ گیلانی، راشف عزمی، شبینہ آرا، ڈاکٹر یونس ڈار، میسر ناشاد، حاشر افنان، جاذب جہانگیر، عمر

عالم، ساگر سلام، عقیل کلاروسی، شیخ الطاف عیاب، شکیل مقبول یتو، محترمہ عطیہ رفعت، شاہی شہباز اور خواہش کشمیری، خوشحال فیضی، پرویز گلشن، ہجر مومن، عقیل فاروق، عمر فیاض، مرتضیٰ بسمل، احمد رئیس، راسخ شاہد، محسن ریاض، توصیف تابش، بشیر مہتاب، وقار دانش، آصف عطا اللہ اور ریاض ربانی قابل ذکر ہیں۔

سمینار میں فیاض دلبر، حسرت گڈھا، یوسف شاہین، ریحانہ شجر، ناصر مرزا، محمد ایوب نعیم کرناہی، شبیر بانہالی، محمد امین بٹ، ناصر ضمیر، ڈاکٹر گلزار وانی، شفیع احمد گلشن بدرنی، سہیل سالم، شہناز رشید، نثار اعظم، جاوید رسول، خورشید کاظمی، رفیق ہمراز، شیخ بشیر، رشید راگیر، ناظم نذیر، اصغر رسول، دیبا نظیر اور دیگر ادب شناس خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ اس نشست کی نظامت ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دی۔ سمینار کے دوران تکنیکی معاونت امتیاز احمد شرقی نے انجام دی جبکہ دیگر امور کی نگرانی سلیم ساغر نے کی۔

☆☆☆

☆......معروف فکشن نگار جناب دیپک کنول کے ساتھ ایک ملاقات

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کے زیر اہتمام اکیڈمی کے سمینار ہال میں Meet The Eminent Writer سیریز کے تحت مایہ ناز فکشن نگار اور ادیب جناب دیپک کنول کے ساتھ ۱۹؍ اگست ۲۰۲۳ء کو ایک ملاقات کا انعقاد کیا گیا۔ اس نشست کے دوران صدارت کے فرائض پروفیسر نذیر احمد ملک نے انجام دیئے جب کہ پروفیسر محمد زماں آزردہ بہ طور مہمان خصوصی اور ڈاکٹر نذیر مشتاق بہ طور مہمان ذی وقار شامل تھے اور جناب ڈاکٹر مرزا فاروق انوار انچارج ڈیویجنل آفس کشمیر میزبان اعلیٰ کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود تھے۔

نشست کے دوران نوجوان اسکالر ڈاکٹر رافعہ ولی نے دیپک کنول کے فکرو

فن پر اپنا جامع اور پر مغز مقالہ پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔اس دوران معروف ادیب جاوید شبیر کی کتاب "چناروں کی خوشبو" کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔تقریب کے دوران دیپک کنول نے اپنی زندگی اور طویل ادبی سفر کے حوالے سے مفصل گفتگو کی اور حاضرین کے استفسارات کے مفصل جوابات اپنے تجربات کی روشنی میں دیئے۔

سوالات کی نشست میں جاوید رسول ، ناصر ضمیر ،محمد امین بٹ ،محی الدین مرزا ، ناصر مرزا ، ڈاکٹر عرفان عالم ،صوفی بشر بشیر ،شبیر ماٹجی اور شفیع احمد نے دیپک کنول سے زندگی کے نشیب وفراز اور ادبی سفر سے متعلق استفسارات کئے۔

نشست میں پروفیسر ایاز رسول نازکی ، محمد امین بٹ، ناصر مرزا،شکیل الرحمان ،شمشاد کرالہ واری ،خورشید کاظمی ،محی الدین ریشی ،گلشن مجید ،ڈاکٹر کوثر رسول ، حسن انظر ،حسن انظر ، ریحانہ شجر ، شیخ بشیر احمد ،عبدالرشید راہ گیر ،شفیع احمد ،الطاف نوشہری ،مبارک لون ، ڈاکٹر غلام رسول ،طارق شبنم ،محمد ایوب میر نعیم کرناہی ،جاوید اقبال ، مقبول ساجد ،عبدالغنی شاہ ، راجہ یوسف ،مشتاق احمد کینی ،ڈاکٹر عابد احمد ،ڈاکٹر عرفان عالم ،محمد یوسف شاہین ،نیلوفر ناز نحوی ،ناظم نذیر ، سہیل سالم کے علاوہ علم وادب سے وابستہ افراد کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔تقریب کی نظامت مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے کی۔نشست کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں جناب سلیم ساغر اور محمد آصف خان نے کلیدی رول ادا کیا۔

☆☆☆

☆......گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز) اننت ناگ کشمیر میں اردو مشاعرہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے زیر اہتمام اور گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز) اننت ناگ کشمیر کے اشتراک سے ۳۱/ اگست ۲۰۲۳ء کو کالج کے کانفرنس ہال میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔مشاعرے کی صدارت

کہنہ مشق شاعر ڈاکٹر نذیر آزاد نے کی جب کہ معروف شاعر جناب علی شیدا بہ حیثیت مہمان ذی وقار اور پروفیسر مظفر احمد بٹ پرنسپل ڈگری کالج (بوائز) اننت ناگ اور پروفیسر فاروق احمد ملک بہ حیثیت میزبان ایوان صدارت میں موجود تھے۔

مشاعرے کی ابتدا میں شیرازہ کے مدیر محمد سلیم سالک نے کلچرل اکادمی کی طرف سے منعقدہ مشاعرہ سیریز کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اکادمی کے رول پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد کالج کے پرنسپل پروفیسر مظفر احمد بٹ صاحب نے بڑے شگفتہ انداز میں مہمان شعرا اور طلبہ و طالبات کا فراخ دلی سے استقبال کیا اور کلچرل اکادمی کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مشاعرہ سیریز کے پہلے مشاعرے کے لئے ہمارے کالج کا انتخاب کیا۔ مشاعرے میں اننت ناگ، پلوامہ، کولگام، شوپیاں کے اضلاع سے تعلق رکھنے والے شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کر کے اپنا کلام پیش کیا ان میں اعظم فاروق، بلال قاصر، عمر فیاض، ساگر سلام، مرتضیٰ بسمل، پرویز گلشن، منتظر رسول، منظور نو نہ مئی، منظور منظّم شاذ، میسر ناشاد، حامد رضا، شبینہ آرا، عرفان الحسن مہدی، شیخ گلزار، محمد یوسف نیرنگ، م۔ ح۔ مراد، علی شیدا اور پروفیسر نذیر آزاد شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مذکورہ کالج سے تعلق رکھنے والے شعرا میں پروفیسر مصروفہ قادر، پروفیسر جاوید احمد لون، پروفیسر آصف احمد کامگار اور طلبا میں سے جنید اشرف، عذیر نثار اور فرزان احمد وید نے اپنا کلام پیش کیا۔

مشاعرے کے دوران پروفیسر نذیر آزاد کی ترجمہ کردہ کتاب ''شرح مابعد جدیدیت...... تشکیکیت اور سوشلزم'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ اس دوران شیرازہ اردو کی تازہ مطبوعات کالج کی لائبریری کے لئے پیش کی گئیں۔ مشاعرے کے مہمان ذی وقار جناب علی شیدا صاحب نے جنوبی کشمیر کی ادبی تاریخ کے حوالے سے ایک مدلل تقریر کی، جس میں موصوف نے جنوبی کشمیر سے تعلق رکھنے والی علمی و ادبی شخصیات

کے کارناموں کو اجاگر کیا۔ صاحب صدر پروفیسر نذیر آزاد نے اردو کے معاصر شعری منظرنامے کے تعلق سے ایک بسیط تقریر فرمائی۔

مشاعرے میں شعرا کے علاوہ جنوبی کشمیر کی کچھ علمی شخصیات بھی موجود تھیں جن میں عطا محمد میر، ڈاکٹر محمد حسین زرگر، پروفیسر غلام رسول ڈار، ڈاکٹر فیضان احمد ملک، جناب یوسف جہانگیر، ڈاکٹر امتیاز احمد لون وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ کالج کا ٹیچنگ اور نان ٹیچنگ عملہ بھی مشاعرے کے دوران موجود رہا۔

مشاعرے کی نظامت مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے انجام دی جبکہ محترمہ مصروفہ قادر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے انچارج پروگرام سلیم ساغر، ڈاکٹر محمد اقبال لون اور محمد آصف نے اہم کردار نبھایا۔

☆☆☆

☆......ڈگری کالج سوپور میں اردو مشاعرہ

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام اور گورنمنٹ ڈگری کالج سوپور کے اشتراک سے ۱۴ر ستمبر ۲۰۲۳ء کو کالج کے آڈیٹوریم میں ایک عظیم الشان اردو مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر اور ادیب جناب مسعود حسن سامون نے کی جب کہ جناب حسن انظر مہمانِ خاص اور معروف براڈ کاسٹر اور شاعرہ محترمہ شبنم عشائی بہ طور مہمان ذی وقار ایوان صدارت میں موجود تھے۔ اس موقع پر محمد سلیم سالک اکیڈمی کے نمایندہ کی حیثیت سے اور کالج کی پرنسپل محترمہ پروفیسر سلمٰی احد بہ حیثیت میزبان اعلیٰ ایوان صدارت میں موجود رہے۔ مشاعرے کی نظامت کے فرائض معروف جواں سال شاعر جناب گلزار جعفر نے انجام دیئے۔

یہ مشاعرہ کلچرل اکیڈیمی کی طرف سے جنوبی، شمالی اور وسطی کشمیر میں منعقد کئے جانے والے مشاعروں کے سلسلے کی دوسری کڑی تھا۔ مشاعرے کے آغاز میں مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے مہمانوں کا والہانہ استقبال کیا۔ اس نشست کے دوران کلچرل اکیڈمی کے شیرازہ اردو کے دو خاص نمبر ''عبدالرحمٰن مخلص نمبر'' اور ''پروفیسر مجید مضمر نمبر'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔ کالج کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر واحد احمد شیخ کی فارسی زبان کی کتاب ''رہنمائے ورودی'' کا بھی اجرا ہوا۔

مشاعرے میں شمالی کشمیر کے تین اضلاع بارہ مولہ، بانڈی پورہ اور کپوارہ سے تعلق رکھنے والے جن شعرا نے اپنا کلام پیش کر کے حاضرین کو محظوظ کیا ان میں جاذب جہانگیر، عامر محی الدین، راسخ شاہد، مبارک لون، اطہر بشیر، خوشحال فیضی، تسنیم الرحمٰن حامی، راہی گل، عمر عالم، اشرف اشہر، ریاض ربانی، زاہد جمال بانڈے، حسن اظہر، تیمور احمد خان، احمد رئیس، اویس نبی، ڈاکٹر احمد منظور، ساگر سرفراز، آفاق دلنوی، وسیم ساغر، حسن زرین، گلزار جعفر، حسن انظر، ڈاکٹر شبنم عشائی اور جناب مسعود حسن سامون شامل ہیں۔ مشاعرے میں ڈگری کالج سوپور سے تعلق رکھنے والے پروفیسر جناب اصغر رسول، پروفیسر جناب مسرور مظفر اور پروفیسر اعجاز فرید کے علاوہ کوثر بشیر، اقرا اشرف اور کوثر بشیر (۲) طالبات نے بھی اپنا شعری کلام پیش کیا۔

اس مشاعرے کے دوران شعر و ادب اور سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والی ذی عزت شخصیات نے شرکت کر کے شعرا کی حوصلہ افزائی کی ان میں پروفیسر عبدالرشید ڈار، جی۔ ایم۔ ماہر، شاہد دلنوی، ایف آزاد دلنوی، محمد یوسف بچہ، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر برکت احمد، حبیب ہمراز، شبیر احمد شبیر، ناصر ضمیر، مقبول فیروزی، یوسف صمیم، الیاس آزاد، ڈاکٹر قاضی فیض آبادی، شفیع سوپوری، ڈاکٹر فلک فیروز، ڈاکٹر رافعہ ولی، ناظم نذیر، ڈاکٹر اشرف لون، مشتاق سوپوری، عاشق حسین زکی،

جاوید رسول، شہزاد منظور، فاروق احمد، ڈاکٹر حارث حمزہ، نثار سوپوری، ڈاکٹر رشید آفاق وغیرہ بہ طور خاص شامل ہیں۔اس مشاعرے کے انعقاد کے سلسلے میں ڈگری کالج سوپور کے اسسٹنٹ پروفیسر (اردو) ڈاکٹر اصغر رسول نے بہ طور کارڈنیٹر قابل ستائش کام کیا اور اس مشاعرے کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں پروگرام انچارج سلیم ساغر ڈاکٹر محمد اقبال لون، محمد آصف اور محمد اشرف نجار نے عرق ریزی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔

☆☆☆

☆......ایک روزہ سیمینار ''اردو افسانہ: نئی صدی، نئے موضوعات''

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کے اہتمام اور گورنمنٹ ڈگری کالج سوگام کپوارہ کے اشتراک سے ۲۶ر ستمبر ۲۰۲۳ء کو ایک روزہ سیمینار ربعنوان ''اردو افسانہ: نئی صدی، نئے موضوعات'' کا انعقاد کیا گیا۔سیمینار کے دوران جناب ڈاکٹر عبدالحفیظ مسعودی نے صدارت کی جب کہ پروفیسر شمیم احمد ڈار میزبان کی حیثیت سے اور جناب عبدالغنی بیگ اطہؔر اور جناب محمد یوسف مشہؔور مہمانان کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود تھے۔اس دوران اکیڈمی کی نمائندگی کے لئے مدیر شیرازہ محمد سلیم سالک ایوان صدارت میں موجود رہے۔

پروگرام کے آغاز میں پروفیسر شمیم احمد ڈار صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا۔محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور اغراض و مقاصد کا خاکہ پیش کیا۔

اس نشست کے دوران ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اپنا مفصل کلیدی مقالہ بہ عنوان ''اردو افسانہ: نئی صدی، نئے موضوعات'' پیش کیا۔اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرنے والے اس مقالہ کو حاضرین نے بے حد سراہا ہے۔سیمینار میں شیرازہ اردو

کی خصوصی اشاعت ''سفرنامہ نمبر۔۔جلد 2'' اور سال نامہ ہمارا ادب کا خاص نمبر ''فن افسانہ نگاری نمبر......جلد 1'' اور جواں سال ادیبہ صباجان حسن کی کتاب ''شہزادہ بسمل اور جموں وکشمیر کے معاصر افسانہ نگار'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔

سیمینار کے دوسرے حصے میں محفل افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس میں عادل نصیر نے اپنا افسانچہ ''آشیاں'' پیش کیا۔ راجہ شبیر نے اپنا افسانچہ ''او۔ٹی۔پی'' پیش کیا۔فیض قاضی آبادی نے اپنا افسانچہ ''اغوا'' اور افسانہ ''امید کا خون'' پیش کیا۔ندیم مقبول نے اپنا افسانچہ ''ڈالروں کی بارش'' پیش کیا۔ڈاکٹر رافعہ ولی نے اپنا افسانہ ''مہاپرش'' اور ایف۔آزاد دلنوی نے اپنا افسانہ ''خوشیوں کا جنازہ'' پڑھا۔اس دوران ایک طالب علم مہجور نے اپنا افسانہ ''انسٹا گرام'' پڑھا۔ناصر ضمیر نے اپنا افسانہ ''عجب درویش لڑکی تھی'' پیش کیا اور ایوب دلبر نے اپنا افسانہ ''خوش فہمی'' پڑھا۔

سیمینار کے اختتام پر ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا ہے جس کا موضوع ''اردو افسانہ: نئی صدی، نئے موضوعات'' تھا۔اس مذاکرے میں ڈاکٹر محمد یوسف وانی، ڈاکٹر فاروق احمد بٹ، ڈاکٹر محمد عبداللہ شیدا اور ڈاکٹر جاوید رسول نے حصہ لیا۔اس دوران سوال وجواب کا سلسلہ بھی چلا۔آج کی یہ تقریب شمالی کشمیر کے مایہ ناز سپوت اور مشہور افسانہ نگار مرحوم نذیر جوہر کے نام معنون کی گئی۔

سیمینار کے آخر پر عبدالغنی بیگ اطہر، محمد یوسف نے اردو افسانہ کی تاریخ اور معاصر افسانہ کی صورت حال پر مفصل گفتگو کی۔اپنے صدارتی خطبے کے دوران ڈاکٹر عبدالحفیظ مسعودی صاحب نے سیمینار کے حوالے سے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی سنجیدہ ادبی محفلیں منعقد کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔آج کے موضوع ''اردو افسانہ: نئی صدی، نئے موضوعات'' میں جدت اور تنوع بھی ہے اور ساتھ ہی اس میں دلچسپی کا عنصر بھی موجود ہے۔صاحب صدر نے طلبا و

طلبات کو ادب کی بنیادی مبادیات کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف متوجہ کیا۔

سیمینار کے دوران جو علم و ادب اور زندگی کے مختلف طبقات کے ساتھ تعلق رکھنے والے مقتدر شخصیات موجود رہیں ان میں جناب گلزار جعفر، جناب مشتاق بخشی، جناب مقبول فائق، جناب راشد منظور، پیرزادہ نصیر شاہین، جناب بشیر منگواپوری، ڈاکٹر میر رحمت اللہ، ڈاکٹر مبارک لون، ثاقب پوشپوری کے علاوہ کالج کے طلبا و طالبات کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔

تقریب کے دوران نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دیئے۔ آخر پر پروفیسر محمد عمران ملک نے مہمانوں کا اظہار تشکر پیش کیا۔ سیمینار کو کامیاب بنانے کے لئے کالج کا ڈینٹر پروفیسر جاوید حسن، پروگرام انچارج جناب سلیم ساغر اور فاروق احمد بٹ نے کلیدی رول ادا کیا۔

☆☆☆

☆......ایک روزہ سیمینار ''اردو ادب اور تانیثیت''

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کے اہتمام اور گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین بارہمولہ کے اشتراک سے ۵/ اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ایک روزہ سیمینار بعنوان ''اردو ادب اور تانیثیت'' کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کے دوران پروفیسر شفیقہ پروین نے صدارت کی جب کہ پروفیسر نیلوفر بھٹ میزبان اعلیٰ کی حیثیت سے اور محترمہ رخسانہ جبین، ڈاکٹر شبنم عشائی اور ڈاکٹر نکہت نظر مہمانان کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود تھیں۔

پروگرام کے آغاز میں پروفیسر نیلوفر بھٹ صاحبہ نے والہانہ انداز میں سیمینار میں آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر ایڈیٹر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور اغراض و مقاصد کا بھرپور خاکہ پیش

کیا۔اس نشست کے دوران ڈاکٹر کوثر رسول نے اپنا مفصل کلیدی مقالہ بہ عنوان ''اردوادب اور تانیثیت'' پیش کیا۔اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرنے والے اس مقالہ کو حاضرین نے بے حد سراہا ہے۔

سیمینار میں موضوع کی مناسبت سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا ہے جس کا موضوع اردوادب اور تانیثیت'' تھا۔اس مذاکرے میں ڈاکٹر نصرت جبین، ڈاکٹر حنانہ برجیس، ڈاکٹر رافعہ ولی نے حصہ لیا۔اس دوران سوالات کا سلسلہ بھی چل پڑا جس کا شرکائے بحث نے تسلی بخش جوابات دیئے۔مباحثے میں سلیم سالک نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

تقریب میں شیرازہ اردو کی خصوصی اشاعت ''ڈاکٹر ترنم ریاض نمبر'' اور سال نامہ ہمارا ادب کا خاص نمبر ''فن نظم نگاری نمبر جلدا''، فن ترجمہ نگاری نمبر جلدا'' اور شمالی کشمیر کے معروف اردو شاعر ڈاکٹر احمد منظور کا تازہ شعری مجموعہ ''شاخ خزاں پر ملول پرندے'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی۔

تقریب کے دوسرے حصے میں خواتین کا مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں شبینہ آرا، قاضی افروزہ، روشن آراء، رضیہ حیدر، ڈاکٹر کوثر رسول، ڈاکٹر حنانہ برجیس، ڈاکٹر نکہت نظر، ڈاکٹر شبنم عشائی، رخسانہ جبین، پروفیسر شفیقہ پروین قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ کالج کی چند طالبات نے بھی مشاعرے میں شرکت کی جن میں فاطمہ بتول، افشانہ فیروز، گلشن بیٹی، سلمٰہ بانو اور نزہت عزیز شامل ہیں۔

آخر پر ڈاکٹر نکہت نذر، ڈاکٹر شبنم عشائی اور محترمہ رخسانہ جبین نے کلچرل اکیڈمی کی کاوشوں کی سراہنا کی اور ساتھ ہی سیمینار کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کالج انتظامیہ کو خراج تحسین پیش کیا۔اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر شفیقہ پروین صاحبہ نے سیمینار کے حوالے سے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس

طرح کی سنجیدہ محفلیں منعقد کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔آج کا موضوع "اردوادب اور تانیثیت'' اپنی نوعیت کی ایک اہم کوشش ہے۔تانیثیت کا ایک جدید اصطلاح ہے جس کی تفہیم میں کافی دشواری اور اختلاف بھی ہے اور اس کے علاوہ انہوں نے تانیثیت اور ادب کے حوالے سے فکروفہم کے کئی اہم گوشوں کومنور کرنے کی کوشش کی اور پُرمغز گفتگو کی۔ساتھ ہی موصوفہ نے طالبات کو بھی تفہیم ادب کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف متوجہ کیا۔

تقریب کے دوران جوعلم وادب اور زندگی کے مختلف طبقات کے ساتھ تعلق رکھنے والی مقتدر شخصیات موجود رہیں ان میں جناب جی۔ایم ماہر، جناب ناصر ضمیر، زبیر قریشی، پروفیسر نثار احمد لون، پروفیسر اصغر رسول، ڈاکٹر طاہر محمود ڈار، جناب حارث حمزہ، جناب زاہد خان ، جناب شیخ منصور ، ڈاکٹر احمد منظور، جناب مشتاق سوپوری، اور کالج کی طالبات کی ایک کثیر تعداد شامل رہی۔

تقریب کے دوران نظامت کے فرائض محترمہ روحی سلطانہ نے احسن طریقے سے انجام دیئے۔آخر پر مہمانوں کا اظہار تشکر پروفیسر محمد یوسف وانی نے کیا۔ سمینار کو کامیاب بنانے کے لئے کالج کا ڈینٹر پروفیسر محمد یوسف وانی، پروگرام انچارج سلیم ساغر اور اکیڈمی کے پروگرام کاڈینٹر ڈاکٹر محمد اقبال لون، امیتاز احمد شرقی اور فاروق احمد بٹ نے کلیدی رول ادا کیا۔

☆☆☆

☆......خطہء پیرپنچال میں اردوادب کے پچاس سال

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کے اہتمام اور ہمالیہ ایجوکیشن مشن راجواری کے باہمی اشتراک سے ۱۰-۱۱؍اکتوبر ۲۰۲۳ءکو ایک عظیم الشان دوروزہ جشنِ ادب بعنوان ''خطہء پیرپنچال میں اردوادب کے پچاس

سال'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس جشنِ ادب کی افتتاحی نشست کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید نے کی جبکہ شری راجیو کجھوریہ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر راجوری بحیثیت مہمانِ خصوصی تقریب میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ پروفیسر محمد اسداللہ وانی، ڈاکٹر ٹی۔آر۔ رینہ، جناب خالد حسین اور جناب احمد شناس مہمانان گرامی کے طور پر ادبی جلسے میں موجود رہے۔ اس دوران ہمالیہ ایجوکیشن مشن راجواری کے سرپرست اعلیٰ جناب فاروق مضطر بحیثیت میزبان اعلیٰ اور جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے سربراہ ڈیویژنل آفس کشمیر ڈاکٹر فاروق انوار مرزا بطور میزبان اجلاس میں موجود رہے۔

دو روزہ جشنِ ادب کے آغاز میں ہمالیہ ایجوکیشن مشن راجواری کے کاڈنیٹر جناب محمد مسلم نے والہانہ انداز میں تقریب میں آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا اور فرداً فرداً خطہ پیر پنچال کی مقتدر شخصیات کا تعارف پیش کیا۔ بعدازاں ایڈیٹر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بھرپور خاکہ پیش کیا اور اس دو روزہ جشنِ ادب کے اغراض ومقاصد کو بھی مدلل انداز میں پیش کیا۔

اس دوران جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے سربراہ ڈیویژنل آفس کشمیر ڈاکٹر فاروق انوار مرزا نے تقریب میں آئے ہوئے مہمانوں کا رسمی طور استقبال کیا اور ہمالیہ ایجوکیشن مشن راجوری کے سرپرست اعلیٰ جناب فاروق مضطر صاحب کے تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔

افتتاحی نشست کے دوران ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی نے اپنا مفصل کلیدی مقالہ بہ عنوان ''خطہ ء پیر پنچال میں اردو ادب کے پچاس سال'' پیش کیا۔ اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرنے والے اس مقالہ کو حاضرین نے بے حد سراہا ہے۔

تقریب میں شیرازہ اردو کی خصوصی اشاعتوں کی رسم رونمائی انجام دی گئی جن میں ''پروفیسر مجید مضمر نمبر''، پروفیسر ظہور الدین نمبر، شیرازہ سفرنامہ نمبر جلد 1 اور

جلد 2، عبدالرحمٰن مخلص نمبر، تاجران کتب نمبر، اورسال نامہ ہمارا ادب کا خاص نمبر ''فن افسانہ نگاری نمبر جلد 1 ''، فن افسانہ نگاری نمبر جلد 2 '' شامل ہیں اور اکیڈمی مطبوعات میں سے انتخاب کلام سید رضا، کشمیر کی قدیم ذاتیں، کشمیر فوک لور کے آئینے میں اور مونوگراف غلام نبی گونی گورگانی قابل ذکر ہیں۔ اس موقعے پر خطہء پیر پنچال کے نامور شعرا جناب خورشید بسمل کے تازہ شعری مجموعہ "ضوفشاں" اور جناب احمد شناسؔ کا تازہ شعری مجموعہ '' آب رنگ '' اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے پروفیسر شمس کمال انجم کی تصنیف ''یومیات'' کی نقاب کشائی کی گئی۔ اس کے علاوہ دبستانِ ہمالہ، ہمالیہ ایجوکیشن مشن راجوری کے ادبی مجلّے "دھنک"' اور جناب فاروق مضطر کی ترتیب و تدوین کردہ کتاب ''گل سرسبد'' اور "ادبیات پیر پنچال'' از جاوید انور کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔

علاوہ ازیں اس نشست میں قومی اور علاقائی سطح پر جن اردو زبان وادب کے معتبر محققین، ناقدین، ادبا وشعرا کو دبستان ہمالہ کی جانب سے اعزازات سے نوازا گیا ان میں پروفیسر ایاز رسول نازکی، ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینہ، جناب احمد شناسؔ، جناب اسیر کشتواڑی اور پروفیسر اسداللہ وانی کو ہمالین لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ۲۰۲۳ء سے نوازا گیا۔ جناب منشور بانہالی، ڈاکٹر لیاقت جعفری، جناب خالد کرار، ڈاکٹر شمس کمال انجم اور پروفیسر ریاض احمد کو فخر ہمالہ ایوارڈ ۲۰۲۳ء سے نوازا گیا۔ جناب عبدالغنی جاگل، ڈاکٹر زمرد مغل، ڈاکٹر لیاقت نیر، ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی اور رضیہ حیدر کو فخر پیر پنچال ایوارڈ ۲۰۲۳ء سے نوازا گیا۔ اس افتتاحی نشست کی نظامت ایڈیٹر اردو محمد سلیم سالک نے انجام دی۔

دو روزہ جشن کے دوسرے حصے میں مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر ایاز رسول نازکی نے کی جبکہ پروفیسر شمس کمال انجم نشست میں بطور

مہمان ذی وقار موجود رہے۔اس مشاعرے میں ممتاز احمد ممتاز، ڈاکٹر لیاقت نیر، عبد القیوم نائیک، روبینہ میر، خورشید جانم، ڈاکٹر شمس کمال انجم، راج کمار چندن، ڈاکٹر امجد علی بابر، عارف ملک، ڈاکٹر لیاقت جعفری، خورشید بسمل، پرویز ملک، وکیل احمد حیات، عمر فرحت، غنی غیور، پروفیسر ایاز رسول نازکی، ڈاکٹر علم دار عدم، قاری ضیاء الحق نے اپنا کلام پیش کیا۔اس مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر علم دار عدم نے انجام دی۔

دوروزہ جشن ادب کے پہلے دن کے آخری حصے میں ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد کیا گیا ہے جس کا موضوع ''خطہ ء پیر پنچال میں اردو ادب کی تنقید و تحقیق'' تھا۔مذاکرے کی صدارت جناب اسیر کشتواڑی نے کی جبکہ معروف محقق ڈاکٹر ٹی۔ آر۔رینہ بطور مہمان خاص نشست میں موجود رہے۔ مذاکرے میں ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی اور ڈاکٹر لیاقت نیر نے حصہ لیا۔اس دوران سوالات کا سلسلہ بھی چل پڑا جس میں صف سامعین میں شریک مقتدر شخصیات نے حصہ لیا۔اس مباحثہ میں شدید گرما گرمی رہی۔اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر جناب اسیر کشتواڑی نے دوروزہ جشن ادب کے اہتمام کے حوالے سے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی سنجیدہ کانفرنسیں منعقد کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور مذاکرے کے حوالے سے پُر مغز اور مفید گفتگو کی۔ساتھ ہی موصوف نے موضوع کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف متوجہ کیا۔مباحثہ میں ڈاکٹر محمد اقبال لون نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

''جشن ادب'' کے دوسرے روز "ممتاز ہم عصر سے ملئے" کے تحت اردو کے نامور شاعر جناب احمد شناس سے ایک ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔اس نشست کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید نے کی جبکہ نوجوان نقاد ڈاکٹر عرفان عارف نے جناب احمد شناس کی شاعری کے حوالے سے ایک مبسوط مقالہ پیش کیا۔مقالے کے بعد

جناب احمد شناس نے اپنی حیات اور اپنے تخلیقی سفر پر مفصل روشنی ڈالی۔علاوہ ازیں اس نشست میں سوال وجواب کا سلسلہ بھی چلا،جس میں نشست کے شرکا نے موصوف سے ان کی زندگی اور تخلیقی سفر کے بارے میں استفسارات کیے۔اس نشست کی خاص بات یہ رہی کہ طلبا وطالبات نے بھرپور شرکت کی۔نشست کی نظامت مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے انجام دی۔

''ممتاز ہم عصر سے ملئے'' کے فوراً بعد ایک ادبی مذاکرہ منعقد کیا گیا۔مذاکرہ کا عنوان "خطہ پیر پنچال میں اردو شاعری کے پچاس سال" تھا۔مذاکرہ کے دوسرے حصے کی صدرات جناب ایاز رسول نازکی نے کی جبکہ مذاکرے میں ڈاکٹر لیاقت جعفری ،جناب انور خان اور جناب غنی غیور بحیثیت پینلسٹ شامل رہے۔ مذاکرے میں موضوع کے حوالے سے بڑی اہم بحث ہوئی۔سامعین اور پینلسٹ کی دلچسپی سے ایک زبردست ماحول بنا۔ مذاکرے میں بحیثیت ماڈریٹر محمد سلیم سالک نے بخوبی اپنے فرائض انجام دیئے۔

''جشن ادب'' کے دوسرے روز کی تیسری نشست میں محفل افسانہ منعقد ہوا جس کی صدارت اردو اور پنجابی کے قد آور افسانہ نگار خالد حسین نے کی جبکہ گوجری اور اردو کے معروف ادیب پروفیسر ایم۔کے۔وقار نشست میں بطور مہمان خاص موجود رہے۔اس نشست میں جن افسانہ نگاروں نے افسانے پڑھے ان میں جناب مرزا اسلم،ڈاکٹر جنید جاذب،ڈاکٹر مشتاق احمد وانی،محترمہ زنفر کھوکھر ، پروفیسر ایم۔کے۔وقار،اقبال شال اور خالد حسین شامل ہیں۔نشست میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے احسن طریقے سے انجام دیئے۔

محفل افسانہ کے بعد "خطہء پیر پنچال میں اردو فکشن کے پچاس سال" کے عنوان سے تیسرا مذاکرہ منعقد ہوا۔ مذاکرہ کی صدارت ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے کی

جبکہ ڈاکٹر رضوانہ شمسی، ڈاکٹر جنید جاذب اور ڈاکٹر عبدالرشید منہاس بحیثیت پینلسٹ مذاکرہ میں شامل رہے۔ مذاکرہ میں پیر پنچال میں اردو فکشن کے حوالے سے یہ بات محسوس کی گئی کہ خطہ ء پیر پنچال میں اردو فکشن بہت کم تخلیق کیا جاتا ہے، اس لئے تخلیق کاروں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ فکشن کی طرف توجہ دیں۔ مذاکرے کی نظامت محمد سلیم سالک نے انجام دی۔

جشن ادب کے اگلے حصے میں چوتھے مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان "خطہ ء پیر پنچال میں اردو ادبی صحافت کے پچاس سال" تھا۔ مذاکرے کی صدارت ممتاز شاعر اور ادیب پروفیسر ایاز رسول نازکی نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر زمرد مغل اور ڈاکٹر لیاقت جعفری پینلسٹس کے طور پر موجود رہے۔۔ اس دوران سوالات کا سلسلہ بھی چل پڑا جس میں صف سامعین میں تشریف فرما معزز شخصیات نے حصہ لیا۔

اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ایاز رسول نازکی نے مذاکرے کے حوالے سے جامع اور معنی خیز گفتگو کی۔ موصوف نے ادبی صحافت کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف سامعین کو متوجہ کیا۔ مباحثے میں ڈاکٹر محمد اقبال لون نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

دوروزہ جشن ادب کی آخری نشست میں اردو مشاعرہ جناب احمد شناس کی صدارت میں منعقد ہوا جبکہ ایوان صدرات میں پروفیسر اسداللہ وانی، جناب منشور بانہالی، جناب ذولفقار نقوی اور محترمہ رضیہ حیدر موجود رہے۔ مشاعرہ میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں ذولفقار نقوی، سلیم خان، رضیہ حیدر، رشید قمر، احمد شناس، وکیل احمد، خالدہ بیتاب، منشور بانہالی، ساحل عمران، خورشید جانم قابل ذکر ہیں جبکہ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر عرفان عارف نے کی۔ مشاعرے کے بعد جناب مسلم

وانی نے دبستان ہمالہ کی طرف سے کلچرل اکیڈمی کے ذمہ داروں کی عزت افزائی کرتے ہوئے مومنٹو پیش کیا۔ ساتھ ہی دیگر مہمانوں کی حوصلہ افزائی کی ،جن میں ڈاکٹر جنید جاذب ،ڈاکٹر عرفان عارف ،جناب وکیل حیات ،ڈاکٹر رضوانہ شمسی ، جناب ذولفقار نقوی ،خالدہ بیتاب قابل ذکر ہیں۔

آخر پر مہمانوں کا شکریہ جناب مسلم وانی نے ادا کیا۔ دو روزہ جشن ادب کو کامیاب بنانے کے لئے دبستان ہمالہ راجوری کے کاڈینٹیرز محمد مسلم وانی، جناب سلیم سالک، ڈاکٹر محمد اقبال لون، امتیاز احمد شرقی اور محمد آصف خان نے کلیدی رول ادا کیا۔

☆☆☆

☆......’’گاندھی کالج میں اردو مشاعرہ‘‘

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام اور گاندھی میموریل کالج فتح کدل سری نگر کے اشتراک سے ۱۷؍اکتوبر ۲۰۲۳ء کو ایک اردو مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت معروف شاعر جناب رفیق راز نے کی جب کہ پروفیسر ایاز رسول نازکی بہ طور مہمان خصوصی اور پروفیسر ڈاکٹر جی۔ ایم۔ لون پرنسپل کالج بہ طور میزبان اعلیٰ ایوان صدارت میں موجود رہے۔ اس دوران سابق چیف انفارمیشن آفیسر جی۔ آر۔ صوفی ،معروف صحافی و شاعر جناب جاوید آذر اور اور مشہور براڈ کاسٹر اور شاعر ڈاکٹر ستیش ول بہ طور مہمانان ذی وقار جبکہ محمد سلیم سالک مدیر شیرازہ اکیڈمی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود رہے۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر راشد عزیز نے انجام دی۔

مشاعرے کے آغاز میں پرنسپل گاندھی میموریل کالج پروفیسر جی۔ ایم۔ لون نے مہمانوں کا والہانہ استقبال کیا۔ اس کے بعد مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی سرگرمیوں کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت

کی ان میں حاشر افنان، شفیع شاداب، وقار دانش، راشف عزمی، زینب شفیع، صابر شبیر، راقم حیدر، خواہش کشمیری، ڈاکٹر راشد مقبول، عارض ارشاد، بشیر حائل، محمد اشرف بابا، ڈاکٹر تنویر طاہر، غضنفر علی شہباز، پرویز مانوس، رفیق ہمراز، ڈاکٹر راشد عزیز، اشرف عادل، رخسانہ جبین شامل رہے۔ مشاعرے کے دوران شیرازہ اردو کی تازہ مطبوعات کی رسم رونمائی انجام دی۔ اس دوران شعرا و ادبا کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی مقتدر شخصیات نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر شہزادہ سلیم، عبدالرشید راہگیر، شفیع احمد، ریحانہ شجر کے علاوہ کالج کے اساتذہ اور طلبا و طالبات کی کثیر تعداد موجود رہی۔ مشاعرے کے آخر میں ڈاکٹر تنویر طاہر نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

☆......**ایک روزہ سیمینار ''اردو میں سیرت نگاری''**

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام اور اقبال انسٹی ٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر کے اشتراک سے ۷/ نومبر ۲۰۲۳ء کو ایک سیمینار بہ عنوان ''اردو میں سیرت نگاری'' منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار میں محفل مقالات اور نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ سیمینار کی صدارت معروف عالم دین مولانا شوکت حسین کینگ نے کی جب کہ ڈاکٹر عبدالحفیظ مسعودی بہ طور مہمان خصوصی اور پروفیسر عارفہ بشریٰ، پروفیسر محی الدین سنگھمی اور ڈاکٹر جوہر قدوسی بہ طور مہمانان ذی وقار ایوان صدارت میں موجود رہے۔ اس دوران ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی بہ طور میز بان اور محمد سلیم سالک مدیر شیرازہ اکیڈمی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود تھے۔ سیمینار کے دوران نظامت کے فرائض معروف شاعر جناب گلزار جعفر نے انجام دیئے۔

پروگرام کا آغاز تلاوت کلام اللہ سے کیا گیا جس کی سعادت ڈاکٹر حافظ شاہ

نواز صاحب کو حاصل ہوئی۔اس کے بعد ریسرچ اسکالر جناب نظیر احمد کمار نے علامہ اقبال کا نعتیہ کلام پیش کیا۔اقبال انسٹی ٹیوٹ کے کاڈینٹر ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی نے مہمانوں کا والہانہ استقبال کیا اور ساتھ ہی جناب محمد سلیم سالک (مدیر شیرازہ اردو) نے اکیڈمی کی ادبی سرگرمیوں اوراغراض ومقاصد کا ایک مفصل خاکہ پیش کیا۔

سیمینار کی پہلی نشست میں ڈاکٹر جوہر قدوسی نے اپنا پُر مغز مدلل اور مفصل مقالہ بہ عنوان ''اردو میں سیرت نگاری'' پیش کیا۔اس طویل اور سیر حاصل مقالہ کو سامعین وحاضرین محفل نے بے حد سراہا۔اس دوران ''جہانِ حمد ونعت۔جلد 4_5 '' کی رسم رونمائی انجام دی گئی اور ڈاکٹر شکیل شفائی نے اس پر اپنا مفصل اور معلومات افزا تبصرہ پیش کیا۔ڈاکٹر حافظ شاہ نواز نے موضوع کی مناسبت سے ایک وقیع مقالہ پیش کیا۔ایوان صدارت میں تشریف فرما مقتدر شخصیات پروفیسر عارفہ بشریٰ اور ڈاکٹر عبد الحفیظ مسعودی نے سیمینار کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کیے۔افتتاحی نشست کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے مولانا شوکت حسین کینگ نے سیمینار کے موضوع کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اکادمی کو مبارک باد پیش کی۔

محفل مقالات کے بعد ایک نعتیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر جناب سلطان الحق شہیدی نے کی جبکہ جناب حسن انظر اور جناب شبیر احمد شبیر بحیثیت مہمانان ذی وقار موجود رہے۔۔اس نعتیہ مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کر کے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا ان میں جناب شبیر احمد شبیر، حسن انظر، غضنفر علی شہباز، اشہر اشرف، آفاق دلنوی، تسنیم الرحمٰن حامی، حامد رضا، عبداللہ خاور، منظور نونہ مئی، ڈاکٹر شکیل شفائی، الطاف نظامی، محمد اکرم، سلطان الحق شہیدی، ریاض ربانی، ڈاکٹر راشد مقبول، ڈاکٹر راشد عزیز اور اشرف عادل شامل رہے۔نعتیہ مشاعرے کی نظامت جناب گلزار جعفر نے انجام دی۔

اس دوران شعرا و ادبا کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی مقتدر شخصیات نے شرکت کی جن میں ڈاکٹر اعجاز محمد شیخ، ڈاکٹر مشتاق حیدر، ڈاکٹر کوثر رسول، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی، ڈاکٹر ناصر مرزا، ڈاکٹر الطاف انجم، ڈاکٹر ارشد شادابؔ، ڈاکٹر شہزادہ سلیم کے علاوہ طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالرس موجود رہے۔ آخر میں ڈاکٹر محمد امین نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

☆......ایک روزہ سیمینار ''اردو شاعری کی مبادیات''

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام اور گورنمنٹ ڈگری کالج دمحال ہانجی پورہ کولگام کے اشتراک سے ۲۸ر نومبر ۲۰۲۳ء کو ایک سیمینار بہ عنوان ''اردو شاعری کی مبادیات'' منعقد کیا گیا۔ یہ سیمینار محفل مقالات اور مشاعرہ پر مشتمل رہا سیمینار کی صدارت کہنہ مشق شاعر جناب علی شیداؔ نے کی۔ پروفیسر شارق زاہدہ دیوا بہ طور مہمانِ خصوصی اور مطہرہ عابدہ وحید، ڈاکٹر معروف شاہ اور پروفیسر راشد عزیز بہ طور مہمانان ذی وقار ایوان صدارت میں موجود رہے۔ اس دوران ڈاکٹر جاوید جہاں بہ طور میزبان اور محمد سلیم سالک مدیر شیرازہ اکیڈمی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایوان صدارت میں موجود تھے۔ سیمینار کے دوران نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دیئے۔

پروفیسر شارق زاہدہ دیوا، پرنسپل کالج ہٰذا نے باقاعدہ مہمانوں کا استقبال کیا۔ سیمینار کے دوران مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی سرگرمیوں اور اغراض و مقاصد کا ایک مفصل خاکہ پیش کیا۔ سیمینار کی پہلی نشست میں ڈاکٹر راشد عزیز نے اپنا پُر مغز مدلل اور مفصل کلیدی خطبہ بہ عنوان ''اردو شاعری کی مبادیات'' پیش کیا۔ اس سیر حاصل مقالہ کو سامعین و حاضرین محفل نے بے حد سراہا۔ اس دوران

سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ بھی چلا۔اس کے بعد کالج کے رسالہ ''نور آباد'' کی رسم رونمائی انجام دی گئی اور کلچرل اکیڈمی کے رسالہ شیرازہ اردو کی تازہ مطبوعات ''سفرنامہ جلداول اور جلددوم'' اور جناب طایق رشید کا سفرنامہ ''کشمیر سے فاراں تک'' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔سمینار میں ڈاکٹر معروف شاہ اور مطہرہ عابدہ وحید نے اپنے تاثرات بھی پیش کیے۔

اس کے بعد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر جناب علی شیدؔا نے کی۔اس مشاعرے میں جن شعرا نے شرکت کر کے اپنا کلام پیش کیا ان میں اعظم فاروق، عمر فیاض، شبروزہ جان، مرتضیٰ بسمل، عظمیٰ یوسف، عقیل فاروق، یاور احمد، ساگر سلام، ڈاکٹر جاوید جہاں، شبینہ آرا، منظور نونہ مئی، ناصر منور، ہلال مدہوش، ردا مدثر، میسر ناشاد، پرویز گلشن اور علی شیدا شامل رہے۔مشاعرے کے بعد کالج کی طرف سے پروفیسر شارق زاہدہ دیوا، علی شیدؔا، پروفیسر راشد عزیز، مطہرہ عابدہ وحید، پروفیسر جاوید جہاں اور محمد سلیم سالک کو مومینٹو پیش کئے گئے۔اس دوران شعراو ادبا کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی کئی مقتدر شخصیات نے شرکت کی اور طلبا و طالبات کی ایک کثیر تعداد بھی موجود رہی۔مشاعرے کے آخر پر ڈاکٹر جاوید جہاں نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆

☆......توسیعی خطبہ ''تخلیقی ادب کے بنیادی سروکار''

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کے اہتمام اور عبدالاحد آزاد میموریل کالج بمنہ سری نگر کے اشتراک سے ۲۹ر نومبر ۲۳ء کو ایک توسیعی خطبہ بہ عنوان ''تخلیقی ادب کے بنیادی سروکار'' منعقد کیا گیا۔اس توسیعی خطبہ کی صدارت پروفیسر شفیقہ پروین نے کی جبکہ پروفیسر نظیر احمد سمنانی پرنسپل عبدالاحد آزاد میموریل

کالج بہ حیثیت میزبان اعلیٰ اور پروفیسر شفق سوپوری بہ حیثیت مہمان خصوصی اور پروفیسر نگہت نظر کارڈنیٹر پروگرام اور محمد سلیم سالک اکیڈمی کے نمائندہ کے بہ طور ایوان صدارت میں موجود رہے۔ سیمینار کے دوران نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دیئے۔

توسیعی خطبہ کے آغاز میں پروفیسر نظیر احمد سمنانی پرنسپل عبدالاحد آزاد میموریل کالج نے مہمانان گرامی کا والہانہ استقبال کیا۔ اس نشست کے دوران مدیر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی سرگرمیوں اور اغراض و مقاصد کا مفصل خاکہ پیش کیا۔ اس دوران پروفیسر شفق سوپوری نے اپنا توسیعی خطبہ بہ عنوان ''تخلیقی ادب کے بنیادی سروکار'' پیش کیا۔۔ اس سیر حاصل توسیعی خطبہ کو سامعین و حاضرین محفل نے بے حد سراہا۔ اس کے بعد مختلف ادبی امور سے متعلق سوال و جواب اور بحث و مباحثہ کا سلسلہ بھی چلا۔

اس کے بعد کلچرل اکیڈمی کے رسالہ شیرازہ اردو کی تازہ مطبوعات ''شیرازہ مجید مضمر نمبر'' اور اکیڈمی کے شائع کردہ پروفیسر سید رضا مرحوم کے شعری مجموعہ'' کلام سید رضا'' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ توسیعی خطبہ کے آخر میں پروفیسر شفیقہ پروین نے اپنا جامع اور بصیرت افروز خطبہ صدارت پیش کیا۔

سمینار کے دوران شعرا و ادبا کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والی کئی مقتدر شخصیات نے شرکت کی جن میں جناب شفیع احمد، ڈاکٹر ناصر مرزا، ڈاکٹر شبنم عشائی، لیاقت عباس کے علاوہ کالج کے مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے تدریسی عملہ کے علاوہ طلبا و طالبات کی ایک کثیر تعداد موجود رہی۔ توسیعی خطبہ کے آخر میں پروفیسر نگہت نظر صاحبہ نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

☆☆☆